فکر کی غلطی

وحید الدین خاں صاحب کے افکار کا تنقیدی جائزہ

مولانا عتیق احمد قاسمی

استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مکتبۃ الارشاد

نئی دہلی ۲۵

فکر کی غلطی

جناب وحید الدین خاں صاحب کے دینی و ملی افکار
وخیالات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، دین کے اجماعی مسائل،
تصوّرِ دین، قرآن وسنت کی تشریح اور ملی مسائل کے بارے
میں ان کے منحرف افکار پر تبصرہ

مولانا عتیق احمد قاسمی
استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مکتبۃ الارشاد
نئی دھلی ۲۵

○ناشر○

مکتبۃ الارشاد

۲۳۸ ابوالفضل انکلیو نزد پولیس اسٹیشن جامعہ نگر دہلی ۲۵

پہلا ایڈیشن : ــــــــــــــــ سنہ ۱۹۹۰ء

صفحات : ــــــــــــــــ ۳۵۲

کتابت : ــــــــــــــــ جلال الدین احمد

طباعت : ــــــــــــــــ

قیمت : ــــــــــــــــ

سول ایجنٹ

قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

ویلیج بلڈنگ حضرت نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۳

یہاں سے بھی دستیاب ہے

(۱) توصیف بکڈپو حضرت نظام الدین نئی دہلی ۱۳

(۲) نصیر بکڈپو حضرت نظام الدین نئی دہلی ۱۳

(۳) کتب خانہ عزیزیہ جامع مسجد دہلی ٦

(۴) کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی ٦

(۵) مکتبہ اسلامی چتلی قبر دہلی ٦

فہرست مضامین

مقدمہ

۱

"خدا میرے لیے ایک رسمی عقیدہ نہیں ہے، خدا میری دریافت ہے، خدا کو میں نے دیکھا ہے، خدا کو میں نے چھوا ہے، بخدا میری مثال صحرائے سینا کے اس پہاڑ کی ہے، جس پر خدا اُترا اور اس نے اس کی ہستی کے ریزے ریزے کر دیے۔"

یہ اقتباس پڑھ کر خدا جانے آپ کا ذہن کہاں کہاں جائے، شاید آپ یقین کر بیٹھے ہوں کہ یہ اقتباس غلام احمد قادیانی کی کسی کتاب کا ہے لیکن قیاس آرائی میں عجلت نہ کیجیے اور میری طرح آپ بھی یہ جان کر صدمے سے دوچار ہوئیے کہ یہ تحریر "علم جدید کا چیلنج" اور دوسری مفید کتابوں کے مصنف جناب وحیدالدین خاں صاحب کی ہے۔ یہ خبر بظاہر ناقابل یقین ہے، اس لیے اگر یقین کرنے میں دشواری محسوس ہو تو جناب وحیدالدین خاں کے ماہنامہ 'الرسالہ' دسمبر ۱۹۸۲ء کا شمارہ کھول کر صفحہ ۲۶ پر یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

جناب وحیدالدین خاں صاحب کی تحریروں کا میں قدردان رہا ہوں، ان کی کتاب "علم جدید کا چیلنج" کو ان کی شاہکار تصنیف سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں سادہ، سلیس اور دل نشیں پیرایے میں تحریر و تصنیف کا ملکہ عطا فرمایا ہے، ذہن رسا اور طبیعت اخاذ ہے، اس لیے روزمرہ کے معمولی واقعات سے اخذ نتائج میں انھیں کمال حاصل ہے، جدید علوم و افکار کا انھوں نے اصل مآخذ سے عمیق اور ناقدانہ مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے اسلام کے بارے میں جدید شبہات کا ازالہ اطمینان بخش طریقے پر کرتے ہیں، تذکیر آخرت کے موضوع پر ان کی تحریریں

بڑی موثر اور رقت انگیز ہیں۔ کاش کہ ان کی یہ صلاحیتیں دین کی دعوت، اسلام کے دفاع اور تذکیری موضوعات پر صرف ہوتیں اور "علم جدید کا چیلنج" جیسی مفید کتابیں ان کے قلم سے وجود میں آتی رہتیں۔ لیکن اسے بدقسمتی ہی کہیے کہ ایک عرصہ سے خاں صاحب کی تحریر کا رُخ مُڑ چکا ہے، اور ان کے قلم سے ایسی بھیانک تحریریں نکل رہی ہیں، جنھیں پڑھ کر خاموشی کتمان حق کے دائرے میں آتی ہے۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ خدا نخواستہ دنیا سے رخصت ہونے سے قبل موصوف کوئی "دعویٰ" نہ کر بیٹھیں، دل پر بہت جبر کر کے دو ایک وحشت ناک اقتباسات اور بھی پڑھ لیجئے۔

یکم فروری ۱۹۶۳ء کی رات میں وحیدالدین خاں صاحب نے ایک خواب دیکھا۔ بیدار ہونے کے بعد انھیں خواب کا صرف اتنا حصہ یاد رہا۔ "۱۹ جولائی" اس خواب کے ۲۳ سال بعد ۱۹۸۶ء کی ۱۹ جولائی کو انھوں نے اپنی تفسیر "تذکیر القرآن" مکمل کی، اکتوبر ۱۹۸۶ء کے "الرسالہ" میں موصوف نے "خواب پورا ہو گیا" کے عنوان سے مستقل ایک مضمون لکھا، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "۱۹ جولائی" کو "تذکیر القرآن" کا مکمل ہونا بڑا عجیب واقعہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام تمام تر خدا کی مدد سے ہوا، اور عین خدا کے منصوبے کے تحت اپنی تکمیل کو پہونچا۔ یہ ایک خدائی منصوبہ تھا اور خدا ہی نے اپنے خصوصی اہتمام سے اس کو پورا کیا۔ تذکیر القرآن ایسے حالات میں مکمل ہوئی جب کہ میرے حالات بے حد خراب تھے۔ حتیٰ کہ کچھ لوگ مجھے ہلاک کرنے کے درپے تھے۔ آج جب میں نے تذکیر القرآن کو مکمل کیا تو میرے دل نے کہا۔ جو کام مجھے کرنا تھا وہ کام آج پورا ہو گیا۔ اب انشاء اللہ خدا کے دین پر کوئی شخص پردہ نہ ڈال سکے گا۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے۔"
>
> (الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۶ء ص ۲۵، ۲۶)

بجلی کے ایک حادثے میں وحیدالدین خاں صاحب کی کلائی زخمی ہو گئی، اس حادثہ کے بارے میں اکتوبر ۱۹۸۶ء کے الرسالہ میں بہت مفصل مضمون لکھا۔ اسی مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "آج صبح کو مجھ پر ایک عجیب تجربہ گزرا، میں تذکیر القرآن میں سورۂ یونس (آیات ۲۴-۲۵) کی تشریح لکھ رہا تھا۔ الکٹرک برن (BURN) کی وجہ سے میری

کلائی زخمی ہے۔ داہیں ہاتھ کی انگلیاں تقریباً ۷۵٪ سُن ہیں، ہاتھ اتنا کمزور ہے کہ قلم پکڑنے میں نہیں آتا، تاہم اسی حالت میں لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ عین اس وقت مجھ پر ایک لمحاتی تجربہ گزرا، مجھے ایسا لگا جیسے میں خدا کو اپنے فرشتوں سے یہ کہتے ہوئے سُن رہا ہوں کہ:

"ذرا میرے بندے کو دیکھو ....."

بے اختیار دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ....."

(الرسالہ اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۱۸)

وحیدالدین خاں صاحب کی اس طرح کی تحریریں ان کے خیر خواہوں اور قدر دانوں کے دلوں میں اندیشے پیدا کر رہی ہیں کہ کہیں وہ اشاروں اور کنایوں سے آگے بڑھ کر غلام احمد قادیانی کی طرح نعوذ باللہ علانیہ کوئی دعویٰ نہ کر بیٹھیں۔ ان اندیشوں سے اگر صرف نظر کر لیا جائے تو بھی یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ وحیدالدین خاں صاحب روز بہ روز اپنی تحریروں میں جادۂ اعتدال اور صراطِ مستقیم سے ہٹتے جا رہے ہیں۔ ان کا "شوقِ انفرادیت" انھیں کتاب و سنت اور اجماعِ امت سے بہت دور لے جا رہا ہے۔ جن مسائل کے بارے میں کتاب و سنت کی واضح نصوص موجود ہیں اور چودہ سو سال سے جن مسائل پر امت متفق ہے وحیدالدین خاں صاحب ان سے بھی اختلاف کر رہے ہیں۔

امتِ مسلمہ کا ہر دور میں اجماع رہا ہے کہ جو مسلمان بھی رسول اکرمؐ (فداہ ابی و امی) کی اہانت کرے، آپ کو سب و شتم کرے اس کی سزا قتل ہے، ایسا شخص واجب القتل ہے لیکن وحیدالدین خاں صاحب اجماعِ امت کو پس پشت ڈال کر اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ اسلام میں شاتمِ رسول کی سزا قتل ہے۔ چنانچہ سلمان رشدی کے بارے میں مسلمانوں کے متفقہ موقف سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کیا اس کے بعد بھی اس میں شبہ کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے کہ رسول اللہ کی شان میں گستاخی بجائے خود مستوجب قتل جرم نہیں ہے۔ کسی کے واجب القتل ہونے کے لیے اس کے ساتھ کچھ مزید اسباب درکار ہیں۔ مثلاً ریاست اسلامی سے

بغاوت۔ چند افراد جو دور اول میں قتل کیے گئے ہیں، ان کا معاملہ اسی دوسرے حکم کے تحت آتا ہے۔ انھیں ریاست سے بغاوت کے جرم میں قتل کیا گیا، نہ کہ مجرد گستاخی رسول کے جرم میں۔"

(الرسالہ جون ۱۹۸۹ء، ص ۲۴)

خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام رسولوں سے افضل ہونا اور دین اسلام کا تمام ادیان سے کامل ہونا ایسی بدیہی حقیقت ہے جس سے اختلاف کرنے کی بات کوئی مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔ لیکن وحیدالدین خاں صاحب اس بدیہی حقیقت سے بھی اختلاف کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ موصوف پوری جرأت و صفائی کے ساتھ لکھتے ہیں:

"خدا کے تمام رسول ایک ہی دین لے کر آئے۔ ان میں سے کوئی رسول نہ دوسرے رسولوں سے افضل تھا اور نہ ان میں سے کسی کا دین دوسروں کے دین کے مقابلہ میں زیادہ کامل۔"

(الرسالہ مارچ ۱۹۸۳ء ص ۳۸)

وحیدالدین خاں صاحب کا دینی انحراف صرف یہی نہیں ہے کہ انھوں نے امت مسلمہ کے بہت سے اجتماعی مسائل کو اپنے "شوق انفرادیت و شذوذ" کا شکار بنایا، بلکہ اپنی تحریروں میں موصوف نے آیات و احادیث کی من مانی تشریحات کیں، اپنے خیالات پر کھینچ تان کر آیات و احادیث کی تطبیق کرنے کی کوشش کی، آیات قرآنی کی متعدد متضاد تفسیریں کیں اور آیات و احادیث کی تشریح کے معاملہ میں بڑی ناخدا ترسی اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا۔ ان سب کی مثالیں اس کتاب میں بکثرت ملیں گی۔

سنگین تر بات یہ ہے کہ وحیدالدین خاں صاحب، مولانا مودودی کے تصور دین کی تردید میں غلو اور ردعمل کی نفسیات کے شکار ہو گئے اور انھوں نے اپنے "تصور دین" میں اسلام کے اجتماعی احکام کی "تصغیر" کی، ان کی اہمیت حد درجہ گھٹا دی اور ان کی تحریروں سے یہ تاثر ابھرنے لگا کہ گویا اسلام میں بھی مذہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے۔ موصوف نے لکھا کہ "اسلام کا مخاطب فرد ہے نہ کہ اجتماع"۔ انھوں نے اجتماعی احکام کو دین کا اضافی

جزو" قرار دیا۔ اجتماعی احکام کی اہمیت گھٹانے کی وجہ سے ان کی تحریروں میں اسلامی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد اور مسلم ممالک میں اسلامی قوانین اور اسلامی سزاؤں کے اجراء کی کوششوں کا استہزاء و تخفاف ملتا ہے۔ موصوف پوری صفائی کے ساتھ یہاں تک لکھتے ہیں کہ:

"دین کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے خوف و محبت کا تعلق جوڑے اور آخرت کی کامیابی کے لیے فکرمند ہو۔ مگر دنیا کی زندگی میں مومن کی ایک اور بھی پسندیدہ چیز (صف ۱۳) ہوتی ہے اور وہ ہے اسلام کا غلبہ۔ یعنی اہلِ حق دوسری قوموں کے مقابلہ میں دبے ہوئے نہ ہوں بلکہ انھیں کو زمین کے اوپر سربلندی حاصل ہو۔ تاہم اہل ایمان کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ براہِ راست اسلامی اقتدار قائم کرنے کی مہم چلائیں۔ قرآن میں واضح لفظوں میں ارشاد ہوا ہے کہ اقتدار کا مالک اللہ ہے، وہی جس کو چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے (آل عمران ۲۶) انبیاء میں سے کسی نبی نے بھی حکومت قائم کرنے کی مہم نہیں چلائی۔ حضرت داؤد کو حکومت ملی۔ مگر قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ "اے داؤد تم کو یہ اقتدار ہم نے عطا کیا ہے۔" (ص ۲۶)

(دین کیا ہے ص ۱۰)

جذبۂ جہاد مسلمانوں کے لیے قوت و شوکت کا عظیم ذخیرہ ہے، جس سے دشمنانِ اسلام ہمیشہ تھراتے ہیں اور اس جذبہ کو مسلمانوں کے دل و دماغ سے نکالنے کی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ دشمنانِ اسلام کی طرف سے خود مسلمانوں میں ایسے لوگ کھڑے کیے گئے جنھوں نے جہاد کے خلاف ذہن سازی کی، مسلمانوں کے دل و دماغ سے جہاد کی عظمت و تقدس ختم کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کیں، جہاد کے لیے ایسی خود ساختہ شرطیں بیان کیں جن کا یکجا وجود جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

برٹش گورنمنٹ کو مسلمانوں کا جذبۂ جہاد سرد کرنے کے لیے ایک متنبی کھڑا کرنا پڑا۔ نبی کاذب مرزا غلام احمد قادیانی انگریزوں کی طرف سے اسی لیے برپا کیے گئے کہ وہ مسلمانوں کے دلوں سے جہاد کے "غلیظ خیالات" نکال کر انھیں ہمیشہ کے لیے انگریز کے قدموں میں ڈال دیں۔ غلام احمد

قادیانی نے اپنے اس عظیم کارنامے کا فخریہ تذکرہ خود اپنے قلم سے کیا ہے اپنی کتاب "ستارۂ قیصرہ" میں لکھتے ہیں:

"مجھ سے سرکار انگریزی کے حق میں جو خدمت ہوئی وہ یہ تھی کہ میں نے پچاس ہزار کے قریب کتابیں اور رسائل اور اشتہارات چھپوا کر اس ملک اور نیز دوسرے بلاد اسلام میں اس مضمون کے شائع کیے کہ گورنمنٹ انگریزی ہم مسلمانوں کی محسن ہے، لہذا ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اس گورنمنٹ کی سچی اطاعت کرے اور دل سے اس دولت کا شکر گزار اور دعاگو رہے۔ اور یہ کتابیں میں نے مختلف زبانوں یعنی اردو، فارسی، عربی میں تالیف کر کے اسلام کے تمام ملکوں میں پھیلا دیں یہاں تک کہ اسلام کے دو مقدس شہروں مکہ اور مدینہ میں بھی بخوبی شائع کر دیں، اور روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ اور بلاد شام اور مصر اور کابل اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا اشاعت کر دی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلیظ خیالات چھوڑ دیے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے، یہ ایک ایسی خدمت مجھ سے ظہور میں آئی ہے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان دکھلا نہیں سکا!"

(ستارۂ قیصرہ ص ۳)

وحید الدین خاں صاحب کو شکایت ہے کہ مسلمانوں نے جہاد کے بارے میں غلام احمد قادیانی کے نظریے سے اتفاق نہیں کیا۔ اپنی کتاب "تجدید دین" میں انیسویں اور بیسویں صدی کی تمام تحریکات کو کنڈم کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اس پورے دور میں تعمیر و استحکام کے مقصد کے تحت اٹھنے والی کوئی قابلِ لحاظ تحریک نظر نہیں آتی۔ مسلم رہنماؤں کا حال یہ رہا کہ وہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز" جیسے رومانی تصورات پر فدا ہوتے رہے، کسی کی سمجھ میں وہ حقیقت پسندانہ طریق کار نہ آسکا، جس کو بدنام طور پر حالی (۱۹۱۴-۱۸۳۷) نے ان لفظوں میں بیان کیا تھا:

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

ہندوستان میں اس سلسلہ میں دو مستثنیٰ مثالیں ملتی ہیں، وہ بھی دو بدنام شخصیتوں کی، میری مراد سر سید احمد خاں (۱۸۹۸ــ ۱۸۱۷) اور مرزا غلام احمد قادیانی (۱۹۰۸ــ۱۸۴۰) سے ہے ....

....

اسی قسم کی غلطی دوسری شکل میں مرزا غلام احمد قادیانی نے کی۔ انھوں نے اپنے کام کا آغاز کیا تو یہ وقت تھا جب کہ سارے مسلم رہنما انگریز کے خلاف جہادِ حریت میں مصروف تھے۔ ان پُرجوش مجاہدین کو محسوس ہوا کہ قادیانی مشن مسلمانوں کو مقدس جہاد کے محاذ سے ہٹا کر پُرامن تبلیغ کے میدان میں لگا دینا چاہتا ہے۔ مرزا صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ جہاد (بمعنی سیاسی مقابلہ) کوئی مستقل شرعی حکم نہیں ہے۔ وہ صرف دفاعی ضرورت کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ مگر ہمارے مجاہدین حریت کے لیے یہ جواب تشفی بخش ثابت نہ ہو سکا۔ انھوں نے فتویٰ دیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی انگریزوں کے ایجنٹ ہیں۔ اب مرزا صاحب نے ایک اور قدم بڑھایا۔ انھوں نے اپنی بات کو مستند ثابت کرنے کے لیے کہنا شروع کیا کہ ان پر وحی آتی ہے اور وہ جو کچھ بولتے ہیں خدا کی طرف سے بولتے ہیں۔ یہ دعویٰ تمام تر غلطی کے باوجود قدیم زمانہ میں انوکھا نہ تھا۔ کیونکہ ہمارے بہت سے بزرگ، مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ــ ۱۷۶۲)، بھی الھمنی ربی (میرے رب نے مجھ پر الہام کیا) جیسی زبان میں کلام کرتے ہیں۔ تاہم مرزا صاحب کی غلطی میں مزید شناعت اس لیے پیدا ہو گئی کہ انھوں نے صاف لفظوں میں اپنے رسول اللہ ہونے کا دعویٰ کر دیا جو ختم نبوت کے بعد اجماعی طور پر کفر کو مستلزم ہے۔"

(تجدید دین، ص ۴۳ ــ ۵۴)

اس اقتباس کو پڑھ کر انصاف پسند قاری صاف طور پر محسوس کرتا ہے کہ وحیدالدین خاں صاحب کو جہاد کے بارے میں مرزا غلام احمد قادیانی کے نظریہ سے اختلاف نہیں، بلکہ

اس کے صریح دعویٰ رسالت سے اختلاف ہے۔ چنانچہ موصوف نے غلام احمد قادیانی کے اس نظریہ جہاد "اسلام میں کوئی مستقل شرعی حکم نہیں، بلکہ وہ صرف دفاعی ضرورت کے لیے مقرر کیا گیا ہے" کو اپنا کر جہاد کو محض دفاعی ثابت کرنے کے لیے "وکالت اور استدلال" کی پوری طاقت صرف کر دی اور جہاد کے لیے ایسی خود ساختہ شرطیں لگائیں جن کا کتاب و سنت سے کوئی ثبوت نہیں۔ جہاد کے بارے میں وحید الدین خاں کے تصورات کا جائزہ اس کتاب میں تفصیل سے آئے گا۔ یہاں وحید الدین خاں کا صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"اسلام میں جنگ بطور دفاع ہے۔ اسلام میں اصل چیز دعوت ہے یعنی لوگوں کو پُرامن طور پر اور حکیمانہ انداز میں حق کی طرف بلانا۔ یہی اسلامی عمل کا آغاز ہے اور یہی اس کا اختتام بھی۔ تاہم اگر فریق ثانی جارحیت سے باز نہ آئے تو اس سے دفاعی جنگ کی جائے۔ مگر دفاعی جنگ کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس سے پہلے مسلمان نماز کو قائم کرنے والے بن جائیں۔"

(الرسالہ جون ۱۹۸۹ء ص ۱۰)

جہاد سے دوری اور بیزاری نے وحید الدین خاں کے قلم سے بھیانک تحریریں لکھوائی ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن، خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی چہیتی صاحبزادی، حواری رسول حضرت زبیر بن العوامؓ کی شریکِ حیات حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے مرتبہ و مقام سے کون مسلمان ناواقف ہوگا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ذات النطاقین کے لقب سے نوازا۔ اسی جلیل القدر صحابیہ کا تذکرہ وحید الدین خاں کے قلم سے پڑھیے:

"عبداللہ بن زبیر کی ماں (اسماء) نے ان کو مسلم حکمراں سے لڑنے پر اکسایا۔ چنانچہ ایک شخص جو لڑائی کا ارادہ چھوڑ چکا تھا وہ دوبارہ لڑائی لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ شہنشاہ اکبر کی ماں (مریم مکانی) نے اکبر کو ملا عبدالنبی کے خلاف کارروائی کرنے سے روکا۔ چنانچہ اکبر ان کے خلاف سخت کارروائی کرنے سے باز رہا۔ وغیرہ وغیرہ۔ راقم الحروف اگر بچپن میں ماں سے محروم ہو جاتا، یا اگر مجھ کو ایسی ماں ملتی جو مجھے اپنے "دشمنوں" کے خلاف لڑنے جھگڑنے پر اکساتی رہتی تو یقینی طور پر میری زندگی

کا رُخ بالکل دوسرا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسے انجام سے بچایا اور مجھ کو اپنی ایک صداقت کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ تاہم اس عالم اسباب میں جو ہستی اس واقعہ کا ابتدائی سبب بنی وہ یقیناً ایک خاتون تھی، اور وہ بھی اسلامی اصولوں کے مطابق ایک خانہ نشین خاتون "

(خاتون اسلام ص ۴۰، طبع ۱۹۸۵ء)

حضرت اسماءؓ جیسی مقدس، صاحب عزیمت ماں اور ان کے جلیل القدر فرزند حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پر پوری امت ہمیشہ فخر کرتی رہی ہے۔ وحید الدین خاں صاحب پہلے مسلمان ہیں جو حضرت اسماءؓ کی تربیت کو غلط قرار دیتے ہیں اور اس پر اللہ کا شکر کرتے ہیں کہ میری ماں نے وہ تربیت نہیں دی جو حضرت اسماءؓ نے اپنے بیٹے کی تربیت فرمائی، نیز حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسے "انجام" سے بچنے پر بے پناہ مسرور ہیں۔

دو تین صدیوں کے تمام مجددین و مصلحین، مجاہدین و شہداء وحید الدین خاں صاحب کے نزدیک معتوب ہیں۔ یہ سب حضرات (وحید الدین خاں کے بقول) منفی ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو گئے اور بربادی کی تاریخ چھوڑ کر اس دنیا سے گئے۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، سید احمد شہید بریلویؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، مجاہدین شاملیؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ان کی مضحکہ خیز اور بے بنیاد تنقیدوں کا نشانہ بنے۔ جب اتنی عظیم شخصیتیں وحید الدین خاں صاحب کے ناوک تنقید و تنقیص سے نہ بچ سکیں تو شیخ حسن البناء، سید قطب شہید، جمال الدین افغانی، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد اور معاصر شخصیتوں پر موصوف نے پیہم جو مشق ستم کی ہے اس کا شکوہ بے کار ہے

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

وحید الدین خاں صاحب دور حاضر میں مسلمانوں کو مسلسل ہزیمت و پسپائی کا درس دے رہے ہیں اور اپنے اس درس ہزیمت کو قرآن و سنت سے مدلل کر کے پیش کرنے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔ صلح حدیبیہ کے واقعہ کو اپنے مخصوص فکری سانچے میں ڈھال کر

اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ واقعات ان کے "فلسفۂ ہزیمت" کی اساس بن سکے اور اس سلسلے میں واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے قومی وملی مسائل میں ان کا رویہ بڑا افسوسناک ہے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت میں مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور اسلامی تشخص کی بقا کے لیے جو قابلِ قدر جد و جہد ہوئی اور ہو رہی ہے اس پر سطحی تنقیدیں کرنے کا "خوش گوار فریضہ" وحیدالدین خاں صاحب برابر انجام دے رہے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں ان کا مطالعہ یہ ہے:

"ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں یہ بات تقریباً ثابت شدہ ہے کہ اس کا آغاز ہمیشہ کسی مسلمان کی اشتعال انگیز کارروائی سے ہوتا ہے۔ یہ معاملہ ابتداءً ایک ہندو، ایک مسلمان کے درمیان ہوتا ہے، اس کے بعد مسلمانوں ہی کے پیدا کردہ حالات کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ یہ انفرادی واقعہ بہت جلد قومی واقعہ بن جاتا ہے۔"

(الرسالہ ستمبر ۱۹۸۵ء، ص ۱۳)

ہندوستانی مسلمانوں کے ملی مسائل میں وحیدالدین خاں صاحب اگر مجرد اپنی رائے پیش کرتے تو ہمیں ان سے تعرض کی زیادہ ضرورت نہ ہوتی، انھوں نے غضب یہ کیا ہے کہ اپنی ان آراء کو قرآن وسنت کا صریح فرمان بنا کر پیش کیا ہے۔ مثلاً موصوف جب اپنی یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کو حقوق طلبی کی مہم مکمل طور پر ترک کر دینا چاہیے تو قرآن کی ان آیتوں کا حوالہ دیتے ہیں جن میں انبیاء کرام کے اپنی اقوام کے سامنے اس اعلان کا ذکر ہے۔

"لا اسئلکم علیہ اجرا" (میں دین کی اس دعوت پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا)۔

مذکورہ بالا اشارات سے معلوم ہوا کہ وحیدالدین خاں صاحب کے انحرافات بہ کثرت ہیں، انھوں نے متعدد مسائل میں اجماع امت سے خروج کیا، آیات واحادیث کی غلط اور متضاد تشریحیں کیں، ردعمل کا شکار ہو کر دین کا غلط تصور پیش کیا، اسلام کے نظریہ جہاد کی غلط ترجمانی کی۔ صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین، فقہاء ومحدثین، مجددین ومصلحین، شہداء ومجاہدین

کو ہتک آمیز بے بنیاد تنقیدوں کا نشانہ بنایا۔ مسلمانوں کو تمام میدانوں میں ہزیمت و پسپائی کا درس دیا۔ ملی مسائل میں کتاب و سنت کا حوالہ دے کر غلط رہنمائی کی۔ اسی لیے ان کے افکار و نظریات کا ناقدانہ جائزہ لینا ایک اہم دینی ذمہ داری ہے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں ہر دور میں دین اسلام سے غلو پسندوں کی "تحریف" باطل پرستوں کے "انتحال" اور اہل جہل کی "تاویل" کا ازالہ مسلمانوں کا اہم فرض ہے۔

اسی دینی فریضہ کا احساس کر کے یہ کتاب لکھی گئی۔ وحید الدین خاں صاحب کی مفید تحریروں کی قدر اب بھی میرے دل میں ہے، اور یہ آرزو ہے کہ وحید الدین خاں صاحب دوبارہ اپنی تصنیفی اور فکری صلاحیتیں امت مسلمہ میں فکری انتشار پیدا کرنے کے بجائے اسلام کی دعوت و مدافعت اور تذکیری موضوعات کی طرف موڑ دیں تاکہ دوبارہ ان کے قلم سے "علم جدید کا چیلنج" جیسی فکر انگیز کتابیں جلوہ گر ہوں، الحمد للہ وحید الدین خاں صاحب سے نہ میری عداوت ہے نہ رقابت، نہ ہی ہم دونوں کے درمیان مصالح کا ٹکراؤ ہے۔ لیکن دین میں کتر بیونت اور امت مسلمہ کی غلط رہنمائی سے صرف نظر کرنا اسلام میں جرم ہے۔ اس لیے حق و صداقت کا اظہار کرنے کے لیے یہ کتاب شائع کی جارہی ہے، خصوصاً اس لیے کہ نوجوانوں کی ایک تعداد وحید الدین خاں کی تحریروں سے فکری انتشار اور اسلاف امت سے بے اعتمادی و بدگمانی کا شکار ہو رہی ہے۔

"تعبیر کی غلطی" کے مصنف کے لیے میری یہ تحریر صدمہ انگیز ہونے کے بجائے قابل شکر و ستائش ہونی چاہیے، کیونکہ انھیں کے الفاظ میں میں کہہ سکتا ہوں:

> "میرا یہ احساس کہ "دین مجروح ہوا ہے" میرے لیے اس بات کی کافی وجہ ہے کہ میں اس کو واضح کرنے کی کوشش کروں، کیونکہ دین کی وضاحت بذات خود مطلوب ہے۔"
>
> (تعبیر کی غلطی، ص ۲۱، دوسرا ایڈیشن)

وحید الدین خاں صاحب اپنی زندگی کا ساتواں دہا پار کر رہے ہیں، ان کی عمر ۶۵ سال سے متجاوز ہو چکی ہے، عمر کا یہ وہ مرحلہ ہے جب انسان کو فطری طور پر موت، آخرت اور

دربارِ خداوندی میں پیشی کا استحضار ہونے لگتا ہے اور انسان اپنی عملی وفکری لغزشوں کا جائزہ لے کر ان کی تلافی کرنا چاہتا ہے، مجھے توقع ہے کہ وحیدالدین خاں صاحب تمام زندگی کے نازک مرحلے میں میرا ناقدانہ جائزہ پڑھ کر ردعمل کی نفسیات کا شکار نہیں ہوں گے اور جذبات پر قابو پاکر پوری حق پسندی کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کریں گے، اگر انھیں کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد محسوس ہوگا کہ مجھ سے دین اسلام کی تعبیر وتشریح میں، مسائل کی ترجمانی میں، آیات واحادیث کی تشریح میں، امت کی رہنمائی میں اور اسلاف امت پر تنقید میں غلطیاں ہوئی ہیں تو اپنی علمی وفکری غلطیوں کا اعتراف واظہار کرکے اپنے کو اس ہولناک خطرے سے بچائیں گے کہ بعد کی نسلیں ان کی تحریروں سے فکری، اعتقادی اور عملی گمراہی میں مبتلا ہوں اور ان سب کا گناہ وحیدالدین خاں صاحب کے اعمال نامے میں لکھا جائے۔ میں مومنانہ خیرخواہی کی بنا پر ان کو انھیں کی یہ تذکیری تحریر یاد دلا رہا ہوں:

"بہت جلد وہ دن آنے والا ہے، جب کہ ہم میں سے ہر شخص خدا وند عالم کے سامنے کھڑا ہوگا۔ اس دن حقیقت آخری حد تک کھل چکی ہوگی، خوبصورت الفاظ کی دیواریں جو آج لوگوں نے اپنے گرد کھڑی کر رکھی ہیں، سب اس روز ڈھ جائیں گی، لوگ اس طرح ننگے ہو جائیں گے کہ درخت کے پتے بھی نہ ہوں گے جن سے وہ اپنے آپ کو چھپا سکیں۔ مبارک ہے وہ جس کے لیے وہ دن سعی مشکور کی خوش خبری لے کر آئے۔ بدنصیب ہے وہ جس کا دین اس روز قبول نہ کیا جائے اور خدا اس سے کہہ دے: تم جس بات کے علمبردار بنے ہوئے تھے وہ محض تمھارے دماغ کی اُپج تھی وہ میری بات ہی نہیں تھی!"

(تعبیر کی غلطی ص ۳۴۳، ۳۴۴، دوسرا ایڈیشن)

وحیدالدین خاں صاحب کے عقیدت مندوں کے دلوں میں شاید یہ شبہ پیدا ہو کہ موصوف کی تحریروں سے دینی فائدہ ہو رہا ہے، لوگ دعوت اور آخرت کی طرف مائل ہو رہے ہیں اس لیے ان کے افکار وخیالات اور تحریروں میں انحراف اور گمراہی کیسے ہو سکتی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ میں اپنی طرف سے کوئی بات کہنے کے بجائے وحیدالدین

خاں صاحب ہی کے الفاظ میں اس شبہ کا ازالہ کر دوں:

"بعض مرتبہ دین کے نام پر اُٹھنے والی کسی تحریک کی غلطیوں کو سمجھنا لوگوں کے لیے اس لیے بھی مشکل ہوجاتا ہے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ اس سے دین کے کچھ فائدے ہو رہے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ جس تحریک سے دین کو فائدہ پہنچے اس میں کوئی غلطی کس طرح ہوسکتی ہے۔ اس کا مفید ہونا خود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ صحیح ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں میں کوئی لازمی رشتہ نہیں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کوئی کوشش دین کے لیے کسی پہلو سے مفید ہو، مگر اس کوشش کی بنیاد درست نہ ہو۔ یورپ میں بعض عیسائیوں نے خدا کے اثبات پر نہایت اونچے درجے کے سائنسی دلائل فراہم کیے ہیں جو اب تک کسی مسلمان عالم سے ممکن نہ ہوسکا، مگر اس کے باوجود کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہی وہ چیز ہے، جو ایک انسان سے اللہ کو مطلوب ہے یا یہ کہ عیسائی خدا کے دین کے صحیح ترجمان ہیں۔"

(تعبیر کی غلطی، ص ۲۸۰)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق و صداقت اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے دل و دماغ کو زیغ و ضلال سے محفوظ رکھے۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

عتیق احمد قاسمی بستوی
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

۱۵ر۳ر ۱۱۴۱۳ھ

یہ کتاب

زیرِ نظر کتاب "فکر کی غلطی" وحید الدین خاں کے افکار کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ ہے۔ کتاب کے زیادہ تر مباحث کا تعلق موصوف کے دینی افکار سے ہے۔ اسلام کی تعبیر و تشریح، آیات قرآنی کی تفسیر، اسلامی احکام و تعلیمات کی تبیین میں وحید الدین خاں کے فکری انحرافات اور ان کے "جدید تصورِ دین" کا منصفانہ جائزہ اس کتاب میں لیا گیا ہے، اسی طرح ملی مسائل میں موصوف کے فکر و فہم کی خطرناک لغزشوں کی نشان دہی کتاب کے مختلف مباحث میں کی گئی ہے۔

وحید الدین خاں صاحب نے صحابۂ کرام، مجتہدینِ امت، متکلمینِ اسلام، مجاہدین، شہدا، مصلحین و مجددین پر جو جارحانہ تنقیدیں کی ہیں ان کا بھی مختصر لیکن اطمینان بخش جائزہ اس کتاب میں قارئین کو ملے گا۔

کتاب کے مضامین و مباحث کی ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ مقدمۂ کتاب کے بعد سب سے پہلے ان افکار و آرا کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں وحید الدین خاں صاحب نے امتِ مسلمہ کے اجماعی مسائل سے خروج کیا ہے۔ اس کے بعد وہ مباحث ہیں جن کا تعلق وحید الدین خاں صاحب کے پیش کردہ تصورِ دین سے ہے۔ فکر و نظر میں انحراف اور کجی کے اثرات بہت ہمہ گیر اور دور رس ہوتے ہیں، اس لیے کتاب و سنت کے فہم کا اس سے متاثر ہونا ایک فطری بات ہے۔ لہٰذا "تصورِ دین" کے مباحث سے فارغ ہونے کے بعد

خاں صاحب کی "قرآن فہمی" اور "حدیث دانی" کے متعدد نمونے قارئین کے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔

تفسیری تضادات اور حدیث دانی کے نمونے پیش کرنے کے بعد اسلاف امت پر ان کی تنقیدات کا بے لاگ جائزہ لیا گیا ہے، اس کے بعد متعدد ملی مسائل میں ان کے منفرد و منحرف خیالات و آراء کے بارے میں مضامین ہیں۔ کتاب کے آخر میں ایسے متفرق مباحث ہیں جن سے وحید الدین خاں صاحب کے منحرف اور غیر متوازن دینی و ملی افکار و خیالات کے پس منظر اور اسباب کا علم ہوتا ہے۔

تعلیمی اور فکری پس منظر

کسی شخص کے افکار و خیالات کی صحیح قدر و قیمت اور وزن جاننے کے لیے اس کی تعلیم و تربیت اور فکری مراحل سے واقفیت از حد ضروری ہے۔ ذیل میں ہم جناب وحید الدین خاں صاحب کے افکار و نظریات انہی کی تحریروں کے آئینے میں پیش کرنا چاہتے ہیں اس لیے ان کی تعلیم و تربیت اور فکری ارتقاء پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

جناب وحید الدین خاں صاحب کے بیان کے مطابق ان کی پیدائش جنوری ۱۹۲۵ء میں ہوئی، جب ان کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو ان کے والد جناب فرید الدین خاں مرحوم کا انتقال ہوا، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے عربی تعلیم مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر ضلع اعظم گڑھ) میں حاصل کی، مدرسۃ الاصلاح میں انھوں نے چند ہی سال گزارے، مدرسۃ الاصلاح میں موصوف علوم اسلامیہ کی تعلیم مکمل نہیں کر سکے، درمیان ہی میں انھوں نے دینی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر لیا، اس کے بعد انھوں نے از خود انگریزی سیکھی اور انگریزی کتابوں کے مسلسل مطالعہ سے اپنی صلاحیت بڑھاتے رہے۔

مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے علم و مطالعہ کی جو سطح تھی اسے انھوں نے اسلام کے روایتی علم کا نام دیا ہے، لکھتے ہیں:

"میرے اس تعلیمی اور فکری پس منظر نے اسلام کا کم از کم روایتی علم مجھے دیا تھا، مگر ظاہر ہے کہ دور جدید کی نسبت سے اسلام کو سمجھنے کے لیے وہ ناکافی تھا، چنانچہ ۱۹۴۵ء میں میں نے ایک فیصلہ کیا۔ ایک طرف میں نے

جدید افکار کو براہ راست ماخذ سے جاننے کی کوشش کی، دوسری طرف اسلام کو از سر نو سیکھنے کے لیے قرآن وحدیث اور اس سے متعلق علوم کو پڑھنا شروع کیا۔"

(الاسلام تیسرا ایڈیشن ص ۵)

مدرستہ الاصلاح میں تعلیم کے نتیجے میں حق و صداقت تک ان کی رسائی نہیں ہوئی، بلکہ ان کے بہ قول وہ تلاش حق کے لیے سرگرداں رہے، ان کے اس ذہنی سفر میں ایسے مرحلے بھی آئے کہ انھوں نے خودکشی تک کا ارادہ کر لیا، چنانچہ موصوف اپنے ماہنامہ الرسالہ میں لکھتے ہیں:

"پہلی بار میں ۱۹۴۵ء میں لاہور گیا تھا، اس وقت میری عمر تقریباً ۲۰ سال تھی، یہ میری زندگی کے اس دور کی بات ہے کہ میں "تلاش حق" کے کٹھن مرحلے سے گزر رہا تھا۔ میں اپنے ماحول میں ایک سیدھے سادھے نوجوان کی حیثیت سے جانا جاتا تھا، میرے چچا زاد بھائی مولانا اقبال احمد سہیل مجھ کو مرزا بھویا کہتے تھے، یہ حالات تھے کہ ۱۹۴۳ء میں میرے ساتھ ایک شدید حادثہ گزرا۔ یہ گویا ایک قسم کا انفجار (EXPLOSION) تھا جس نے میری بند شخصیت کو کھول دیا۔ یہ حادثہ بظاہر ایک مادی ناکامی کا واقعہ تھا؛ مگر وہ عملاً میرے لیے روحانی ناکامی کا واقعہ بن گیا۔ اس حادثہ نے میری سوئی ہوئی فطرت کو جگا دیا، اچانک میں نے جانا کہ میں نہیں جانتا۔ میں نے اپنے نہ جاننے کو دریافت کیا، اس حادثہ نے میری زندگی کو سکون کے دور سے نکال کر اضطراب کے دور میں داخل کر دیا.....

یہ دور تقریباً پانچ سال تک رہا، اس وقت میرے اوپر جو حالات گزرے وہ اتنے شدید تھے کہ کئی بار میں نے چاہا کہ خودکشی کر لوں۔ دیوانگی کے عالم میں کبھی کبھی کسی دور دراز بستی میں چلا جاتا اور کبھی کسی جنگل یا پہاڑ کی طرف نکل جاتا۔ ۱۹۴۵ء میں لاہور کا سفر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ اس وقت پاسپورٹ اور ویزا کے مسائل نہیں تھے، میں شاہ گنج

میں ایک ایکسپریس ٹرین میں سوار ہو گیا۔ . . . ٹرین نے سیدھا لے جا کر مجھے لاہور میں اُتار دیا۔ لاہور اسٹیشن پر اترنے والے تمام مسافر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ مگر میں دیوانگی کے عالم میں کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں، کیونکہ اس وقت لاہور میں میرا کوئی بھی جاننے والا نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب پلیٹ فارم خالی ہو گیا تو ایک خالی انجن دھواں اُڑاتا ہوا پٹری سے گزرا۔ میں اس کی طرف بڑھا کہ اپنے آپ کو اس کے نیچے ڈال دوں مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی مخفی طاقت نے میرے قدموں کو پکڑ لیا ہے، چاہنے کے باوجود میں آخری اقدام سے باز رہا۔ . . . . . میں کسی منصوبہ اور معلومات کے بغیر مختلف سڑکوں پر گھومتا رہا، یہاں تک کہ میں میور وڈ پہنچ گیا، یہاں سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے بورڈ نے بتایا کہ یہ ڈاکٹر محمد اقبال (۱۸۷۳ - ۱۹۳۸) کا مکان ہے، مکان بالکل اجاڑ دکھائی دے رہا تھا، میں وہاں ٹھہر گیا، سڑک سنسان تھی، میں بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے اکیلا کھڑا تھا، میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور میری زبان پر یہ الفاظ جاری تھے: "خداوندا تو کب آئے گا، میں کب تک تیرے آنے کا انتظار کروں"۔ یہ دعائیہ کلمہ میری اس آتشیں کیفیت کو بتا رہا ہے جس کے تحت میں اس زمانہ میں لاہور گیا اور دوسرے مقامات کے سفر کیے"۔

(ماہنامہ الرسالہ جون ۱۹۸۴ء ص ۳۵ - ۳۶)

معلوم نہیں یہ "دورۂ جنون" جسے وحید الدین خاں صاحب نے "تلاشِ حق" کا نام دیا ہے کب ختم ہوا۔ ایک دینی مدرسہ میں کتاب وسنت کے علم سے سینہ کو روشن کرنے کے بعد "تلاشِ حق" کے لیے سرگردانی ناقابلِ یقین چیز معلوم ہوتی ہے۔ کیا کتاب وسنت کے بعد کوئی اور سرچشمۂ ہدایت ہے، جس کی جستجو کی جائے؟ موصوف کے بیان کے مطابق پانچ سال تک ان کی یہ حالت رہی، ان کا "تلاشِ حق" کا

یہ سفر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی قائم کردہ جماعت اسلامی میں شمولیت پرختم ہوا، انھوں نے اپنی کتاب 'تعبیر کی غلطی' میں لکھا ہے:

"میں تقسیم ہند کے بعد نومبر ۱۹۴۷ء میں جماعت اسلامی کی تحریک سے متاثر ہوا اور تقریباً دس سال تک یکسوئی کے ساتھ اس سے مل کر کام کرتا رہا۔ یہ وقت تھا جب کہ اس کے بہت سے دیگر افراد کی طرح میں یہ سمجھتا تھا کہ مجھ کو آخری صداقت کا علم ہوگیا ہے، اس زمانہ میں، میں زیادہ تر جماعت کے عملی کاموں میں مشغول رہا اور جماعت کے مخصوص لٹریچر کے علاوہ دیگر چیزوں کے مطالعہ کی طرف بہت کم توجہ دے سکا۔"
(تعبیر کی غلطی ص ۲۲ دوسرا ایڈیشن)

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد تقریباً دس سال تک جناب وحیدالدین خاں صاحب جماعت اسلامی سے اس طرح وابستہ رہے کہ جماعت کے فکر کو آخری صداقت سمجھتے رہے، اس دوران وہ زیادہ تر جماعت کے عملی کاموں میں مشغول رہے اور جماعت کے مخصوص لٹریچر کے علاوہ دوسری چیزوں کے مطالعہ کی طرف بہت کم توجہ دے سکے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ موصوف ۱۹۵۷ء تک جب ان کی عمر ۳۰ سال تھی جماعت اسلامی کے فکر اور تصور دین سے مکمل طور پر متفق رہے، اس کے بعد جماعت اسلامی سے ان کے اختلاف کی روداد انہی کے الفاظ میں پڑھیے:

"اس کے بعد ایک ایسا وقت آیا جب بعض اسباب نے مجھے یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کے مواقع فراہم کردیے خاص طور پر دو سال کا بیشتر وقت میں نے قرآن کو پڑھنے اور اس کے مطالب پر غور کرنے پر صرف کیا، اس وقت پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ اس فکر پر میرا اعتقاد متزلزل ہو رہا ہے۔ قرآن کے مطالعہ کے دوران میں، شدت سے مجھ پر یہ احساس طاری ہوا کہ قرآن میرے اس تصور دین کی تصدیق نہیں کر رہا ہے، جس کو میں اب تک کا صحیح ترین اسلام کا تصور سمجھ رہا تھا۔" (تعبیر کی غلطی ص ۲۳)

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے مولانا مودودی مرحوم کے پیش کردہ تصورِ دین کے خلاف "تعبیر کی غلطی" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں انھوں نے اپنا یہ نظریہ پیش کیا کہ مولانا مودودی نے دین کی تعبیر و تشریح میں سنگین غلطی کی ہے، سیاست و حکومت کو دین حق مرکزی مقام دے دیا ہے، اور دین کا ایک ایسا تصور پیش کیا ہے، جسے برپا کرنے میں تمام انبیاء سابقین اور اسلاف امت ناکام رہے۔ "تعبیر کی غلطی" کی تمہید میں جناب وحیدالدین خاں صاحب نے لکھا ہے:

> "اس تعبیر کے تحت پیدا شدہ لٹریچر زبان حال سے اور اس کی بعض عبارتیں زبان قال سے اس بات کا اعلان ہے کہ اسلاف نے دین کو صحیح شکل میں نہیں سمجھا۔ . . . اس طرح یہ تعبیر گویا اپنے پورے وجود کے ساتھ اسلاف کے تصورِ دین کے بارے میں ایک قسم کی بے اعتمادی کا اظہار ہے اور اس بات کا اعلان ہے کہ انھوں نے ٹھیک ٹھیک اس طرح دین کی خدمت کی کوشش نہیں جیسی کہ حقیقۃً کی جانی چاہیے تھی۔ مجھے یہ ماننے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ ہمارے علمائے بعض آیات یا بعض حدیثوں کا مطلب صحیح طور پر نہ سمجھا ہو، دوسرے لفظوں میں اجزائے دین میں سے کسی جزو کی نوعیت متعین کرنے میں وہ غلطی کر گئے ہوں، اسی طرح ان کے بارے میں عملی کوتاہیوں اور خامیوں کے امکان کا اقرار بھی برداشت کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ بات قطعاً ناقابلِ تسلیم ہے کہ حقیقتِ دین کو سمجھنے میں انھوں نے غلطی کی، یا دین کی خدمت کا صحیح طریقہ اختیار کرنے میں وہ ناکام رہے۔ میرے لیے یہ احساس ساری دنیا کی نعمتوں سے بڑھ کر لذیذ ہے کہ میری یہ کتاب اسلاف کے اوپر وارد ہونے والے اعتراض کی مدافعت ہے۔ میں اپنے عاجز و ناتواں وجود کے ساتھ ان کی طرف سے دفاع کرنے کے لیے اٹھا ہوں۔"
>
> (تعبیر کی غلطی ص ۱۴)

"تعبیر کی غلطی" ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی، اس کے چند سال بعد جناب وحیدالدین خاں صاحب نے ایک ایسی کتاب لکھی جس کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی، انھوں نے اپنی مشہور کتاب

"علم جدید کا چیلنج" مرتب کی جس میں انھوں نے یہ حقیقت آشکارا کی علوم جدیدہ، خصوصاً سائنس اسلام کے مخالف نہیں بلکہ اسلام کے موید و خادم ہیں۔ علوم جدیدہ نے اپنے اکتشافات کے ذریعہ اسلام کے عقائد و احکام کو دو دو چار کی طرح ثابت کر دیا ہے، یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوئی اور علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کتاب کا ترجمہ "الاسلام یتحدی" کے نام سے شائع ہوا جو بلاد عربیہ میں مصنف کے تعارف کا ذریعہ بنا۔ اگر وحید الدین خاں صاحب اسی طرح کے موضوعات پر لکھتے رہتے اور اپنی توانائیاں اسی طرح کے موضوعات کے لیے وقف کر دیتے تو وہ اسلام کی زیادہ بہتر خدمت انجام دیتے اور ان کی صلاحیتیں صحیح مصرف میں خرچ ہوتیں۔

لیکن اس کے بعد پھر انھوں نے اپنے قلم کا رخ موڑ دیا اور عصر حاضر میں اسلام کی جدید تعبیر و تشریح اور تصور دین کی تصحیح کو اپنا موضوع بنایا، اور اس موضوع پر لکھنے میں ان کا انداز ایجابی سے زیادہ سلبی رہا، نتیجہ یہ ہوا کہ جو شخص اسلاف کے تصور دین کا دفاع کرنے کے لیے کھڑا ہوا، اسی نے اسلاف کے تصور دین کے کھنڈر پر نئے تصور دین کا محل تعمیر کرنے کی کوشش کی۔

افضلیت انبیاء اور اجماعِ اُمّت

انبیاء کرام میں بعض کا بعض سے افضل ہونا اور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام انبیاء سے افضل ہونا امت مسلمہ میں متفق علیہ رہا ہے۔ قرآن کریم میں دو مقامات پر بعض انبیاء کا بعض انبیاء سے افضل ہونا پوری صراحت کے ساتھ مذکور ہے:

تلک الرسل فضلنا بعضهم علی بعض منهم من کلم اللّٰه ورفع بعضهم درجات وآتینا عیسی بن مریم البینات وایدناه بروح القدس۔ (سورۂ بقرہ آیت: ۲۵۳)	یہ پیغمبر (جو ہم وقتاً فوقتاً بھیجتے رہے ہیں) ان میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے بعض ایسے ہیں جن سے خدا نے گفتگو فرمائی اور بعض کے (دوسرے امور میں) مرتبے بلند کیے اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے کھلی ہوئی نشانیاں عطا کیں اور روح القدس سے ان کو مدد دی۔
ولقد فضلنا بعض النبیین علی بعض وآتینا داؤد زبورا۔ (سورۂ اسراء: ۵۵)	اور ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت بخشی اور داؤد کو زبور عنایت کی۔

رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام انبیاء اور تمام مخلوقات سے افضل ہونا امت مسلمہ میں ہمیشہ متفق علیہ رہا ہے۔ قرآن وسنت میں بیان کردہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار فضائل وخصوصیات سے آپ کا افضل الانبیاء ہونا ثابت ہے۔ قرآن وسنت کی انھیں تصریحات کی بنا پر مفسرین ومحدثین نے ان احادیث کی توجیہ کی

ہے جن میں بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دینے سے منع کیا گیا ہے۔ ان احادیث کی توجیہ کتب تفسیر اور شروح حدیث میں دیکھی جا سکتی ہے۔

جناب وحید الدین خاں صاحب نے امت کے اجماعی نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"قرآن میں ہے وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل (آل عمران: ۱۴۴) اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم ویسے ہی ایک رسول تھے جیسے دوسرے تمام رسول۔ آپ میں اور دوسرے رسولوں میں درجہ اور منصب کا کوئی فرق نہیں۔ خدا کے تمام رسول ایک ہی دین لے کر آئے۔ ان میں سے کوئی رسول نہ دوسرے رسولوں سے افضل تھا اور نہ ان میں سے کسی کا دین دوسروں کے دین کے مقابلہ میں زیادہ کامل۔

اس سلسلے میں یہاں چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں:

عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تخیرونی بین الانبیاء۔ (متفق علیہ)	مجھ کو نبیوں کے درمیان ممتاز نہ ٹھہراؤ۔
عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تفضلوا بین انبیاء اللہ۔ (بخاری)	اللہ کے نبیوں میں کسی کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔
عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما ینبغی لاحد ان یقول انی خیر من یونس بن متی۔ (متفق علیہ)	کسی شخص کو نہیں چاہیے کہ وہ کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں۔
عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال انا	جس شخص نے کہا کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں اس نے

خیر من یونس بن متی فقد کذب۔ جھوٹ کہا۔

(بخاری)

پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے رسولوں میں کیا فرق تھا؟ وہ فرق یہ تھا کہ دوسرے رسول صرف رسول تھے اور آپ اسی کے ساتھ آخری رسول۔ (ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین) دوسرے رسول سلسلۂ رسالت کی درمیانی کڑی تھے اور آپ سلسلۂ رسالت کی آخری کڑی۔

(الرسالہ مارچ ۱۹۸۶ء ص ۳۸)

معلوم نہیں اوپر ذکر کردہ دونوں صریح آیتوں کی موجودگی میں جناب وحیدالدین خاں صاحب یہ لکھنے کی ہمت کس طرح کر گئے کہ کوئی رسول کسی رسول سے افضل نہیں، حالانکہ اصول یہ ہے کہ قرآن کریم کی صریح آیات کے مقابلہ میں اگر صحیح احادیث آئیں اور بالفرض آیت وحدیث میں تطبیق ممکن نہ ہو تو قرآن کی آیت کو اختیار کیا جائے گا۔

امام رازیؒ نے تلک الرسل فضلنا بعضھم علیٰ بعض کے ذیل میں لکھا ہے:

(المسألة الرابعة) اجمعت الامة	امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے
علی ان بعض الانبیاء افضل من بعض	کہ بعض انبیاء بعض سے افضل ہیں اور
وعلی ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم افضل	اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ محمد
من الکل۔	صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے
(التفسیر الکبیر للرازی جزو ۲ ص ۱۹۵)	افضل ہیں۔

اس کے بعد امام رازیؒ نے تقریباً چند صفحات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل الانبیاء ہونے کے دلائل ذکر کیے ہیں اور شبہات کا جواب دیا ہے۔ سیرت نبوی کی تمام اہم کتابوں سیرت ابن ہشام، زاد المعاد، الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ وغیرہ میں خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور ان کے افضل الانبیاء ہونے کے دلائل تفصیل سے ذکر کیا۔

جہاں تک ان احادیث کا تعلق ہے جن کا وحیدالدین خاں صاحب نے حوالہ دیا ہے ان کے بارے میں مختصر بات یہ ہے کہ اگر موصوف نے ان احادیث کے پس منظر اور سیاق وسباق کا مطالعہ کر لیا ہوتا اور شارحین حدیث کی تشریحات پر ایک نظر ڈال لی ہوتی تو وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کا انکار کر کے خرق اجماع کا ارتکاب نہ کرتے۔

انبیاء کو ایک دوسرے سے افضل قرار دینے کی ممانعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمائی جب اسی بنا پر ایک یہودی اور ایک مسلمان میں جھگڑا ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمان نے یہودی کے چہرے پر زور کا طمانچہ مارا، اور یہ مقدمہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا۔ اس موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تفضیل بین الانبیاء سے منع فرمایا اور دوسری احادیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر حضرت یونس بن متیٰ کا ذکر اس لیے فرمایا کہ ان کے واقعہ کو پڑھ کر ذہن میں تنقیص کا پہلو آسکتا ہے اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا خصوصی ذکر فرما کر تنقیص کے امکان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہا۔

لا تفضلوا بین الانبیاء کی تشریح کرتے ہوئے مشہور شارح حدیث حافظ ابن حجر عسقلانی رح لکھتے ہیں:

قال العلماء فی نہیہ صلی اللہ علیہ وسلم عن التفضیل بین الانبیاء: انما نھی عن ذلک من یقولہ برایہ لا من یقولہ بدلیل أو من یقول بحیث یؤدی الی تنقیص المفضول أو یؤدی الی الخصومۃ والتنازع او المراد لا تفضلوا بجمیع انواع الفضائل بحیث لا یترک

انبیاء کے درمیان تفضیل سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ممانعت فرمائی ہے اس کے بارے میں علماء فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے سے ایک نبی کو دوسرے نبی پر فضیلت دینے سے منع فرمایا ہے۔ دلیل کی بنا پر ایک نبی کو دوسرے نبی سے افضل قرار دینے سے منع نہیں فرمایا بعض علماء کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد ایسی تفضیل سے منع کرنا ہے جس سے دوسرے نبی کی تنقیص ہوتی ہو یا خصومت اور تنازع پیدا ہوتا

للمفضول فضيلته فالامام
مثلاً اذا قلنا انه افضل
من المؤذن لا يستلزم
نقص فضيلة المؤذن
بالنسبة الى الاذان . . .
. . . .
. . . .
. . . .
وقال الحليمي الاخبار الواردة
في النهي عن التخيير انما
هو في مجادلة أهل
الكتاب وتفضيل بعض
الانبياء على بعض بالمخايرة
لأن المخايرة اذا وقعت
بين اهل دينين لا يؤمن
أن يخرج احدهما الى الازدراء
بالآخر فيفضي الى الكفر فأما
اذا كان التخيير مستندًا الى
مقابلة الفضائل لتحصيل
الرجحان فلا يدخل
في النهي ۔ (فتح الباري جلد ۶ ص ۴۴۶
كتاب الانبياء، المكتبة السلفية)

ہو۔ یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ
ہو کہ کسی نبی کو دوسرے نبی پر تمام پہلوؤں
سے فضیلت نہ دو کہ دوسرے نبی کے لیے
کوئی فضیلت نہ بچے۔ مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ
امام موذن سے افضل ہے تو اس سے یہ
لازم نہیں آتا ہے کہ اذان دینے کی وجہ
سے موذن کو جو فضیلت ہے اس کا بھی انکار
کیا جائے۔ . . . .
حلیمی کہتے ہیں: انبیاء کو ایک دوسرے سے
بہتر قرار دینے کی ممانعت کے بارے میں جو
احادیث آئی ہیں ان کا محل یہ ہے کہ اہل کتاب
سے بحث و مجادلہ کے وقت ایک نبی کو
دوسرے نبی پر فضیلت نہ دو کیونکہ دو مذاہب
کے ماننے والوں کے درمیان جب یہ
بحث ہوگی کہ کون نبی دوسرے نبی سے
بہتر ہے تو اس بات کا اطمینان نہیں ہے کہ
کوئی فریق دوسرے مذہب کے نبی کی توہین
کر گزرے جس سے کفر تک پہنچ جائے۔ لیکن
اگر فضائل کا موازنہ کرکے انبیاء کو باہم
ایک دوسرے پر فضیلت دی جائے تو یہ
چیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت
کے دائرے میں نہیں آتی۔

اسلام میں شاتمِ رسولؐ کی سزا

سلمان رشدی کے بارے میں وحید الدین خاں کے موقف کا جائزہ

دینِ اسلام میں محبتِ رسول کی اہمیت :

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) کی محبت جزو ایمان ہے۔ ایک مسلمان جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو، خواہ کتنا ہی گنہگار اور غرقِ عصیان ہو، ناموسِ رسالت کے خلاف ایک حرف برداشت نہیں کر سکتا۔ محبتِ رسول مسلمانوں کے لیے ایمان ویقین کا سرچشمہ اور آخرت کے لیے بہترین ذخیرہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی محبت قرآن وسنت کی رو سے مطلوب ہے۔ اللہ اور اس کے رسول سے اپنی جان، مال، بیوی اور اولاد سے زیادہ محبت ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

قل إن كان آباؤكم وابناؤكم	آپ فرما دیجئے کہ اگر تمھارے باپ
واخوانكم وازواجكم وعشيرتكم	دادا، بیٹے، بھائی، بیویاں، خاندان
واموال ن اقترفتموها وتجارة	اور تمھارے ذخیرہ کیے ہوئے اموال
تخشون كسادها ومساكن	اور وہ تجارت جس میں کساد بازاری سے
ترضونها احب اليكم من	تم ڈرتے ہو اور پسندیدہ رہائش گاہیں
الله ورسوله وجهاد في	تمھیں اللہ، اللہ کے رسول اور اللہ
سبيله فتربصوا حتى يأتي	کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہوں
الله بأمره والله لا يهدي	تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا

القوم الفاسقین۔ حکم (عذاب) آئے، اور اللہ نافرمان
(التوبہ۔ ۱۰) قوم کو ہدایت یاب نہیں کرتے۔

قرآن پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہونچانے والوں کو دردناک عذاب کی خبر دی گئی:

والذین یؤذون رسول اللہ — جو لوگ اللہ کے رسول کو ایذا پہنچاتے
لھم عذاب الیم۔ (توبہ۔ ۶۱) — ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر ادب و تعظیم، عزت و احترام کا معاملہ کیا جانا اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل آیت سے لگایا جاسکتا ہے:

یا ایھا الذین آمنوا لا ترفعوا — اے ایمان والو ! نبی کی آواز پر اپنی
اصواتکم فوق صوت النبی — آوازیں بلند نہ کرو اور نہ نبی سے اس
ولا تجھروا لہ بالقول کجھر — طرح زور سے بولو جس طرح ایک دوسرے
بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم — سے زور سے بولتے ہو کہ تمہارے اعمال
وانتم لا تشعرون۔ — اکارت ہو جائیں اور تم کو احساس بھی
(سورہ حجرات آیت ۲) — نہ ہو۔

ذاتِ رسالت سے سب سے زیادہ محبت کمالِ ایمان کی اہم شرط ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ — حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے
علیہ وسلم لا یؤمن احدکم حتی — کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن
اکون احب الیہ من والدہ وولدہ — نہیں ہو سکتا ہے جب تک میری ذات
والناس اجمعین۔ (بخاری کتاب الایمان — سے اسے اپنے باپ بیٹے اور تمام لوگوں
باب حب الرسول من الایمان)۔ — سے زیادہ محبت نہ ہو جائے۔

امت مسلمہ کا اجماع:

آغازِ اسلام سے لے کر چودہ صدیوں تک امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع

ہے کہ کسی مسلمان کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور سب وشتم بدترین قسم کا ارتداد ہے اور ایسا شخص مباح الدم اور واجب القتل ہے۔ امت کے تمام ائمہ، فقہاء، محدثین ومفسرین شاتم رسول کے واجب القتل ہونے پر متفق ہیں۔ صحابہ، تابعین فقہاء مجتہدین کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اہانت رسول کا ارتکاب کرنے والے کی سزا کے بارے میں قرآن وسنت کی نصوص اور امت مسلمہ کے اجماعی موقف کی تفصیل ان کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے:

(۱) الصارم المسلول علی شاتم الرسول (شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ)۔

(۲) السیف المسلول علی من سب الرسول (تقی الدین ابوالحسن علی السبکی)۔

(۳) تنبیہ الولاۃ والحکام علی احکام شاتم خیر الانام او احد اصحابہ الکرام۔ (ابن عابدین الشامی)۔

حافظ ابن تیمیہؒ اپنی مشہور کتاب "الصارم المسلول" میں لکھتے ہیں:

قال (القاضی عیاض) اجمعت الامۃ علی قتل منتقصہ من المسلمین وسابہ وکذلک حکی عن غیر واحد الاجماع علی قتلہ وتکفیرہ۔ قال الامام اسحاق بن راھویہ احد الائمۃ الاعلام: اجمع المسلمون علی ان من سب اللہ او سب رسولہ (ص) اودفع شیئا مما انزل اللہ عزوجل اوقتل نبیا من انبیاء اللہ عزوجل انہ کافر بذلک وان کان مقرا بکل ما انزل اللہ۔ قال الخطابی: لا اعلم	قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ جو مسلمان رسول اکرمؐ کی تنقیص کرے اور سب وشتم کرے اس کے قتل اور تکفیر پر امت مسلمہ کا اجماع ہے۔ جلیل القدر امام اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں، مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب وشتم کیا یا اللہ کی نازل کی ہوئی کسی بات کا انکار کیا یا اللہ تعالیٰ کے کسی نبی کو قتل کیا وہ کافر ہوگیا خواہ وہ اللہ کی نازل کی ہوئی تمام باتوں کا اقرار کرتا ہو۔ خطابی لکھتے ہیں، مجھے کسی مسلمان کا

احدا من المسلمين اختلف فى وجوب قتله وقال محمد بن سحنون: اجمع العلماء على أن شاتم النبى (ص) او المنتقص له كافر والوعيد جار عليه بعذاب الله له وحكمه عند الأمة القتل، ومن شك فى كفره وعذابه كفر۔

اس بارے میں اختلاف نہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب وشتم کرنے والے کا قتل واجب ہے۔ محمد بن سحنون فرماتے ہیں: علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب وشتم کرنے والا اور آپ کی تنقیص کرنے والا کافر ہے، اس کے لیے اللہ کے عذاب کی وعید آئی ہے امت مسلمہ کے نزدیک اس کا حکم قتل ہے اور اس کے کفر اور عذاب میں شک کرنے والا کافر ہے۔

وتحرير القول فيه: ان الساب ان كان مسلمًا فانه يكفر ويقتل بلا خلاف وهو مذهب الأئمة الأربعة وغيرهم، وقد تقدم ممن حكى الاجماع على ذالك اسحاق بن راهويه وغيره. (الصارم المسلول على شاتم الرسول ص ۵)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب وشتم کرنے والا اگر مسلمان ہے تو اپنے اس عمل کی وجہ سے کافر ہو جاتا ہے اسے قتل کیا جائے گا یہی ائمہ اربعہ اور دوسرے ائمہ کا مذہب ہے۔ اس سلسلے میں اسحاق بن راہویہ وغیرہ نے اجماع نقل کیا ہے۔

فخر المتاخرین علامہ ابن عابدین شامیؒ شاتم رسول کے موضوع پر اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں:

"(پہلا مسئلہ) خاتم المجتہدین امام تقی الدین ابو الحسن علی بن عبد الکافی السبکی رحمہ اللہ اپنی کتاب "السیف المسلول علی من سب الرسول" (صلی اللہ علیہ وسلم) میں لکھتے ہیں: قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ جو مسلمان رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی تنقیص کرے اور سب وشتم کرے اس کے قتل پر امت کا اجماع ہے۔ ابوبکر بن المنذر فرماتے ہیں: اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب وشتم کرے اس کی سزا قتل ہے۔ مالکؒ بن انس، لیثؒ بن سعد، احمدؒ بن حنبل، اسحاق بن راہویہ نے یہی بات کہی ہے۔ امام شافعیؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ سب وشتم کرنے والا اگر مسلمان ہے تو اس کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ سفیان ثوریؒ، اہل کوفہ اور امام اوزاعیؒ نے بھی سزائے قتل کا حکم لگایا ہے۔"

(تنبیہ الولاۃ والحکام علی احکام شاتم خیر الانام
ص ۲۹۴ مجموعہ رسائل ابن عابدین جزء اول)

شاتم رسولؐ کے واجب القتل ہونے کے سلسلے میں قرآن وسنت کے دلائل اتنے کثیر اور صریح ہیں کہ کوئی انصاف پسند ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے "الصارم المسلول" میں زیر بحث مسئلہ پر قرآن پاک سے چھ دلائل ذکر کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کرنے والے کے مباح الدم واجب القتل ہونے کے سلسلے میں پندرہ حدیثیں ذکر کی ہیں اور ان پر بڑے سائز کے ایک سو بیس صفحات پر بحث کی ہے، شبہات کا جواب دیا ہے۔ استدلال کی وضاحت کی ہے اور حسب عادت دوران بحث احادیث وآثار کا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ شاتم رسولؐ کے واجب القتل ہونے کے بارے میں حافظ ابن تیمیہؒ نے صحابۂ کرام کا اجماع ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

اما اجماع الصحابة فلان	جہاں تک اجماعِ صحابہ کا تعلق ہے
ذالك نقل عنهم فی قضايا	اس کی دلیل یہ ہے کہ اتنے متعدد
متعددة ينتشر مثلها	واقعات میں صحابۂ کرام سے یہ بات
ويستفيض ولم ينكرها احد	(شاتم رسول کا واجب القتل ہونا) منقول
منهم فصارت اجماعا واعلم	ہے جنھیں شہرت واستفاضہ حاصل

أنه لايمكن ادعاء اجماع الصحابة على مسئلة فرعية بابلغ من هذا الطريق۔	ہوجاتا ہے اور کسی صحابی نے اس پر نکیر نہیں کی ہے۔ یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ کسی فرعی مسئلہ میں اس سے زیادہ مضبوط طریقہ سے صحابۂ کرام کے اجماع کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔
(الصارم المسلول على شاتم الرسول ص ۱۶۳)	

شاتم رسولؐ کی سزا کے بارے میں امت مسلمہ میں چودہ صدیوں تک جس پیمانے کا اجماع رہا ہے اس طرح کا اجماع بہت کم مسائل میں ملے گا۔ اس طرح کے اجماعی مسئلہ کے بارے میں اختلاف کھلی ہوئی گمراہی ہے۔

سلمان رشدی کی دریدہ دہنی:

بیسوی صدی کے آخر میں ملعون سلمان رشدی نے "شیطانی آیات" کے ذریعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر اہانت، سب و شتم کی ہے اس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ اس ملعون نے اپنے اس "شیطانی کارنامے" سے ابوجہل، ابولہب اور ابلیس لعین کو بھی شرما دیا ہے۔ "شیطانی آیات" کے خلاف پورے عالم اسلام میں جو ردعمل ہوا وہ ایمانی غیرت وحمیت کا تقاضا تھا۔ "شیطانی آیات" میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی تنقیص و توہین کی گئی ہے۔ خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) کا مذاق اڑایا گیا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کا پوری بے حیائی، دریدہ دہنی کے ساتھ ذکر کیا گیا، اسلامی شریعت کی نظر میں سلمان رشدی کے جرم کی سزا دو دو چار کی طرح واضح اور قطعی ہے۔ سلمان رشدی اپنی کفریات کی اشاعت کرکے اور ان پر اصرار کرکے مرتد ہوچکا ہے، اہانتِ انبیاء اور سبِ صحابہ کی وجہ سے اس کا جرم ارتداد زیادہ سنگین ہوچکا ہے اس لیے وہ مباح الدم، واجب القتل ہوچکا ہے، اس ملعون کو قتل کرنا کارِ ثواب اور دین کی نصرت ہے۔

خمینی اور ایران کا رویہ:

خمینی اور ایران نے سلمان رشدی کے سلسلے میں جو رویہ اختیار کیا وہ بلاشبہ حکمت و دانائی کے خلاف تھا، اس طریقۂ کار سے سلمان رشدی ہی کو فائدہ ہوا۔ اسے مضبوط تحفظ فراہم کر دیا گیا، اس کی شہرت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ تمام اسلام دشمن طاقتیں اس کی پشت پناہی کے لیے متحد ہو گئیں، اس کے معاملہ کو بین الاقوامی مسئلہ بنا دیا گیا۔ سلمان رشدی کے بارے میں خمینی اور ایران نے جو طریقہ اختیار کیا اس سے خمینی اور ایران کو ضرور فائدہ پہنچا، عالم اسلام میں ایران کی گرتی ہوئی ساکھ سنبھل گئی۔ عامۃ المسلمین میں ایران کی نیک نامی ہو گئی، لیکن سلمان رشدی کا کیس بھی مضبوط ہو گیا، عالمی سطح پر غیر مسلموں میں اس کے لیے ہمدردی اور تحفظ کا جذبہ پیدا ہو گیا، اسے آہنی دیواروں کے پیچھے اس طرح چھپا دیا گیا کہ وہاں تک کسی کا ہاتھ پہنچنا دشوار تر ہو گیا۔ اگر اس کے بجائے حکمت و دانائی، اخفاء اور رازداری کا طریقہ اختیار کیا گیا ہوتا تو اس دشمن رسول کو اتنا تحفظ فراہم نہ ہو پاتا اور اس کے ناپاک وجود سے روئے زمین پاک ہو چکی ہوتی۔

سلمان رشدی کے بارے میں وحیدالدین خاں کا طرزِ عمل:

شریعت اسلامی کی نظر میں سلمان رشدی کے جرم کی سزا اتنی واضح ہے کہ اس کے بارے میں دو رائیں ممکن نہیں ہیں، قرآن و سنت اور اجماعِ امت کی روشنی میں یہ شخص زندگی کا استحقاق کھو چکا ہے اور مباح الدم واجب القتل قرار پا چکا ہے۔ لیکن اس دورِ فتن میں اسلام کی غربت اور بے بسی اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ اسلام کے قطعی مسلمات بھی خود مسلم مدعیانِ علم و تحقیق کی طرف سے تشکیک وارتیاب کا نشانہ بن چکے ہیں، امتِ مسلمہ کے اجماعی مسائل کا انکار دور حاضر

کا فیشن بن چکا ہے۔ چشم فلک یہ منظر دیکھ کر حیران ہے کہ "دعوتِ اسلام" کی رٹ لگانے والا ایک "مفکر" سلمان رشدی کی دفاع میں قلم سنبھالے ہوئے ہے اور اجماعِ امت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے خود ان مسلمانوں کو طعن وتشنیع، سب وشتم کا نشانہ بنائے ہوئے ہے جو ناموسِ رسالت کی حفاظت کے لیے جد وجہد کر رہے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت پر پابندی لگانے کا مطالبہ کر رہے ہیں، اور برطانوی حکومت پر سیاسی دباؤ ڈال رہے ہیں کہ شاتمِ رسول کی حفاظت سے دست کش ہو جائے اور اسے قرار واقعی سزا دے۔

میری مراد وحید الدین خاں صاحب سے ہے۔ انھوں نے 'الرسالہ' میں اس دشمنِ رسول کی مدافعت کا بیڑا اٹھا رکھا ہے اور سلمان رشدی کے خلاف کی جانے والی کوششوں کے خلاف پورا زورِ قلم خرچ کر دیا، ناموسِ رسالت کی حفاظت کے لیے کیے جانے والے اقدامات پر دل خراش جارحانہ تبصرے کیے۔ حیرت ہے کہ وحید الدین خاں صاحب کا قلم مسلمانوں کو صبر کی تلقین اور غیر مسلموں کے ساتھ عدمِ جارحیت کا رویہ اپنانے کی نصیحت سے نہیں تھکتا، لیکن مسلمان علماء، مفکرین، فقہاء، مجتہدین اور عامۃ المسلمین پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے ان کا قلم جارحیت کی آخری حدوں کو چھو لیتا ہے اور تنقیص واستہزاء کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، خدا جانے یہ حکمتِ دعوت کی کون سی قسم ہے۔

ماہنامہ 'الرسالہ' دہلی کے جون، جولائی ۱۹۹۶ء کے شمارے شاتمینِ رسول کی جانب سے وکالت سے پُر ہیں۔ خاں صاحب نے شتمِ رسول کے جرم میں سزائے قتل سے انکار کیا ہے اور شاتمِ رسول کی سزائے قتل کو قرآن وسنت کی مخالفت قرار دیا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> "موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا عام خیال یہ ہو گیا ہے کہ پیغمبر کے ساتھ گستاخی یا اس کا استہزاء ایک ایسا جرم ہے جو علی الاطلاق طور پر مجرم کو واجب القتل بنا دیتا ہے، یعنی جیسے ہی کوئی شخص ایسے الفاظ بولے جو

مسلمانوں کو رسول اللہ کی شان میں گستاخی نظر آئے، اس کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ اس قسم کا مطلق نظریہ شرعی اعتبار سے بے بنیاد ہے۔ اسلام میں اس کے لیے کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں۔" (الرسالہ جون ۱۹۸۹ء ص ۱۴)

"کیا اس کے بعد بھی اس میں شبہ کی کوئی گنجائش باقی ہے کہ رسول اللہ کی شان میں گستاخی بجائے خود مستوجب قتل جرم نہیں ہے۔ کسی کے واجب القتل ہونے کے لیے اسی کے ساتھ کچھ مزید اسباب درکار ہیں۔ مثلاً ریاست اسلامی سے بغاوت۔ چند افراد جو دور اول میں قتل کیے گئے ہیں، ان کا معاملہ اسی دوسرے حکم کے تحت آتا ہے۔ انھیں ریاست سے بغاوت کے جرم میں قتل کیا گیا نہ کہ مجرد گستاخی رسول کے جرم میں۔"

(الرسالہ جون ۱۹۸۹ء، ص ۲۳، ۲۴)

"ایسی حالت میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھ گستاخی علی الاطلاق طور پر مستوجب قتل جرم ہے، وہ ایک ایسی بات کہتے ہیں جس کے لیے ان کے پاس قرآن و سنت کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔"

(الرسالہ جون ۱۹۸۹ء ص ۲۶)

"یہ ہے اس طرح کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ۔ اب اگر مسلمان یہ کہتے ہیں کہ سلمان رشدی کی کتاب سے ہمارے جذبات مجروح ہوئے ہیں اور ہم تو اس کو قتل کر کے رہیں گے، تو میں کہوں گا کہ "مسلمانوں کے جذبات کا مجروح ہونا" اسلام کے قانون جرائم کی کوئی دفعہ نہیں ہے۔ مسلمان اگر اس قسم کی کارروائی کرنا چاہتے ہیں تو اس کو اپنی قومی سرکشی کے نام پر کر سکتے ہیں۔ مگر اسلام کے نام پر انھیں ایسا کرنے

کا کوئی حق نہیں۔ اگر وہ اسلام کے نام پر اس قسم کا فعل کریں تو انھیں ڈرنا چاہیے کہ ایک مجرم کو سزا دینے کی کوشش میں وہ خود اپنے آپ کو اللہ کی نظر میں زیادہ بڑا مجرم نہ بنالیں۔" (الرسالہ جولائی ۱۹۸۹ء ص ۱۸)

"اس سے معلوم ہوا کہ کوئی چیز ہے جو "قتل شاتم" سے بھی زیادہ قابل لحاظ ہے اور وہ اسلام کی دین رحمت کی تصویر ہے۔ اسلام کی دعوتی تصویر بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک شخص کے کھلے ہوئے سب و شتم اور اس کی شدید ایذا رسانی کے باوجود اسے قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو نظر انداز کر کے چھوڑ دیا جائے گا۔ اسلام میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز دعوتی مصلحت ہے۔ دعوتی مصلحت اسلام میں سپریم حیثیت کا درجہ رکھتی ہے۔ دعوتی مصلحت کی خاطر ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر دیا جائے گا خواہ وہ بجائے خود کتنی ہی سنگین نظر آتی ہو۔ مسلمانوں کے دلوں کا مجروح ہونا خدا اور رسول کی نظر میں اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ دعوتی مصلحت کا مجروح ہونا۔ اگر کسی معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہوں تو انھیں اپنے جذبات کو دبانا چاہیے، نہ کہ وہ جذبات کا بے جا اظہار کریں اور دعوت کے قیمتی مصالح کو برباد کر کے رکھ دیں۔" (الرسالہ جولائی ۱۹۸۹ء ص ۲۲)

"سلمان رشدی نے بلاشبہ توہین رسول اور اسلام دشمنی کا ثبوت دیا ہے۔ حقیقت واقعہ کے اعتبار سے وہ سخت سزا کا مستحق ہے۔ لیکن مسلمان اگر اس کے خلاف قاتلانہ کارروائی کریں تو ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ لوگ یہ کہیں کہ مسلمانوں نے ایک اسلام دشمن کو قتل کر دیا بلکہ لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ لوگ یہ کہنے لگیں گے کہ مسلمان آزادی فکر کے قاتل ہیں۔ اسلام کا اصل انحصار تلوار کی طاقت پر ہے نہ کہ دلیل کی طاقت پر۔ ہمیں اس حقیقت کو جاننا چاہیے

کہ موجودہ زمانہ آزادیٔ فکر کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں آزادیٔ فکر کو سب سے بڑی قدر کا درجہ دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں آزادی خیر اعلیٰ کی حیثیت رکھتی ہے، آج کا انسان کسی ایسے مذہب یا نظام کو غیر مہذب اور وحشیانہ سمجھتا ہے جو آزادیٔ فکر کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ ایسی حالت میں باعتبار نتیجہ سب سے بڑی اسلام دشمنی یہ ہوگی کہ کوئی ایسا عمل کیا جائے جو دنیا والوں کو یہ کہنے کا موقع دے کہ اسلام آزادیٔ فکر کا قاتل ہے اور اس لیے وہ ایک وحشیانہ مذہب ہے۔ اس معاملہ میں سنتِ رسول کا تقاضا یہ ہے کہ اسلام کو اس "بدنامی" سے بچایا جائے خواہ اس کی جو بھی قیمت دینی ہو، خواہ اس کے لیے کتنی ہی بڑی چیز کو برداشت کرنا پڑے"۔

(الرسالہ جولائی ۱۹۸۹ء ص ۲۳)

اجماعِ امت کے خلاف کسی کی رائے اور تحقیق معتبر نہیں:

جو مسلمان رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت اور سب وشتم کا ارتکاب کرے اس کا بدترین مرتد اور واجب القتل ہونا امت میں اس قدر متفقہ اور اجماعی مسئلہ ہے کہ کسی "مفکر" اور "داعی" کا اس کے بارے میں اختلاف کا اظہار قابلِ اعتبار نہیں ہے، اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں آپ زیر بحث مسئلہ میں ابن المنذرؒ، قاضی عیاضؒ، اسحاق بن راہویہؒ، خطابیؒ، محمد بن سحنونؒ، تقی الدین سبکیؒ، حافظ ابن تیمیہؒ، علامہ شامیؒ کے الفاظ میں اجماعِ امت کا دعویٰ سن چکے، ان بلند پایہ ائمہ، فقہاء، محدثین اور محققین کی جانب سے امتِ مسلمہ کا اجماع نقل کیے جانے کے بعد وحید الدین خاں صاحب کے اختلاف کی بے وزنی بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا تجتمع اُمتی علی الضلالۃ (میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی)۔ امتِ مسلمہ کو یہ شرف و اعزاز حاصل ہے کہ اس کا اجماع حق و صداقت کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔ قیامت تک یہ امت کسی بھی دور میں غلطی اور گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی۔ جس مسئلہ پر امتِ مسلمہ کا چودہ صدیوں تک اتفاق رہا ہو اس کا حق و صواب ہونا روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔

اسی کا ایک منطقی اور فطری نتیجہ ہے کہ وحید الدین خاں صاحب کے اختلاف کو غلطی اور گمراہی قرار دیا جائے۔ اس طرح کے اجماعی مسئلہ میں اگر کوئی بڑا فاضل و محقق بھی اختلاف کا اظہار کرتا تو اس کے اختلاف کو بھی پرکاہ سے زیادہ حیثیت حاصل نہ ہوتی۔ اس لیے امت کے اجماعی مسئلہ سے وحید الدین خاں صاحب کا اختلاف کسی اہمیت اور سنجیدہ نوٹس کے لائق نہیں ہے۔ لیکن اس دورِ فتن میں ایک طرف ہماری نوجوان نسل دین کے اصول اور بنیادی تصورات سے ناآشنا ہوتی جارہی ہے۔ دوسری طرف تشکیک زدہ نوجوانوں کے ایک طبقہ میں اجماع امت سے اختلاف ایک فیشن بن چکا ہے۔ تیسری طرف وحید الدین خاں صاحب کے مخصوص اسلوبِ تحریر اور طرزِ نگارش سے نوجوانوں کا ایک طبقہ ان سے مانوس اور متاثر ہے۔ اس طبقہ کا چونکہ اسلامیات کا براہ راست گہرا مطالعہ نہیں ہے اس لیے وہ وحید الدین خاں صاحب کے افکار و خیالات میں کھرے کھوٹے کی تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ ان سب اسباب کی بنا پر ضروری معلوم ہوا کہ شاتمِ رسول کی سزا کے بارے میں موصوف نے جو موقف اختیار کیا ہے اس کا علمی جائزہ لیا جائے اور ان کی دلائل نما تلبیسات کا پردہ چاک کیا جائے۔

شاتمِ رسول بدترین مرتد ہے:

سلمان رشدی کا کیس صریحی طور پر اہانتِ رسول اور شتمِ رسول کا کیس ہے۔ اجماع امت سے قطع نظر ہم قرآن و سنت کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس جرم کی سزا اسلام میں کیا ہے؟

کوئی بھی صاحبِ علم شخص اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت، استہزا اور سبّ و شتم کا ارتکاب اگر کسی مسلمان کی جانب سے ہو تو وہ مسلمان دائرۂ اسلام سے نکل جاتا ہے اور مرتد ہوجاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت اور استہزاء دراصل آپ کی رسالت سے انکار ہے۔

رسول کی رسالت پر عقیدہ رکھتے ہوئے کوئی شخص رسول کے ساتھ اہانت و استہزاء کا رویہ اختیار نہیں کرسکتا، اہانتِ رسول کے مرتکب کا دائرۂ اسلام سے خارج ہونا قرآن پاک سے ثابت ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

یحذر المنافقون أن تنزل علیھم سورة تنبئھم بما فی قلوبھم، قل استھزؤا ان اللہ مخرج ما تحذرون، ولئن سألتھم لیقولن انما کنا نخوض ونلعب قل أباللہ وآیاتہ ورسولہ کنتم تستھزؤن لا تعتذروا قد کفرتم بعد ایمانکم ان نعف عن طائفة منکم نعذب طائفة بأنھم کانوا مجرمین۔	منافق ڈرتے رہتے ہیں کہ ان (کے پیغمبر) پر کہیں کوئی ایسی سورت (نہ) اُتر آئے کہ ان کے دل کی باتوں کو ان (مسلمانوں) پر ظاہر کرئے، کہہ دو کہ ہنسی کیے جاؤ جس بات سے تم ڈرتے ہو خدا اس کو ضرور ظاہر کرئے گا، اور اگر تم ان سے (اس بارے میں) دریافت کرو تو کہیں گے کہ ہم تو یوں ہی بات چیت اور دل لگی کرتے تھے، کہو کیا تم خدا اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنسی کرتے تھے۔ بہانے مت بناؤ تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو چکے ہو، اگر ہم تم میں سے ایک جماعت کو معاف کردیں تو دوسری جماعت کو سزا بھی دیں گے چونکہ وہ گناہ کرتے رہے ہیں۔
(سورہ توبہ آیت ۶۴ تا ۶۶)	

یہ آیت اس مفہوم میں بالکل صریح ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس کی آیات اور رسول اکرمؐ کا استہزاء کفر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اہانت اور سب و شتم استہزاء سے زیادہ سنگین چیز ہے لہٰذا اس کا کفر ہونا زیادہ واضح ہے۔ قرآن پاک نے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو بے چون و چرا تسلیم کرنا بھی ایمان کی شرط قرار دیا ہے۔

فلا وربک لایؤمنون حتیٰ	تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ
یحکموک فیما شجر بینھم	جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں
ثم لا یجدوا فی انفسھم	منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم
حرجًا مما قضیت ویسلموا	کردو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ
تسلیما۔	ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں
(سورۂ نساء آیت ۶۵)	تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

حضرت عمر رضؓ نے اس شخص کا سر قلم کر دیا تھا جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تسلیم نہیں کیا اور دربارِ نبوت سے فیصلہ ہو جانے کے بعد اپنا مقدمہ حضرت عمر رضؓ کے پاس لایا۔

قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو تسلیم نہ کرنا کفر و نفاق قرار دیا گیا ہے۔

یہ بات عقل عام سے بھی معلوم ہو سکتی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت اور آپ کی شان میں گستاخی، سب و شتم آپ کا فیصلہ تسلیم نہ کرنے سے زیادہ سنگین اور بھیانک جرم ہے۔ لہٰذا اہانتِ رسول کی بنا پر انسان بدرجۂ اولیٰ دائرۂ اسلام سے نکل جائے گا اور مباح الدم قرار پائے گا۔

فقہاء اسلام کی تصریحات:

قرآن پاک کی آیات و احادیث کی بناء پر فقہاء اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت اور سبّ و شتم بدترین ارتداد ہے۔ فقہاء کی تصریحات ملاحظہ ہوں:

وقال ابو یوسف وایما رجل	امام ابو یوسفؒ نے فرمایا جس مسلمان
مسلم سب رسول اللہ	شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم أو	کو برا بھلا کہا یا جھٹلایا یا عیب لگایا

كذبه أو عابه أو تنقصه فقد كفر بالله تعالى وبانت امرأته.
(رد المحتار على الدر المختار ج ۳ ص ۳۱۹)

یا تنقیص کی اس نے کفر کیا، اس کی بیوی اس سے جدا ہو گئی۔

ومن سب الله أو رسوله كفر سواء كان جادًا أو مازحًا وكذلك من استهزأ بالله سبحانه وتعالى أو بآياته أو برسله أو كتبه لقوله تعالى: ولئن سألتهم ليقولن انما كنا نخوض ونلعب قل أبالله وآياته ورسوله كنتم تستهزؤن لا تعتذروا قد كفرتم بعد ايمانكم.

جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کو سب و شتم کیا وہ کافر ہو گیا، خواہ اس نے سنجیدگی سے ایسا کیا ہو یا مذاق میں کیا ہو۔ اسی طرح وہ شخص بھی کافر ہو گیا جس نے اللہ تعالیٰ کا یا اس کی آیات کا یا اس کے رسولوں یا کتابوں کا استہزاء کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولئن سألتهم ليقولن ..... الخ

(الشرح الكبير مع المغنى ج ۱۰ ص ۷۵، دار الكتاب العربی بیروت)

اسلام میں مرتد کی سزا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت اور سب و شتم کا کفر وارتداد ہونا متعدد آیات قرآنیہ سے ثابت ہے اور مرتد کا واجب القتل ہونا متعدد احادیث میں مذکور ہے:

عن عكرمة قال اتى علي بزنادقة فاحرقهم فبلغ ذالك ابن عباس فقال لو كنت انا لم احرقهم لنهي النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا تعذبوا بعذاب الله ولقتلتهم لقول رسول الله صلى الله عليه وسلم من بدل دينه

حضرت عکرمہؓ سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ کے پاس زنادقہ کو لایا گیا، حضرت علیؓ نے انھیں جلا دیا، حضرت ابن عباسؓ کو اس واقعہ کی خبر پہنچی تو انھوں نے فرمایا: اگر علیؓ کی جگہ میں ہوتا تو انھیں نہ جلاتا کیونکہ رسول اکرمؐ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: تم لوگ اللہ والا عذاب (آگ میں جلانا)

فاقتلوه۔	مردو۔ لیکن میں ان زندیقوں کو قتل کرتا کیونکہ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے: جو (مسلمان) اپنا دین تبدیل کرے اسے قتل کردو۔
{صحیح بخاری کتاب استتابۃ المعاندین والمرتدین باب حکم المرتد والمرتدۃ}	

عن عبد اللّٰہ بن مسعود رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لا یحل دم امرئ مسلم یشہد أن لا الٰہ إلا اللّٰہ وانی رسول اللّٰہ إلا باحدی ثلاث الثیب الزانی والنفس بالنفس والتارک لدینہ والمفارق للجماعۃ۔	حضرت عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی مسلمان شخص جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور میری رسالت کی گواہی دیتا ہو اس کا خون صرف تین باتوں میں سے کسی ایک بات کی وجہ سے مباح ہوتا ہے (۱) شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کیا ہو۔ (۲) کسی کو قتل کیا ہو۔ (۳) اپنے مذہب کو چھوڑ چکا ہو اور مسلمانوں سے الگ ہو گیا ہو۔
{صحیح بخاری کتاب الدیات باب قول اللّٰہ ان النفس بالنفس}	

مرتد کے سلسلے میں وارد شدہ صحیح آیات و احادیث کی بنا پر فقہاء اسلام مرتد کی سزائے قتل پر متفق ہیں خواہ یہ بات آزادیٔ فکر اور آزادیٔ مذہب کے فریب خوردہ افراد کو کتنی گراں گزرے۔ مشہور فقیہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

اجمع اھل العلم علی وجوب قتل المرتد وروی ذالک عن ابی بکر وعمر وعثمان وعلی ومعاذ وابی موسیٰ وابن عباس وخالد وغیرھم ولم ینکر ذالک فکان اجماعًا۔ (الشرح الکبیر ۱۰ ص ۷۵)	اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ مرتد کو قتل کرنا واجب ہے۔ یہ بات حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، معاذؓ ابو موسیٰؓ، ابن عباسؓ، خالدؓ وغیرہ (رضی اللہ عنہم) سے مروی ہے اور کسی نے اس پر نکیر نہیں کی اس لیے اجماع ہو گیا۔

شتمِ رسولؐ کی سزا صحابہؓ کرام کی نظر میں:

صحابۂ کرام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے براہ راست شاگرد تھے، اسلام کے سارے احکام ان کے سامنے نازل ہوئے۔ قرآنی آیات کے اسباب نزول اور ارشاداتِ نبویؐ کے پس منظر، احکام کے مدارج اور ناسخ و منسوخ سے ان سے زیادہ کون واقف ہو سکتا ہے، ان کا فہم دین حجت ہے۔ آئیے دیکھیں کہ قرآن و سنت کی روشنی میں ان حضرات نے شاتمِ رسول کی کیا سزا سمجھی۔

عن مجاھد قال: اتی عمرؓ برجل سب النبی (ص) فقتلہٗ ثم قال عمرؓ: من سبّ اللّٰہ أو سبّ احداً من الانبیاء فاقتلوہ۔	حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک ایسا شخص لایا گیا جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ کو سبّ و شتم کیا تھا حضرت عمرؓ نے اسے قتل کر دیا، پھر فرمایا: جس نے اللہ تعالیٰ کو یا کسی نبی کو برا بھلا کہا اسے قتل کر دو۔
(الصارم المسلول علی شاتم الرسول ص ۴۱۹، تصنیف شیخ الاسلام ابن تیمیہ دار الاشاعت قاہرہ۔)	

احادیث و آثار کی کتابیں ایسی روایات سے معمور ہیں جن میں صحابۂ کرامؓ اور تابعین عظام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت اور سبّ و شتم کی سزا قطعیت سے قتل بیان کی ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ کسی فرعی مسئلہ کے بارے میں صحابہ کرام کا اس سے زیادہ مکمل اجماع نہیں ملتا جیسا اجماع شاتمِ رسول کے قتل کے بارے میں ہے، خلفاء راشدین کے عہد میں کوئی ایسی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی کہ کسی شاتمِ رسولؐ کو کوئی مصلحت دعوت بیان کر کے معاف کر دیا گیا ہو۔

شاتمینِ رسولؐ کے بارے میں رسول اکرمؐ کا طرزِ عمل:

جہاں تک شاتمینِ رسول کے بارے میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل

کا مسئلہ ہے اسے ہم مختلف ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں زیادہ تر وہ سورتیں اور آیتیں نازل ہوئیں جو توحید، رسالت، آخرت، جنت، جہنم، ترغیب و ترہیب پر مشتمل تھیں، احکام کے بارے میں بہت کم آیات مکہ میں نازل ہوئیں اور احکام کی جو آیتیں مکی زندگی میں اتریں ان کا تعلق عبادات اور انفرادی اعمال سے تھا، حدود و قصاص وغیرہ کے احکام مکی دور میں نازل نہیں ہوئے، مکی زندگی میں مسلمانوں کو جہاد و قتال اور جوابی کارروائی سے سختی کے ساتھ روک دیا گیا تھا، مسلمانوں کی خواہش اور تقاضے کے باوجود انھیں کفار سے نبرد آزمائی اور دشمنان اسلام کی معاندانہ وظالمانہ کارروائیوں کا انتقام لینے کی اجازت نہیں تھی انھیں کفار کی جانب سے پیش آنے والی ہر تکلیف جھیلنے اور مکمل صبر و اعراض کی ہدایت تھی۔

مدینہ کی جانب ہجرت کرنے کے بعد تدریجاً اجتماعی احکام اور حدود و قصاص کا نزول ہوا، مسلمانوں کو کئی مرحلوں میں جہاد و قتال اور جوابی کارروائی کی اجازت دی گئی۔ ابتدا میں دفاعی جنگ کی اجازت دی گئی۔

اذن للذین یقاتلون بأنھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر۔ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق إلا أن یقولوا ربنا اللہ۔	جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے ان کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا (ان کی مدد کرے گا وہ) یقیناً ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے (انھوں نے کچھ قصور نہیں کیا) ہاں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار خدا ہے۔
(الحج: ۳۹، ۴۰)	

اس کے بعد اصلاحی اور اقدامی جنگ فرض کی گئی، مسلمانوں کو جہاد

وقتال کا حکم دیا گیا:

الم تر الی الذین قیل	بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں
لھم کفوا أیدیکم و أقیموا	دیکھا جن کو (پہلے یہ) حکم دیا گیا تھا
الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ	کہ اپنے ہاتھوں کو (جنگ سے) روکے
فلما کتب علیھم القتال	رہیں اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے
اذا فریق منھم یخشون	رہیں پھر جب ان پر جہاد فرض کیا
الناس کخشیۃ اللہ أو	گیا تو بعض لوگ ان میں سے لوگوں
أشد خشیۃ	سے یوں ڈرنے لگے جیسے خدا سے
(سورہ نساء آیت ۷۷)	ڈرا کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

مکی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرنے والے کفار تھے۔ اس وقت تک مسلمانوں کو یکطرفہ طور پر صبر و اعراض کا حکم تھا، اسلام کے تعزیراتی قوانین مکی دور میں نازل نہیں ہوئے تھے اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات مبارک کو سب و شتم کرنے والوں سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں خصوصاً مدنی زندگی کے آخری حصہ میں ایسی بکثرت مثالیں ملتی ہیں کہ شاتمین رسول کو قتل کرنے پر حضور اکرم نے بعض صحابۂ کرام کو مامور فرمایا، یا بعض صحابہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں لائے بغیر بعض شاتمین رسول کو قتل کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس اقدام پر نہ صرف یہ کہ باز پرس نہیں فرمائی بلکہ اس پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور اس اقدام قتل کو اللہ اور رسول کی نصرت قرار دیا۔ اس نوع کے کثیر واقعات میں سے چند واقعات درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک نابینا صحابی کی ایک ام ولد تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرتی تھی وہ نابینا صحابی اس حرکت سے اسے منع کرتے لیکن وہ نہیں مانتی۔ ایک رات کی بات ہے کہ وہ ام ولد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بدتمیزی کے کلمات کہنے لگی، نابینا صحابی نے چھوٹی تلوار لے کر اس کی نوک ام ولد کے پیٹ پر رکھ کر اسے زور سے دبایا جس سے وہ ام ولد مرگئی، صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ام ولد کے قتل ہونے کی خبر ہوئی آپؐ نے صبح لوگوں کو جمع کر کے قاتل کے بارے میں تفتیش شروع کی۔ وہی نابینا شخص لوگوں کو پھاندتے ہوئے آگے بڑھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو بیٹھ کر عرض کیا: میں اس ام ولد کا مالک ہوں، وہ آپؐ کو بُرا بھلا کہتی تھی اور آپ کی عیب جوئی کرتی تھی، میرے ڈانٹنے اور منع کرنے کے باوجود اس حرکت سے باز نہیں آتی تھی، اس کے بطن سے میرے دو خوب صورت (دو موتیوں کی طرح) بچے بھی ہیں، میرے ساتھ اس کا برتاؤ اچھا تھا۔ گزشتہ رات بھی وہ آپ کی شان میں گستاخی کرنے لگی تو میں نے چھوٹی تلوار سے اس کا پیٹ چاک کر کے اسے قتل کر دیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سن لو، گواہ رہو کہ اس ام ولد کا خون رائیگاں ہے۔"

(سنن نسائی کتاب المحاربۃ تحریم الدم باب الحکم فی من سب النبیؐ)

۲۔ کعب بن اشرف یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہجویہ اشعار کہتا، آپؐ کی شان میں گستاخی کرتا تھا، اس کی دریدہ دہنی اور یاوہ گوئی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت اذیت میں تھے۔ ایک بار آپ نے فرمایا، کون کعب بن اشرف کو ٹھکانے لگا سکتا ہے، اس نے اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچائی ہے؟ محمد بن مسلمہؓ نے عرض کیا: اے رسول اللہؐ! میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں، کیا آپ کی خواہش ہے کہ کعب بن اشرف کو قتل کر دیا جائے؟ آپ نے فرمایا: "ہاں"۔ اس کے بعد محمد بن مسلمہؓ نے کعب بن اشرف کو قتل کیا۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل حدیث کی مستند ترین کتابوں، بخاری، مسلم اور کتب سیرت میں موجود ہے۔

(صحیح بخاری کتاب المغازی باب قتل کعب بن الاشرف میں تفصیلی روایت ملاحظہ ہو)

۳۔ عصماء بنت مروان یزید بن زید بن حصن خطمی کی بیوی تھی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مذہب اسلام کی ہجو میں اشعار کہتی، غزوۂ بدر کے موقع پر عصماء بنت مروان

نے رسول اکرمؐ کی شان میں گستاخی کے چند اشعار کہے، ان اشعار کی بازگشت میدانِ بدر تک گئی۔ عمیر بن عدی خطمی نے قسم کھائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ واپس تشریف لانے پر میں اس عورت کو قتل کر دوں گا۔ رسول اکرمؐ کی مدینہ واپسی کے بعد رات کی تاریکی میں عمیر بن عدی خطمی نے عصماء بنت مروان کو قتل کر دیا اور رسول اکرمؐ کے پیچھے نماز فجر ادا کی۔ نماز کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمیر کو دیکھا اور فرمایا: کیا تم نے مروان کی لڑکی کو قتل کر دیا؟ انھوں نے جواب دیا، ہاں اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں۔ عمیر ڈرے کہ کہیں اس اقدام پر گرفت نہ ہو دریافت کیا، کیا اس اقدام قتل سے مجھ پر کچھ لازم ہوگا؟ آپ نے فرمایا، نہیں۔ پھر حضور اکرمؐ نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "اگر تم ایسے شخص کو دیکھنا چاہتے ہو جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نصرت کی ہے تو عمیر بن عدی کو دیکھو"۔

(الصارم المسلول لابن تیمیہ ص ۸۱، ۸۲)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ناموسِ رسالت کی حفاظت کے لیے کی جانے والی جد و جہد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں خدا اور رسولِ خدا کی نصرت ہے خواہ خود رو قسم کے داعی و مفکر اسے "شور و غل" اور "قومی سرکشی" کا نام دیں۔

۴۔ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان سپاہیوں کو حکم دے دیا تھا کہ جو لوگ جنگ اور مقابلہ کریں ان کے سوا کسی کو قتل نہ کریں، مگر چند افراد کے بارے میں فرمایا کہ اگر غلافِ کعبہ سے چمٹے ہوں تو بھی انھیں وہیں قتل کر دو، یہ چند مرد اور عورتیں جن کے بارے میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حال میں قتل کیے جانے کا حکم دیا تھا ان میں سے اکثر پر رسول اللہؐ کی ہجو اور آپ کو سبّ و شتم کرنے کی فردِ جرم عائد تھی۔

۵۔ ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ طائف سے فارغ ہو کر مدینہ واپس ہوئے تو بجیر بن زہیر بن ابی سلمی نے کعب بن زہیر کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر مکہ مکرمہ میں چند ایسے لوگوں کو

قتل کیا جو آپ کی ہجو کرتے تھے اور آپ کو اذیت پہنچاتے تھے اور قریش کے باقی ماندہ شعراء (عبداللہ بن الزعبری، ہبیرہ بن ابی ذہب مختلف علاقوں کی طرف فرار ہو گئے ہیں۔ (الصارم المسلول ص ۱۱۸)

ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کیا کرتی تھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں فرمایا: کون ہے جو میرے دشمن سے انتقام لے؟ حضرت خالد بن ولید نے اسے جا کر قتل کر دیا۔

(مصنف عبدالرزاق جلد ۵، ص ۳۰۷، المجلس العلمی)

حافظ ابن تیمیہ کا ارشاد

حافظ ابن تیمیہ نے عہد رسالت میں شتم رسول کے جرم میں قتل کیے جانے کے بکثرت واقعات ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

"اور ہم نے جو حدیثیں ذکر کی ہیں ان سے واضح ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرنے والے کو قتل کرنا واجب ہے، کیونکہ نبی اکرم نے متعدد بار سب و شتم کرنے والے کے قتل کا حکم دیا اور امر وجوب کا تقاضا کرتا ہے۔ نبی اکرم کو جس شخص کے بارے میں بھی سب و شتم کرنے کی خبر ملی اس کا خون آپ نے رائیگاں قرار دے دیا، صحابہ کرام نے بھی ایسا ہی کیا، حالانکہ آپ کو معاف کرنے کا بھی حق تھا، حضور اکرم کی وفات کے بعد کسی کو اختیار نہیں کہ شاتم رسول کو معاف کرے۔ اس لیے اب شاتم رسول کو قتل کرنا زیادہ لازم ہے، شاتم رسول کو قتل کرنا ایک قسم کا جہاد ہے، کفار و منافقین پر سختی کرنا، دین الٰہی کو غالب کرنا اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور ان چیزوں کا واجب ہونا معروف ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے شاتم رسول کو معاف کرنا اس صورت میں جائز تھا جب یہ حرکت ایسے شخص سے صادر ہو جو آپ کے قابو میں ہو، اسلام اور اطاعت کا اظہار کرتا ہو یا خود سپردگی کر کے حضور کی خدمت میں حاضر ہوا ہو، جو لوگ اہانت رسول کرنے کے بعد سرکشی اور اہانت پر

قائم تھے، حضور اکرمؐ نے ان میں سے کسی کو بھی معاف نہیں کیا۔"

(الصارم المسلول ص ۱۴۵)

شتمِ رسولؐ کی سزا کے بارے میں اسوۂ نبویؐ کا خلاصہ:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور سبّ و شتم کرنے والوں کے بارے میں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسا اوقات اقدامِ قتل کا حکم فرمایا اور صحابۂ کرام نے پوری جاں نثاری کے ساتھ اپنے کو خطرے میں ڈال کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل کیا۔ بعض دفعہ صحابۂ کرام نے حضور اکرمؐ کے علم میں لائے بغیر بعض شاتمین رسول کو جہنم رسید کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ملی تو نہ صرف یہ کہ اس پر سرزنش نہیں کی بلکہ ان کے اس اقدامِ قتل کو اللہ اور اس کے رسول کی نصرت قرار دیا۔ صحابۂ کرامؓ کے علم میں جب بھی کوئی ایسا واقعہ آتا کہ کسی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت اور آپ کی شان میں گستاخی کی ہے تو فوراً اسے قتل کرنا چاہتے۔ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کا واقعہ ہوتا تو آپ سے قتل کی اجازت چاہتے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی صحابۂ کرام کے اس رویہ پر ادنیٰ نکیر نہیں کی، یہ کبھی نہیں فرمایا کہ تم لوگ کیوں بھڑک اُٹھتے ہو؟ مجھے سبّ و شتم کرنا مستوجب قتل نہیں ہے بلکہ اگر صحابۂ کرام کو قتل کرنے سے روکتے تو روکنے کی کوئی اور وجہ بیان فرماتے مثلاً یہ کہ لوگوں میں مشہور ہوگا کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ شتم رسول کے واقعات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے معافی یا اعراض کے جو واقعات ملتے ہیں وہ یا تو مکی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ مسلمانوں کو یک طرفہ صبر و اعراض کا حکم تھا، یا اس کی صورت یہ ہوئی کہ شاتم رسول نے توبہ و استغفار کیا، تجدید ایمان کی اور معافی مانگی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ قبول کرکے اسے معاف کر دیا، یا پھر منافقین مدینہ کے ساتھ اعراض کے واقعات پیش آئے یہ لوگ اسلام کا اظہار

کرتے، تمام سرگرمیوں میں مسلمانوں کے ساتھ شریک رہتے، کبھی کبھی اپنی نجی محفلوں میں یا بعض کمزور مسلمانوں کے سامنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کے کلمات کہتے لیکن جب ان سے پوچھا جاتا کہ تم نے ایسی بات کہی ہے تو زور دار طریقہ پر اس کی تردید کرتے۔ سلمان رشدی کی طرح اہانت رسول کا اعلان و اظہار اور اس پر فخر نہیں کرتے تھے۔ اہل عرب انھیں مسلم سماج ہی کا جز سمجھتے تھے اس لیے رسول اللہ ان سے اعراض کرتے، قتل نہیں کراتے کہ لوگوں میں چرچا ہوگا کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کراتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی شان میں کی گئی گستاخی اور اہانت کے معاف کرنے کا حق تھا اس لیے آپ اگر معاف کرنے میں مصلحت سمجھتے تو معاف فرما دیتے۔

واقعۂ افک میں حضور اکرمؐ کا عمل:

بعض منافقین کے اہانت رسول کا کیس بالکل طشت از بام ہوگیا، ایک منافق نے برملا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی اور اہانت کا بیڑا اٹھایا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو اسے قتل کرنے کی ترغیب دی لیکن خود انصار مدینہ میں اس کی بنا پر جنگ کے حالات پیدا ہوگئے اس لیے حکم قتل پر عمل نہ ہوسکا۔ یہ صورت حال واقعۂ افک میں پیش آئی، مشہور منافق عبداللہ بن ابی بن سلول نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے اور اہانت کرنے کے لیے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان تراشی کی اور اس کا اس قدر پروپگنڈہ کیا کہ مدینہ کی پوری فضا اس الزام اور افترا سے گونجنے لگی، چند سادہ لوح صحابہ بھی اس پروپگنڈہ سے متاثر ہوگئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ کی پاکدامنی کا پورا یقین تھا، پھر بھی آپ نے احتیاطاً اپنے افراد خانہ اور حضرت عائشہؓ کے قریب ترین افراد سے ان کے بارے میں تفتیش کی، سب نے حضرت عائشہ کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا، پورا اطمینان کرلینے کے بعد نبی اکرمؐ مسجد نبوی میں تشریف لائے،

اور پھر کھڑے ہوکر مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے مسلمانو! کون ہے جو اس شخص سے میرا بدلہ لے جس نے میری بیوی کے بارے میں مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔ خدا کی قسم میں اپنی بیوی میں بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا، نیز جس شخص کا ذکر کرتے ہیں اس کے اندر بھی بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا، وہ میرے گھر میرے ساتھ ہی داخل ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطاب سُن کر بنی اشہل کے ایک فرد حضرت سعد بن معاذ نے کھڑے ہوکر عرض کیا، "یارسول اللہ! آپ کا بدلہ میں لوں گا۔ اگر وہ شخص قبیلۂ اوس کا ہے تو میں اس کی گردن اُڑا دوں گا، اور اگر قبیلۂ خزرج والے ہمارے بھائیوں میں سے ہے تو جس طرح آپ حکم فرمائیں اس کی تعمیل کی جائے گی۔" اس کے بعد خزرج والوں میں سے ایک شخص کھڑا ہوگیا، وہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہؓ تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وہ بڑے نیک آدمی تھے لیکن اس موقع پر پرانی حمیت نے ان کے اندر جوش مارا اور انھوں نے کہا: خدا کی قسم آپ غلط کہہ رہے ہیں، نہ آپ اسے قتل کریں گے نہ آپ اسے قتل کر سکتے ہیں۔ اگر وہ آپ کے قبیلہ کا ہوتا تو آپ اس کو قتل کرنا ہرگز پسند نہ کرتے۔ اس پر سعد بن عبادہ کے چچا زاد بھائی اسید بن حضیر کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے سعد بن عبادہ سے کہا: آپ غلط کہہ رہے ہیں، ہم اسے ضرور قتل کریں گے۔ معلوم ہوگیا کہ آپ بھی منافق ہیں اسی لیے تو منافقوں کا دفاع کر رہے ہیں۔ اس پر قبیلۂ اوس و خزرج کے لوگ ایک دوسرے کے مقابل تن گئے اور خطرہ پیدا ہوگیا کہ کہیں آپس میں دست و گریباں ہوجائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر موجود تھے۔ آپ نے بمشکل دونوں گروہوں کو خاموش کیا۔ (صحیح بخاری کتاب المغازی باب الافک)

واقعۂ افک کی پوری تفصیل صحیح بخاری اور دوسری کتب حدیث میں موجود ہے۔ ان روایات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول کی بارگاہ نبوت میں شدید اور مسلسل ایذا رسانی کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ اسے قتل کر دیا

جائے لیکن اس موقع پر اوس و خزرج کی قدیم حمیت جاگ اٹھی اور باہم جنگ و جدال کا خطرہ پیدا ہوگیا اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی۔

شاتم رسول کی سزائے قتل کے بارے میں اوپر قرآن و سنت اجماع امت، آثار صحابہ اور اقوال ائمہ سے جو دلائل پیش کیے گئے ان کا مطالعہ کرنے کے بعد جناب وحیدالدین خاں صاحب کے اس قسم کے دعووں کی رکاکت اور بے وزنی قارئین پر واضح ہو چکی ہوگی "رسول اللہ کی شان میں گستاخی بجائے خود مستوجب قتل جرم نہیں ہے" "جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھ گستاخی علی الاطلاق طور پر مستوجب قتل جرم ہے وہ ایک ایسی بات کہتے ہیں جس کے لیے ان کے پاس قرآن و سنت کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے"۔

اس لیے ان بے دلیل دعاوی پر از سر نو بحث کر کے ہم صفحات نہیں سیاہ کرنا چاہتے ہاں وحیدالدین خاں صاحب نے دلائل کے نام سے تلبیسات کا جو انبار لگایا ہے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

وحیدالدین خاں صاحب کے دلائل کا جائزہ:

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے سلمان رشدی کے کیس کا حکم شرعی بیان کرنے کے لیے "اسوۂ نبوت" کے عنوان سے ایک مضمون الرسالہ جولائی ۱۹۸۹ء میں شائع کیا، اس کا ایک تمہیدی پیراگراف یہ ہے:

"سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں جو کچھ کہا ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں نہ صرف پچھلے ہزار سال سے کسی نہ کسی شکل میں کہی جارہی ہیں بلکہ یہ خود اس زمانے میں بھی کہی گئی تھیں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں موجود تھے۔ اس وقت آپ نے ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا، اس کو معلوم کر کے ہم یہ طے کر سکتے ہیں کہ اسی قسم کے موجودہ واقعہ میں ہم کیا طرز عمل اختیار کریں۔ اس معاملہ میں کسی اجتہاد یا قیاس کی ضرورت نہیں، کیونکہ پیغمبر اسلام کا اسوہ (نمونہ) واضح طور پر

ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہے۔" (ص ۱۰۶)

اس کے بعد موصوف نے "چند مثالیں" کے عنوان سے عہد رسالت کے چند واقعات پیش کیے ہیں، جن میں ان کے بہ قول رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہانتِ رسول کرنے والوں کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا۔

اسوۂ نبویؐ کا حوالہ:

اس سلسلے میں ہماری پہلی تنقید یہ ہے کہ وحید الدین خاں صاحب کو اگر اسوۂ نبوت کی روشنی میں دیانت داری سے اہانتِ رسول کرنے والوں کا حکم دریافت کرنا تھا تو انھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں شتمِ رسول کے واقعات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل دیکھنا چاہیے تھا۔ موصوف نے کوشش کر کے سیرت نبویؐ سے انھیں واقعات کو جمع کرنا چاہا ہے جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عفو و درگزر سے کام لیا ہے۔ حالانکہ حیات نبوی میں ایسے واقعات بھی بہ کثرت پیش آئے جن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے شاتمینِ رسولؐ کو قتل کیا گیا یا صحابہ کرام نے اہانتِ رسول کرنے والوں کو قتل کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ نے نہ صرف یہ کہ اس پر نکیر نہیں فرمائی بلکہ تعریفی کلمات کہے۔ حیاتِ نبوی خصوصاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی دور میں شاتمینِ رسول کے قتل کیے جانے کے بکثرت واقعات موجود ہیں۔ حدیث اور سیرت کی مشہور کتابوں میں اس طرح کے واقعات بکھرے ہوئے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "الصارم المسلول علی شاتم الرسول" میں اس طرح کے واقعات کو یکجا کر دیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ کی یہ کتاب شتمِ رسول کے موضوع پر سب سے اہم تصنیف مانی جاتی ہے، علوم اسلامیہ پر نظر رکھنے والا شاید ہی کوئی فرد اس کتاب سے ناواقف ہو۔ جناب وحید الدین خاں صاحب کو اگر شتمِ رسول کے موضوع پر قلم اٹھانا ہی تھا تو انھیں اس کتاب کا مطالعہ

ضرور کر لینا چاہیے تھا تاکہ موضوع کے تمام گوشوں پر ان کی نظر رہتی اور شتم رسولؐ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا اسوہ ان کے پیش نظر رہتا۔ اگر وحید الدین خاں صاحب اس کتاب سے ناواقف ہیں تو ان کی جرأت کی داد دینی چاہیے کہ :

"لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

ایسی صورت میں انھیں اس موضوع پر قلم نہیں اٹھانا چاہیے تھا بلکہ مزید مطالعہ اور تحقیق میں وقت گزارنا چاہیے تھا اور اگر حافظ ابن تیمیہؒ کی مذکورہ بالا کتاب ان کے پیش نظر ہے تو پھر شتم رسول کے سلسلہ میں اسوۂ رسول پیش کرتے وقت صرف انھیں واقعات کا تذکرہ کرنا جن میں رسول اکرمؐ نے عفو و درگزر سے کام لیا تھا، کھلی ہوئی تلبیس ہے۔ اوپر کے صفحات میں بطور نمونہ چند ایسے واقعات پیش کیے گئے ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے شاتمین رسول کو قتل کیا گیا، یا آپؐ نے اہانت رسول کرنے والوں کے قتل پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ جن حضرات کو شتم رسول کے موضوع پر مکمل مطالعہ کرنا ہو وہ حافظ ابن تیمیہؒ کی مذکورہ بالا کتاب کی طرف رجوع کریں۔

واقعۂ افک کا حوالہ :

جناب وحید الدین خاں صاحب نے اسوۂ نبوت کے عنوان سے جو واقعات نقل کیے ہیں انھیں میں سے ایک واقعۂ افک بھی ہے۔ اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد موصوف لکھتے ہیں :

> "مگر اس وقت بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہؐ ان تمام لوگوں کے قتل کا حکم دے دیں جو کردار کشی کی جھوٹی مہم میں ملوث تھے کچھ صحابہ نے ایسے افراد کو قتل کرنے کی پیش کش کی مگر آپؐ نے اس پیش کش کو قبول نہیں فرمایا۔ امہات المؤمنین کے کردار کشی کے ان مجرمین کو زندہ چھوڑ دیا گیا، یہاں تک کہ وہ مدینہ میں اپنی طبعی موت مرے۔"

(الرسالہ جولائی ۱۹۸۹ء ص ۱۴)

وحید الدین خاں صاحب کا یہ اقتباس واقعۂ افک سے ان کی بے خبری کو بتاتا ہے اگر انھوں نے حدیث کی مستند ترین کتاب صحیح بخاری ہی میں واقعۂ افک کا مطالعہ کر لیا ہوتا تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ رسول اللہؐ نے واقعۂ افک کے موقع پر مسجد نبوی کے منبر پر مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: من یعذرنی من رجل بلغنی أذاہ فی اھلی الخ "کون ہے جو اس شخص سے میرا بدلہ لے جس نے میری بیوی کے بارے میں مجھے تکلیف پہونچائی خدا کی قسم میں اپنی بیوی میں بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا" رسول اکرمؐ کے اس خطاب کو سن کر حضرت سعد ابن معاذؓ نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ آپ کا بدلہ میں لوں گا، اگر وہ شخص قبیلۂ اوس کا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا، اور اگر قبیلۂ خزرج سے اس کا تعلق ہے تو بھی آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ حضرت سعد بن معاذ یا حضرت اسید ابن حضیرؓ نے حضرت عائشہؓ پر بہتان تراشی کرنے والے کو قتل کرنے کی جو پیش کش کی وہ حضورؐ ہی کی ترغیب پر تھی، اور حضورؐ نے ان کی اس پیش کش کو مسترد بھی نہیں کیا، لیکن چونکہ افترا پردازی کرنے والوں کا تعلق قبیلۂ خزرج سے تھا اس لیے خزرج کے بعض لوگوں نے خصوصًا حضرت سعد ابن عبادہؓ نے غلط فہمی کی بنیاد پر یہ سمجھا کہ چونکہ افترا پردازی کرنیوالوں کا تعلق قبیلۂ خزرج سے ہے اسی لیے قبیلۂ اوس والے بڑھ بڑھ کر انھیں قتل کرنے کی پیش کش کر رہے ہیں۔ اس غلط فہمی کی بنیاد پر مسجد نبوی میں رسول اللہ کی موجودگی میں اوس و خزرج میں تناؤ پیدا ہو گیا اور باہمی جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی اور اپنے حجرہ میں تشریف لے گئے۔ افترا پردازی کرنے والوں کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ بالا خطاب حدیث اور سیرت کی تقریبًا تمام کتابوں میں مذکور ہے لیکن وحید الدین خاں صاحب ان تمام چیزوں سے آنکھیں بند کر کے لکھ رہے ہیں: "کچھ صحابہ نے ایسے افراد کو قتل کرنے کی پیش کش کی مگر آپؐ نے اس پیش کش کو قبول نہیں فرمایا"

"الرسالہ" کے جون ۱۹۸۶ء کے شمارہ میں واقعۂ افک کا تذکرہ کرتے ہوئے

لکھتے ہیں:

"عبداللہ بن ابی کے اس مجرمانہ فعل کو دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کو قتل کر دوں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا نہیں۔ اگر میں ایسا کروں تو لوگ چرچا کریں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔"

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے اس سلسلہ میں کوئی حوالہ پیش نہیں کیا۔ اگر حوالہ پیش کرتے تو اس کا جائزہ لیا جاتا۔ مسجد نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب کے تیور سے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی خواہش تھی کہ واقعۂ افک کے اصلی مجرم کو قتل کر دیا جائے۔

ہماری معلومات کی حد تک حضرت عمرؓ کی مذکورہ بالا پیش کش کا تعلق واقعۂ افک سے نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے واقعہ سے ہے جس میں غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی میں مہاجرین و انصار کے درمیان ایک جھڑپ کے بعد عبداللہ ابن ابی نے اپنے قبیلہ والوں کے سامنے اشتعال انگیز تقریر کی۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے مذکورہ بالا پیش کش کی جسے وحیدالدین خاں صاحب نے واقعۂ افک سے جوڑ دیا۔

مغالطہ انگیزیاں:

شتمِ رسول کے سلسلہ میں اسوۂ رسول پیش کرتے ہوئے وحیدالدین خاں صاحب نے جن واقعات کا حوالہ دیا ہے ان میں سے اکثر کا تعلق مکی زندگی سے ہے۔ اہلِ علم بخوبی جانتے ہیں کہ مکی زندگی میں رسول اللہؐ کو اور مسلمانوں کو کفار کی طرف سے دی جانے والی اذیتوں کو یک طرفہ طور پر جھیلنے کی ہدایت تھی، مکمل صبر و اعراض کا حکم تھا۔ کفار کے خلاف کسی جوابی کارروائی یا جنگ و قتال کی اجازت نہیں تھی۔ جن لوگوں نے قرآن پاک ہی کا مطالعہ کیا ہو انھیں بھی مکی دور کی اس صورتِ حال کا علم ہوگا۔ اس لیے مکی دور میں پیش آنے والے واقعات کو شتمِ رسول

کے سلسلہ میں حکم شرعی دریافت کرنے کے لیے پیش کرنا درست نہیں ہے، اجتماعی عملی احکام خصوصاً حدود و قصاص اور تعزیرات کا نزول مدنی دور میں ہوا بلکہ ابن حزم کی تحقیق تو یہ ہے کہ مرتدین کو قتل کرنے کا حکم غزوۂ خیبر ۷ھ کے بعد نازل ہوا، اس لیے اس کا کوئی جواز نہیں ہے کہ محض کی زندگی کے واقعات کو بنیاد بنا کر شتم رسول کے مسئلہ پر کوئی فیصلہ کیا جائے، جہاں تک قرآن پاک میں شتم رسول کی سزائے قتل کا صراحتاً مذکور نہ ہونے کا مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں ہم وحیدالدین خاں صاحب سے پوچھ سکتے ہیں کہ کیا کسی حکم کے حکم شرعی ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ صراحتاً قرآن میں اس کا ذکر ہو؟ اگر حکم شرعی ہونے کے لیے قرآن میں صراحتاً مذکور ہونا شرط نہیں ہے تو پھر موصوف کی اس دلیل میں کیا وزن رہ جاتا ہے: "مجرد استہزاء کی بنا پر قرآن میں نہ غیر مسلموں کے لیے قتل کی قانونی سزا کا حکم دیا گیا اور نہ منافق مسلمانوں کے لیے" اور اگر حکم شرعی ہونے کے لیے قرآن میں صراحتاً مذکور ہونا شرط ہے تو پھر موصوف کو ان ہزاروں شرعی احکام کا انکار کرنا پڑے گا جن کا صراحتاً قرآن میں ذکر نہیں ہے۔ کیا وحیدالدین خاں صاحب سنت، اجماع امت اور قیاس کے حجت شرعی ہونے کا اور ان کے ذریعہ ثابت شدہ احکام کا انکار کرنے کی جسارت کریں گے؟

ایک اور استدلال کا جائزہ:

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے بطور دلیل سیرت نبوی سے کچھ ایسے واقعات کا بھی ذکر کیا ہے جن میں رسول اکرمؐ نے شاتمین رسول کی توبہ قبول کرلی اور انھیں معاف کر کے بیعت کرلی۔ ان واقعات سے صرف اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق تھا کہ شاتمین رسول کو معاف فرما کر انھیں بیعت کرلیں، اس سے کسی کو انکار نہیں۔ رسول اللہؐ کو شاتمین رسول کی توبہ قبول کرنے کا اختیار ہونا امت میں متفق علیہ ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے بڑی گہری بات لکھی ہے کہ حیات نبویؐ میں شتم رسول پر سزا جاری کرنا یا معاف کردینا نبی اکرمؐ کا حق تھا۔ اسی لیے جب کوئی

شخص رسول اکرمؐ کی شان میں گستاخی کرتا تو اسے مستحق قتل سمجھ کر صحابۂ کرامؓ رسول اکرمؐ سے قتل کرنے کی اجازت چاہتے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی قتل کرنے کا حکم فرماتے اور کبھی درگزر کا معاملہ فرماتے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد شتم رسول کا کیس خالص حق اللہ ہے۔ اسے معاف کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے، ہاں اگر شاتم رسول توبہ کرے اور تجدید ایمان کرے تو اس کی توبہ قابل قبول ہو گی یا نہ ہو گی۔ اس سلسلہ میں فقہاء اسلام میں دو رائیں ہیں، اگر ہم اسی رائے کو اختیار کریں جس میں شاتمین رسول کی توبہ قابل قبول قرار دی گئی ہے تو بھی سلمان رشدی کے کیس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ یہ ملعون اب تک اپنے اس جرم پر قائم ہے اور شیطانی آیات کی اشاعت اس کی مرضی سے برابر جاری ہے۔

مصلحتِ دعوت کا فلسفہ :

جناب وحید الدین خاں صاحب نے اپنی تحریروں میں اہانت رسول کے سلسلہ میں دو الگ الگ باتیں لکھی ہیں۔ کہیں تو وہ یہ لکھتے ہیں کہ محض اہانت رسول مستوجب قتل جرم نہیں ہے، اس پہلو کا جائزہ تفصیل سے اوپر آچکا ہے، اور کہیں کہیں ان کی تحریروں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شتم رسول کی سزا اگرچہ قتل ہے لیکن موجودہ حالات میں سلمان رشدی کو واجب القتل کہنے یا قتل کرنے سے چونکہ عالمی پیمانہ پر اسلام کی تصویر بگاڑے جانے کا خطرہ ہے۔ دشمنان اسلام جن کے ہاتھ میں پریس کی طاقت ہے وہ یہ پروپیگنڈہ کریں گے کہ اسلام آزادیٔ فکر کا دشمن اور ایک خونخوار مذہب ہے، اس لیے دعوتِ اسلامی کی مصلحت یہ ہے کہ سلمان رشدی کے خلاف کوئی ہنگامہ نہ کیا جائے، اسے قتل نہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں وحید الدین خاں صاحب نے مصلحت دعوت کے عنوان سے ایک پورا فلسفہ کھڑا کیا ہے، اور ان کا یہ ذہنی فلسفہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے دوسرے افکار و خیالات پر اثر انداز ہے، اس لیے مصلحتِ دعوت کا جائزہ لینا از حد ضروری ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ :

"کسی کارخانہ کی خوشنامی اس کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح اسلام کی اشاعت کے لیے اس کی دعوتی تصویر بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اسلام میں یہ بات آخری حد تک مطلوب ہے کہ اسلام کی دعوتی تصویر کو بگاڑنے سے بچایا جائے۔ اسلام کی دعوتی تصویر کی حفاظت ہر دوسری چیز پر مقدم ہے، حتیٰ کہ توہین رسالت اور اہانت اسلام جیسے مواقع پر بھی"

(الرسالہ جولائی ۱۹۸۹ء ص ۱۸)

چند صفحات کے بعد مزید لکھتے ہیں:

"اسلام میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز دعوتی مصلحت ہے، دعوتی مصلحت اسلام میں سپریم حیثیت کا درجہ رکھتی ہے۔ دعوتی مصلحت کی خاطر ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر دیا جائے گا خواہ وہ بظاہر کتنی ہی سنگین نظر آتی ہو"

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"سلمان رشدی نے بلاشبہ توہین رسول اور اسلام دشمنی کا ثبوت دیا ہے۔ حقیقت واقعہ کے اعتبار سے وہ سخت سزا کا مستحق ہے لیکن مسلمان اگر اس کے خلاف قاتلانہ کارروائی کریں گے تو ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ لوگ یہ کہیں کہ مسلمانوں نے ایک اسلام دشمن کو قتل کر دیا، بلکہ لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ لوگ یہ کہنے لگیں گے کہ مسلمان آزادیٔ فکر کے قاتل ہیں، اسلام کا اصل انحصار تلوار کی طاقت پر ہے نہ کہ دلیل کی طاقت پر۔ ہمیں اس حقیقت کو جاننا چاہیے کہ موجودہ زمانہ آزادیٔ فکر کا زمانہ ہے، موجودہ زمانہ میں آزادیٔ فکر کو سب سے بڑی قدر کا درجہ دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں آزادیٔ فکر خیر اعلیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج کا انسان کسی ایسے مذہب یا نظام کو غیر مہذب اور وحشیانہ سمجھتا ہے جو آزادیٔ فکر کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ ایسی حالت میں باعتبار نتیجہ سب سے بڑی اسلام دشمنی یہ ہوگی کہ کوئی ایسا

داخل کیا جائے جو دنیا والوں کو یہ کہنے کا موقع دے کہ اسلام آزادیٔ فکر کا
قائل ہے اور اس لیے وہ ایک وحشیانہ مذہب ہے۔ اس معاملہ میں سنتِ رسول
کا تقاضہ یہ ہے کہ اسلام کو اس بدنامی سے بچایا جائے خواہ اس کی جو بھی
قیمت دینی ہو۔ خواہ اس کے لیے کتنی ہی بڑی چیز برداشت کرنی پڑے "
(الرسالہ جولائی ۱۹۸۹ء ص ۲۳)

وحیدالدین خان صاحب نے مصلحت دعوت کے خوشنما لیبل سے جس تحریف کا دروازہ کھولنا چاہا ہے اسے اگر برداشت کر لیا جائے تو پورا دین اس تحریف کی زد میں آجائے گا۔ شاتم رسول کی سزا اگر قتل نہیں ہے تو موصوف نے بلاضرورت مصلحتِ دعوت کا شوشہ چھوڑا ہے، اور اگر موصوف اس بات سے متفق ہیں کہ شاتم رسول کی سزا اصلاً قتل ہے تو انھوں نے سلمان رشدی کے خلاف مسلمانوں کے ردعمل کو غلط قرار دینے کے لیے جس دلیل کا سہارا لیا ہے وہ بہت ہلاکت آفریں ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وحیدالدین خان صاحب کے نزدیک مسلمان کوئی ایسی بات نہ کہیں اور نہ کوئی ایسا کام کریں (خواہ وہ بات اور کام دینی نقطۂ نظر سے کتنا ضروری ہو) جسے بہانہ بنا کر غیر مسلم پریس اسلام کی تصویر بگاڑ سکتا ہو۔ یعنی اسلام کی تصویر سنوارنے اور بگاڑنے کے ذہنی مفروضے کو بنیاد بنا کر موصوف دینی احکام میں کتربیونت کو نہ صرف جائز سمجھتے ہیں بلکہ ضروری سمجھتے ہیں۔ وحیدالدین خان صاحب کے اس نئے فلسفہ کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان فقہاء اور مصنفین دورِ حاضر میں یہ لکھنا اور بتانا بند کر دیں کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے، کیونکہ اس سے دشمنانِ اسلام کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ اسلام آزادیٔ فکر اور آزادیٔ مذہب کا دشمن ہے، اور اسلام خونخوار مذہب ہے، اس طرح اسلام کی تصویر بگڑتی ہے۔ اسی طرح اسلام میں حدود اور تعزیرات کے جو احکام ہیں وہ بھی موصوف کے ذہنی مفروضے کی بنا پر اسلام کی تصویر بگاڑنے کا سبب ہیں، اسلام مخالف ذرائع ابلاغ اور پریس کو مسلم ممالک میں اسلامی سزائیں (قصاص میں قتل کرنا، زنا میں سنگسار کرنا، اور شراب نوشی میں کوڑے لگانا

وغیرہ) جاری کیے جانے سے یہ موقع ہاتھ آتا ہے کہ وہ اسلام کو وحشی اور خونخوار مذہب کی شکل میں پیش کریں، اس طرح اسلام کی دعوتی تصویر بگڑتی ہے، لہٰذا اسلامی سزاؤں کا نفاذ بند ہونا چاہیے، اور اسلامی کتابوں سے حدود و تعزیرات کا باب خارج کیا جانا چاہیے۔ غالباً وحیدالدین خاں صاحب نے مصلحتِ دعوت ہی کو پیش نظر رکھ کر اسلامی جہاد کی تعبیر بدل دی ہے۔ انھوں نے بار بار یہ بات لکھی ہے کہ اسلام میں محض دفاعی جہاد کی گنجائش ہے، یعنی دشمنانِ اسلام کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ ہونے کی صورت میں جہاد کیا جا سکتا ہے۔ اقدامی جہاد موصوف کے نزدیک جائز نہیں ہے اس لیے کہ تصورِ جہاد کو لے کر اسلام دشمن مصنفین نے اسلام کی تصویر بگاڑی اسے خونخوار اور خوں ریز مذہب کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اس لیے موصوف نے ضروری سمجھا کہ مصلحتِ دعوت کے پیش نظر جہاد کی تشریح ہی تبدیل کر دی جائے۔ ہمیں تو یہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد وحیدالدین خاں صاحب مصلحتِ دعوت سے مجبور ہو کر مسلمانانِ عالم کو مشورہ نہ دینے لگیں کہ قرآن سے جہاد و قتال اور حدود و قصاص کی آیتیں حذف کر کے قرآن کا کوئی ایسا ایڈیشن تیار کیا جائے جو اسلام کی صرف "خوشنما" تصویر غیر مسلموں کے سامنے پیش کرے، کیونکہ جہاد و قتال کی آیتیں دیکھ کر غیر مسلم بھڑک اٹھتے ہیں اور اسلامی دعوت سے قریب نہیں آپاتے۔

میں نے یہاں وحیدالدین خاں صاحب کے فلسفۂ مصلحتِ دعوت کے چند تقاضوں کی طرف اشارہ کیا ہے ورنہ اگر یہ سلسلہ دراز کیا جائے تو شاید پورا مذہب اسلام اس کی زد میں آجائے، اور یہ مصلحتِ دعوت اس دین ہی کو لے ڈوبے، جس کی دعوت کا بے پناہ جذبہ وحیدالدین خاں صاحب ظاہر کرتے ہیں۔

آزادیٔ فکر کا لیبل:

ملعون سلمان رشدی نے "شیطانی آیات" میں ابو الانبیاء حضرت ابراہیمؑ

خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور امہات المومنین حضرت عائشہؓ وغیرہ کے بارے میں جو ہرزہ سرائی، گستاخی کی ہے اسے آزادیٔ فکر کا نام دینا عقلی دیوالیہ پن کا ثبوت مہیا کرنا ہے۔ آزادیٔ فکر کا کیا یہی مطلب ہے کہ ہر شخص کو دوسرے پر افترا پردازی، بہتان تراشی اور سب و شتم کرنے کی کھلی چھوٹ ہو، ہر انسان جس کے بارے میں چاہے دریدہ دہنی اور سوقیانہ پن کا مظاہرہ کرسکتا ہو۔ اگر آزادیٔ فکر کا یہی مطلب ہے اور آزادیٔ فکر خیر اعلیٰ ہے تو خود برطانیہ (جو "آزادیٔ فکر" کا جنم داتا اور محافظ ہے) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین قابلِ سزا جرم کیوں ہے؟ سلمان رشدی کے خلاف برپا ہونے والی جدوجہد پر آزادیٔ فکر کی دہائی دے کر قدغن لگانا خود آزادیٔ فکر کی توہین ہے۔ اس طرح کی بے مہار اور جارحانہ آزادیٔ فکر مغربی فکر و فلسفہ میں مقدس ہو تو ہو لیکن نہ عقل عام سے اس کا جواز نکلتا ہے نہ الٰہی قوانین سے۔ آخر اس کی کہاں سے گنجائش نکال لی گئی ہے کہ مغربی افکار و تصورات کی عینک لگا کر ہم اسلامی عقائد و احکام کا مطالعہ کریں اور مغربی عینک سے دیکھنے پر اسلامی تعلیمات کے جو اجزا ہم کو بدنما اور نامناسب نظر آئیں انھیں اسلام سے حذف کرنے کی کوشش کریں اور اس کے لیے تاویل اور وکالت کی پوری صلاحیتیں صرف کردیں۔ اسلام کے اس قانون کو ہم ہضم نہ کرسکیں کہ ارتداد کی سزا قتل ہے، کیونکہ یہ قانون یورپ کے تصورِ آزادیٔ مذہب سے متصادم نظر آتا ہے اور ریاست سے بغاوت کے جرم میں سزائے قتل فوراً ہماری سمجھ میں آجائے، کیونکہ مغربی فکر و فلسفہ میں اس پر تنقید نہیں کی گئی۔ مغربی افکار و تصورات کی غلامی سے آزاد ہو کر کھلے ذہن کے ساتھ ذرا ہم یہ غور کریں کہ خالص عقلی اور منطقی اعتبار سے جرم بغاوت اور جرم ارتداد میں سے کون زیادہ سنگین ہے، جرم بغاوت اگر بندوں سے بغاوت کا نام ہے تو ارتداد خالقِ کائنات سے بغاوت کا نام ہے، پھر آخر ہمارا ذہن جرم بغاوت میں سزائے قتل پر مطمئن اور جرم ارتداد میں سزائے قتل سے غیر مطمئن کیوں ہے؟

اسلام دینِ کامل ہے

اسلام خداوند تعالیٰ کا نازل کیا ہوا آخری دین ہے۔ اسلام نے تمام سابق ادیان و مذاہب کو منسوخ کر دیا اور قیامت تک کے لیے اسلام ہی دین ہدایت قرار پایا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد تنہا اسلام ہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول اور ذریعۂ نجات ہے۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا	اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین
فلن یقبل منه وھو فی	کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول
الآخرۃ من الخاسرین۔	نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت
(آل عمران ۸۵)	میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا۔

اسلامی تعلیمات زندگی کے تمام گوشوں کو حاوی ہیں اور اسلام اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا دینِ کامل ہے۔

الیوم اکملت لکم دینکم	آج ہم نے تمھارے لیے تمھارا دین
واتممت علیکم نعمتی و	کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری
رضیت لکم الاسلام دینا۔	کر دیں اور تمھارے لیے اسلام کو
(سورۂ مائدہ ۳)	دین پسند کیا۔

اسلام کے دوسرے آسمانی مذاہب کے مقابلہ میں زیادہ کامل ہونا خود اس کے آخری اور دائمی مذہب ہونے سے آشکارا ہے۔ گو کہ مفسرین نے الیوم اکملت

نظم دینکم کے تحت اسلام کی کاملیت کو روشن کیا ہے لیکن جناب وحیدالدین خاں صاحب کو اس بدیہی حقیقت سے بھی اختلاف ہے۔ چنانچہ انھوں نے پوری صفائی کے ساتھ لکھ دیا:

"خدا کے تمام رسول ایک ہی دین لے کر آئے۔ ان میں سے کوئی رسول نہ دوسرے رسولوں سے افضل تھا، اور نہ ان میں سے کسی کا دین دوسروں کے دین کے مقابلہ میں زیادہ کامل۔"

(الرسالہ مارچ ۱۹۸۴ء ص ۳۸)

جناب وحیدالدین خاں صاحب ایک کانفرنس کی روداد میں لکھتے ہیں:

"اسلامی نقطۂ نظر سے اگر اس کانفرنس کا خلاصہ کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ بیشتر مذاہب کے نمائندوں نے یہ کہا کہ مذہب کا مقصد شخصیت کی تعمیر کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کے نمائندوں نے تقریباً متفقہ طور پر اسلام کی امتیازی صفت یہ بیان کی کہ اسلام صرف فرد کا دین نہیں، وہ پورے اجتماعی نظام میں مکمل انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں۔ کیونکہ میرے نزدیک اسلام کا اصل نشانہ فرد ہے نہ کہ اجتماع۔ اجتماعی تغیر اس کا بالواسطہ جزء ہے نہ کہ براہ راست۔ تاہم میں نے اس سے اعراض کیا کہ کانفرنس میں دیگر مذاہب کے نمائندوں کے سامنے مسلمانوں سے اختلافی بحث کرنے لگوں۔ البتہ الگ سے ان کے سامنے اپنا نقطۂ نظر رکھنے کی کوشش کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کی مذکورہ تعبیر درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی شخصیت کی تعمیر ہی خود اسلام کا مقصد بھی ہے۔ جس طرح وہ دوسرے مذاہب کا مقصد بتایا جاتا ہے۔ اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان جو فرق ہے وہ کامل اور ناقص کا نہیں بلکہ مستند اور غیر مستند کا ہے۔ اسلام دین خداوندی کا محفوظ اور مستند ایڈیشن ہے جب کہ دوسرے مذاہب دین خداوندی کا بگڑا ہوا ایڈیشن۔ اصل مقصد کے اعتبار سے اسلام اور دوسرے مذاہب میں کوئی فرق نہیں ہے۔" (الرسالہ مارچ ۱۹۸۶ء ص ۴۰)

وحید الدین خاں صاحب نے اپنی تفسیر "تذکیر القرآن" میں الیوم اکملت لکم دینکم کے تحت بھی اسلام کے دین کامل ہونے کے نظریہ کی تردید کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں :

"آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا"۔ یعنی تم کو جو احکام دیے جانے تھے وہ سب دے دیے گئے۔ تمہارے لیے جو کچھ بھیجنا مقدر کیا گیا وہ سب بھیجا جا چکا۔ یہاں علی الاطلاق دین کے کامل کیے جانے کا ذکر نہیں بلکہ امت محمدی پر جو قرآن نازل ہونا شروع ہوا تھا اس کے پورا ہونے کا اعلان تھا۔ یہ نزول کی تکمیل کا ذکر ہے نہ کہ دین کی تکمیل کا، اس لیے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ آج میں نے دین کو کامل کر دیا بلکہ یہ فرمایا: "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر دیا"۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کا دین ہر زمانہ میں اپنی کامل صورت میں انسان کو دیا گیا ہے۔ خدا نے کبھی ناقص دین انسان کے پاس نہیں بھیجا۔"

(تذکیر القرآن جلد اول ص ۲۴۲)

اوپر ذکر کردہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحید الدین خاں صاحب کے ذہن میں یہ خلش ہے کہ اگر اسلام کو دین کامل قرار دیا جائے گا تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ دوسرے آسمانی مذاہب ناقص تھے، حالانکہ ہمارے مفسرین نے اس خلش کا خوب ازالہ کیا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں :

"اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اکمال دین آج ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کا دین ناقص تھا، بلکہ جیسا تفسیر محیط میں بحوالہ قفال مروزی رحمۃ اللہ علیہ ۔ ۔ ۔ نقل کیا ہے کہ دین تو ہر نبی و رسول کا اس زمانہ کے اعتبار سے کامل و مکمل تھا، یعنی جس زمانہ میں جس پیغمبر کو کوئی شریعت و دین اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا اس زمانہ اور اس قوم کے لحاظ سے وہی کامل و مکمل تھا، لیکن اللہ جل شانہ کے علم میں یہ تفصیل پہلے سے تھی کہ جو دین اس زمانہ اور اس قوم کے لیے مکمل ہے وہ اگلے زمانہ اور آنے والی قوموں کے

لیے مکمل نہ ہوگا بلکہ اس کو منسوخ کر کے دوسرا دین و شریعت نافذ کی جائے گی، بخلاف شریعت اسلام کے جو سب سے آخر میں نازل کی گئی کہ وہ ہر جہت اور ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہے، نہ وہ کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ کسی خاص خطہ، قوم یا ملک کے ساتھ۔ بلکہ قیامت تک ہر زمانہ، ہر خطہ اور ہر قوم کے لیے یہ شریعت کامل و مکمل ہے۔"

(معارف القرآن جلد ۳ ص ۴۰)

اسلام کی صرف یہی خصوصیت نہیں ہے کہ "اسلام دینِ خداوندی کا محفوظ اور مستند ایڈیشن ہے" بلکہ اسلام کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لے کر قیامت تک کے لیے اسلام واحد ذریعہ نجات و فلاح ہے، اسلام کے علاوہ کوئی دوسری آسمانی شریعت اگر اصلی حالت میں موجود ہوتی تو بھی اسلامی شریعت ہی کی پیروی ضروری ہوتی، کسی دوسرے دین و شریعت کی اتباع اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ قبول نہ ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لو کان موسیٰ حیا ما وسعہ	اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو میری پیروی کے علاوہ
الا اتباعی۔	ان کے لیے بھی چارۂ کار نہ ہوتا یعنی ان کے لیے
(مسند احمد بن حنبل مسند جابر)	بھی میری پیروی ضروری ہوتی۔

ظاہر بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اگر زندہ ہوتے تو ان کے پاس شریعتِ موسوی کا "محفوظ و مستند ایڈیشن" ہی ہوتا، اس کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کے لیے میری پیروی لازم ہوتی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سابق آسمانی شریعتیں اگر اصلی حالت میں موجود ہوتیں تو بھی ان پر عمل کرنے کی گنجائش نہ ہوتی، بلکہ اسلامی شریعت ہی کی پیروی ضروری ہوگی۔ دین کا محفوظ و مستند ایڈیشن ہونے کے علاوہ یہ اسلام کی عظیم خصوصیت ہے جو اسلام کے دینِ اکمل ہونے کو آشکارا کرتی ہے۔

صلح حدیبیہ اور بیعت الرضوان۔ ایک جائزہ

وحید الدین خاں صاحب کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف واقعاتِ سیرت میں سے تنہا صلح حدیبیہ کو بنیاد بنا کر موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے لائحہ عمل طے کرتے ہیں اور سیرتِ نبوی کے دوسرے اہم واقعات کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں واقعاتِ سیرت کے بارے میں ان کا مطالعہ سطحی اور سرسری ہے بسا اوقات موصوف واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں تاکہ اپنے من پسند نتائج نکال سکیں۔

بیعت الرضوان وحید الدین خاں کی نظر میں:

جنوری ۱۹۸۹ء کے الرسالہ میں وحید الدین خاں صاحب نے "بیعت الرضوان" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون کے جستہ جستہ اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

> "بیعت الرضوان (۶ھ) اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے جو حدیبیہ کے ضمن میں پیش آیا۔ یہ سفر اصلاً عمرہ کرنے کے لیے ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا۔ اس وقت قریش سے آپ کی صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔ اس دوران آپ نے حضرت عثمان بن عفانؓ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا تاکہ وہ اہل مکہ کو بتائیں کہ آپ مکہ میں صرف عبادت کے لیے داخل ہونا چاہتے ہیں نہ کہ جنگ اور ٹکراؤ کے لیے۔ قریش اس بات پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے حضرت عثمانؓ کو اپنے

یہاں روک لیا۔ جب آپ کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مشہور ہو گیا کہ قریش نے حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا۔ یہ خبر بے حد غیر معمولی تھی، چنانچہ اس کو سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چودہ سو اصحاب کو جمع کیا اور ان سے بیعت لی۔ اس بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے۔

یہ بیعت کس بات پر تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ کچھ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت پر بیعت لی۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ جو خود اس بیعت میں شریک تھے، انھوں نے تردید کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے موت پر بیعت نہیں لی، بلکہ اس بات پر بیعت لی کہ ہم بھاگیں گے نہیں ....

حدیبیہ کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل امن پسندی کا مظاہرہ کیا۔ فریق ثانی کی اشتعال انگیزی کے باوجود آپ مشتعل نہیں ہوئے، ٹکراؤ کے ہر موقع سے یک طرفہ طور پر اعراض کرتے رہے، اپنی جماعت کے سب سے زیادہ نرم مزاج آدمی کو اس سفارت کے ساتھ بھیجا کہ ہم صلح کرنے کے لیے تیار ہیں، پھر جب قتل کی خبر ملی اس وقت بھی آپ نے ایسا نہیں کیا کہ خبر ملتے ہی قریش کے اوپر ٹوٹ پڑیں، بلکہ اپنے مقام پر ٹھہر کر لوگوں سے صرف اس بات کی بیعت لی کہ ہم یہیں جمے رہیں گے۔ قریش اگر خود سے لڑنے آتے ہیں تو مقابلہ کریں گے اور اگر وہ صلح پر راضی ہوتے ہیں تو صلح کر لیں گے، خواہ یہ صلح یک طرفہ شرطوں پر کیوں نہ ہو، جیسا کہ آپ نے عملاً کیا۔ بیعت الرضوان کے باوجود صلح کر لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بیعت اصلاً جنگ کے لیے نہ تھی۔ اگر وہ جنگ کے لیے ہوتی تو ناممکن تھا کہ اس کے بعد آپ اپنے دشمن سے یک طرفہ شرطوں پر صلح کر لیں ....

بیعت الرضوان کا پیغام یہ ہے کہ تمھارے لیے اگر انتخاب (CHOICE) فرار اور جنگ کے درمیان ہو تو فرار کو چھوڑ کر جنگ کا

طریقہ اختیار کرو اور اگر تمہارے لیے انتخاب (CHOICE) صلح اور جنگ کے درمیان ہو تو جنگ کو چھوڑ کر صلح کا طریقہ اختیار کرو۔ خواہ یہ صلح فریقِ ثانی کی یک طرفہ شرائط پر ہی کیوں نہ ہو۔ مزید یہ کہ فرار کے مقابلہ میں عدم فرار کو اختیار کرنے کا حکم بھی مشروط حکم ہے نہ کہ مطلق حکم۔ کیونکہ حدیبیہ (سنہ ۶ھ) میں آپ نے فرار کے مقابلہ میں عدمِ فرار کا فیصلہ فرمایا۔ مگر اس سے پہلے مکہ (سنہ ۱۳ھ) میں اس طرح کی صورت حال میں آپؐ نے وہاں سے ہجرت فرمائی۔" (الرسالہ جنوری ۱۹۸۹ء ص ۴-۵)

صلح حدیبیہ کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے لائحہ عمل:

جناب وحید الدین خاں صاحب کی تحریروں کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ انھوں نے عصر حاضر میں مسلمانوں کے لیے جو طریقۂ زندگی پسند کیا ہے اور جس کے وہ زبردست داعی ہیں یہ طریقۂ زندگی مکمل طور سے صلح حدیبیہ کے واقعہ سے ماخوذ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں بے شمار واقعات و غزوات پیش آئے۔ بدر و احد کے معرکے اور خیبر و حنین کے غزوات یہ سب بھی سیرت نبویؐ کے اہم واقعات ہیں لیکن وحید الدین خاں صاحب کی نظر میں مسلمانوں کے لیے ہر دور میں قابلِ تقلید اور مثالی واقعہ صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے۔ صلح حدیبیہ ہی کو بنیاد بنا کر موصوف نے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے رشتہ اصلاً کسی اور بنیاد کے بجائے دعوت کی بنیاد پر ہے۔ یعنی مسلمان داعی ہے اور دوسری اقوام مدعو۔ اس لیے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ مدعو اقوام سے تعلقات خوش گوار رکھیں اور معتدل حالات پیدا کرنے کے لیے اپنے مادی حقوق اور نزاعات سے یک طرفہ طور پر دست بردار ہو جائیں، نیز غیر مسلموں سے صلح کرلیں۔ خواہ یہ صلح مکمل طور پر غیر مسلموں کی شرائط کو تسلیم کرکے ہو، جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر کیا۔

کیا سیرتِ نبویؐ صرف صلح حدیبیہ کا نام ہے؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و تعلیمات تنہا صلح حدیبیہ سے عبارت نہیں ہیں، سیرتِ نبویؐ کے تمام غزوات و سرایا اور کتاب و سنّت کی تمام تعلیمات کو نظر انداز کر کے تنہا صلح حدیبیہ کی بنیاد پر مسلمانوں کا طریقۂ زندگی طے کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ مختلف غزوات کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم فریق کے ساتھ جو معاملات کیے ان کے مخصوص اسباب تھے اور مختلف غزوات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مختلف طرزِ عمل مسلمانوں کے لیے ہدایت و رہنمائی کا بڑا سرچشمہ ہے۔ لیکن کسی خاص غزوہ اور خاص حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کو مسلمانوں کے لیے تمام حالات میں لازم کرنا سیرتِ نبویؐ سے ناواقفیت کی بات ہے۔ غیر مسلم سلطنتوں سے صلح و جنگ کے بارے میں کتاب و سنّت نے مسلمانوں پر ہر حال میں کوئی ایک حکم لازم نہیں کیا ہے بلکہ چند اصولی تعلیمات دے کر مسلم حکمرانوں کو اختیار دیا ہے کہ وہ وقت و مصلحت اور عسکری صورت حال نیز دوسرے حالات کا جائزہ لے کر جو مناسب ہو فیصلہ کریں۔ مختلف غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مختلف طرزِ عمل خود اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس بارے میں اسلام نے کوئی ایک دائمی حکم نہیں دیا ہے جس میں کوئی لچک نہ ہو، غزوۂ بدر میں اقدام مسلمانوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ انھیں کی طرف سے اہلِ مکہ کے تجارتی قافلہ پر حملہ کے لیے فوج نکلتی ہے، غزوۂ احد میں دفاعی جنگ لڑی جاتی ہے، غزوۂ خندق میں حالات کے دباؤ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تک سوچنے لگتے ہیں کہ مدینہ میں کھجوروں کی جو پیداوار ہوتی ہے اس کا ایک حصہ دے کر بعض قبائل سے صلح کر لیں، صلح حدیبیہ کے موقع پر بظاہر دب کر اور کفار کی شرطیں مان کر صلح کر لی جاتی ہے، فتح مکہ کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ سے نکلنے سے پہلے ابوسفیان یہ پیش کش لے کر آتے ہیں کہ صلح باقی رکھی جائے اور

اسے مزید بڑھادیا جائے۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اس پیش کش پر کوئی دھیان نہیں دیتے۔ اس کے بعد حنین کا معرکہ خالص اقدامی ہے۔ غرضیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوات کے موقع پر جو فیصلے فرمائے اور غیر مسلموں کے ساتھ جو معاملات اور معاہدات کیے ان میں امت کے لیے ہدایت کا سامان ضرور موجود ہے، لیکن کسی خاص غزوہ میں اختیار کیے ہوئے آپ کے طرزِ عمل کو تمام حالات میں مسلمانوں کے لیے لازم قرار دینا کوتاہ نظری اور اسلامی تعلیمات کی روح سے بیگانگی کی بات ہے۔ جناب وحیدالدین خاں صاحب نے بار بار یہ بات دُہرائی ہے کہ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ اگر صلح وجنگ کے درمیان اختیار کرنے کا معاملہ ہو تو صلح کو اختیار کرنا لازمی ہے۔ یہ تعلیم انھوں نے سیرت نبوی کے تمام غزوات سے آنکھیں بند کرکے محض صلح حدیبیہ کو اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے دیکھ کر اخذ کی ہے۔ ورنہ سیرتِ نبویؐ کا مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ عہدِ نبوی کے بیشتر غزوات اقدامی تھے دفاعی نہیں تھے، فتح مکہ سے پہلے ابوسفیان صلح کی پیش کش لے کر آتے ہیں اور صلح کرنے کے لیے پورا زور صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مسترد فرما دیا۔

ان واقعات سے روزِ روشن کی طرح واضح ہوتا ہے کہ صلح ہر حال میں اور ہر قیمت پر مطلوب نہیں ہے۔ اور جہاد صرف دفاعی نہیں ہوتا بلکہ اقدامی بھی ہوتا ہے، ان حقائق کے باوجود وحیدالدین خاں صاحب صرف دفاعی جہاد کو جائز اور صلح کو ہر قیمت پر لازم قرار دیتے ہیں۔ ان کا مذکورہ بالا نظریہ اوپر کے اقتباسات میں آچکا ہے علاوہ ازیں انھوں نے فروری ۱۹۹۰ء کے 'الرسالہ' میں اور زیادہ صاف انداز میں اپنے اسی نظریہ کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

> "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ معلوم تاریخ میں پہلی بار آپ نے جنگ اور صلح کا صحیح انسانی اصول مقرر کیا اور اس پر خود عمل فرمایا۔ آپ نے جارحانہ جنگ کو مطلق طور پر ممنوع قرار دیا۔ آپ نے بتایا کہ جنگ صرف اس وقت کی جائے جب کہ دفاعی طور پر جنگ

لڑنے کی ضرورت پیش آجائے یعنی اپنی طرف سے کبھی جنگ میں پہل نہ کی جائے،
البتہ اگر دوسرا فریق جارحیت کردے تو اس سے بچاؤ کے لیے لڑا جاسکتا
ہے۔ دوسرا ضروری اصول آپ نے یہ مقرر کیا کہ جنگ کے مقابلہ میں امن
ہر حال میں بہتر اور مطلوب چیز ہے۔ اس لیے جنگ پیش آجانے کی صورت
میں بھی مسلسل امن کی تلاش جاری رکھی جائے اور اگر فریق ثانی صلح پر آمادہ
ہو تو فوراً جنگ کو ختم کر کے اس سے صلح کر لی جائے، خواہ یہ صلح خود فریق ثانی
کی یک طرفہ شرط پر کیوں نہ ہو"

(الرسالہ فروری ۱۹۹۰ء، ص ۲۸)

فقہاء کرام کی فہم و بصیرت:

اللہ تعالیٰ ہمارے فقہاء کرام کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ ان حضرات نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات اور سیرت کے تمام واقعات کو مد نظر
رکھ کر احکام مستنبط کیے، تمام فقہی کتابوں میں باب السیر کے نام سے ایک مفصل
باب ہوتا ہے جس میں صلح و جنگ اور غیر مسلم حکومتوں سے تعلقات کے بارے میں
اسلامی احکام درج ہوتے ہیں۔ فقہاء کے یہاں پوری تفصیل ملتی ہے کہ مسلمانوں
کے لیے کن حالات میں جنگ واجب یا جائز ہے اور کن حالات میں صلح ضروری یا
جائز ہے۔ فقہاء کرام نے اس سلسلے کے اصولی احکام مستنبط کرنے میں آیات
و احادیث کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی اور جنگوں میں
آپ کے طرز عمل سے بھرپور رہنمائی حاصل کی ہے۔ اگر مسلمان عسکری اعتبار
سے بہت کمزور ہوں یا مسلسل جنگوں کی وجہ سے انھیں کچھ آرام کرنے اور
تیاری کرنے کے لیے وقفہ صلح کی ضرورت ہو تو صلح کرنا نہ صرف جائز بلکہ
بعض حالات میں لازم ہوجاتا ہے، لیکن تمام حالات میں صلح ہی کو اسلام کی تعلیم
قرار دینا اسلامی تعلیمات اور سیرت نبوی سے بے خبری کی غمازی کرتا ہے۔

صلح حدیبیہ کے واقعات کی غلط تصویر کشی:

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے صلح حدیبیہ اور بیعت الرضوان کی جو تصویر کھینچی ہے، اس میں موصوف کے خیالات اور من پسند نظریات کا عکس بہت صاف جھلکتا ہے۔ انھوں نے اس واقعہ کے مختلف اجزار کو دانستہ یا نادانستہ طور پر خلاف واقعہ پیش کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ پہونچنے کے بعد کفارِ قریش کے سامنے بار بار جو پیش کش رکھی وہ وحیدالدین خاں صاحب کی بنائی ہوئی تصویر کو بگاڑ دیتی ہے۔ آپؐ کی پیش کش کا حاصل یہ تھا کہ اہل مکہ یا تو ہم سے تا جنگ معاہدہ کریں یا پھر ہم ان سے آخر دم تک جہاد و قتال کریں گے۔ وحیدالدین خاں صاحب کے نقطۂ نظر سے ہونا یہ چاہیے تھا کہ جب کفار مکہ نے اس بات پر اصرار کیا کہ ہم محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کو مکہ میں آکر عمرہ نہیں کرنے دیں گے تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی کشمکش برپا کیے بغیر مدینہ واپس تشریف لے آتے۔ لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ آپ اس بات پر مُصر رہے کہ اہل مکہ یا تو صلح کرلیں یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔

وحیدالدین خاں صاحب صلح حدیبیہ کے بارے میں اپنے تیار کردہ خاکہ میں رنگ بھرنے کے لیے لکھتے ہیں:

> "حدیبیہ کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل امن پسندی کا مظاہرہ کیا۔ فریق ثانی کی اشتعال انگیزی کے باوجود آپ مشتعل نہیں ہوئے۔ ٹکراؤ کے ہر موقع سے یک طرفہ طور پر اعراض کرتے رہے، اپنی جماعت کے سب سے زیادہ نرم مزاج آدمی کو اس سفارت کے ساتھ بھیجا کہ ہم صلح کرنے کے لیے تیار ہیں۔"
>
> (الرسالہ جنوری ۱۹۸۹ء، ص ۴)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفارت

کے لیے حضرت عثمانؓ ابن عفان کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ آپؓ مسلمانوں میں سب سے زیادہ نرم مزاج تھے۔ لیکن جن لوگوں نے سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاً سفارت کے لیے حضرت عمرؓ کو منتخب فرمایا تھا، جو جماعت صحابہؓ میں کفار کے ساتھ سخت رویہ اپنانے میں معروف تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ایک معقول عذر پیش کیا اور اس کام کے لیے اپنے بجائے حضرت عثمانؓ کا نام پیش کیا۔ معروف سیرت نگار ابن ہشام نے یہ واقعہ اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ نے احادیث اور سیرت کی کتابوں سے اس واقعہ کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "آپؐ نے حضرت عمرؓ کو پیام دے کر اہلِ مکہ کے پاس بھیجنے کا ارادہ فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے معذرت کی، اور عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کو معلوم ہے کہ اہلِ مکہ مجھ سے کس قدر برہم ہیں اور کس درجہ میرے دشمن ہیں۔ مکہ میں میرے قبیلہ کا کوئی شخص نہیں جو مجھے بچا سکے۔ اگر آپ حضرت عثمانؓ کو بھیجیں جن کی مکہ میں قرابتیں ہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ آپؐ نے اس رائے کو پسند فرمایا، اور حضرت عثمانؓ کو بلا کر یہ حکم دیا کہ ابوسفیان اور رؤسائے مکہ کو ہمارا پیغام پہونچا دو۔"
>
> (سیرت المصطفیٰ جلد دوم، ص ۳۵۵)

بیعتِ رضوان کا مقصد:

جب حضرت عثمانؓ کی واپسی میں تاخیر ہوئی اور یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک پہنچی کہ اہلِ مکہ نے حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا، تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا نبرح حتی نناجز القوم	جب تک ہم ان سے بدلہ نہ لے لیں گے
(سیرت ابن ہشام، واقعہ بیعت رضوان)	یہاں سے حرکت نہ کریں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں موجود تمام صحابہؓ سے جہاد و موت کی بیعت لی۔ بیعت رضوان کے واقعہ میں جو صحابہ شریک تھے ان کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خونِ عثمانؓ کا انتقام لینے اور جہاد و موت کے لیے یہ بیعت لی تھی۔ لیکن حضرت جابر ابن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کی بیعت نہیں لی، بلکہ اس بات کی بیعت لی کہ ہم فرار اختیار نہ کریں۔

وحیدالدین خاں صاحب کو حضرت جابر ابن عبداللہؓ کی روایت مفیدِ مطلب معلوم ہوئی، لہٰذا انھوں نے تمام صحابہ کے بیان کو چھوڑ کر حضرت جابر بن عبداللہؓ ہی کے بیان کو درست سمجھا اور اسی کو اپنے خاص اسلوب میں ڈھالتے ہوئے لکھا کہ:

> "پھر جب قتل کی خبر ملی اس وقت بھی آپؐ نے ایسا نہیں کیا کہ خبر ملتے ہی قریش کے اوپر کود پڑیں بلکہ اپنے مقام پر ٹھہر کر لوگوں سے صرف اس بات کی بیعت لی کہ ہم یہیں جمے رہیں گے۔ قریش اگر خود سے لڑنے کے لیے آتے ہیں تو مقابلہ کریں گے اور اگر وہ صلح پر راضی ہوتے ہیں تو صلح کر لیں گے، خواہ یہ صلح یک طرفہ شرطوں پر کیوں نہ ہو، جیسا کہ آپؐ نے عملاً کیا۔ بیعت الرضوان کے باوجود صلح کر لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بیعت اصلاً جنگ کے لیے نہ تھی۔ اگر جنگ کے لیے ہوتی تو نا ممکن تھا کہ اس کے بعد آپؐ اپنے دشمن سے یک طرفہ شرطوں پر صلح کر لیں۔"
>
> (الرسالہ جنوری ۱۹۸۹ء ص ۴، ۵)

حدیث اور سیرت کی مستند کتابوں میں جن لوگوں نے صلح حدیبیہ کا واقعہ پڑھا ہے انھیں معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کے قتل کی خبر پا کر ہی صحابۂ کرامؓ کو بیعت کیا اور صراحۃً اس بات کا اظہار فرمایا کہ جب تک ہم خونِ عثمانؓ کا انتقام نہیں لیں گے یہاں سے واپس نہیں جائیں گے۔ کتب حدیث و سیرت میں بیعت رضوان کا پورا واقعہ پڑھنے سے یہ حقیقت دو دو چار کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیعت جنگ و جہاد اور خونِ عثمانؓ

کا انتقام لینے کے لیے لی۔ خواہ آپؐ نے بیعت کے لیے جو بھی تعبیر اختیار کی ہو۔

بیعت رضوان کی مختلف روایات دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے صحابۂ کرامؓ سے ایک ہی طرح کے الفاظ کہلا کر بیعت نہیں لی بلکہ بیعت کے مختلف الفاظ حدیث وسیرت کی کتابوں میں مروی ہیں۔ امام مسلم نے صحیح مسلم (کتاب الجہاد والسیر باب استحباب مبایعۃ الامام) میں اس سلسلے کی مختلف روایات جمع کردی ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیرت المصطفیٰ جلد دوم ص ۲۵۵۔۲۵۱۔

جہاں تک وحید الدین خاں صاحب کے اس استدلال کا تعلق ہے کہ (بیعت الرضوان کے باوجود صلح کرلینا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بیعت اصلاً جنگ کے لیے نہ تھی، اگر وہ جنگ کے لیے ہوتی تو ناممکن تھا کہ اس کے بعد آپؐ اپنے دشمن سے یک طرفہ شرطوں پر صلح کرلیں)۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنگ و قتال کے لیے صحابہؓ سے بیعت لینا خونِ عثمانؓ کا انتقام لینے کے لیے تھا جیسا کہ روایات سے واضح ہے۔ اس لیے جب بعد میں اس خبر کا غلط ہونا معلوم ہوا اور حضرت عثمانؓ صحیح سلامت واپس آگئے تو جنگ کا محرک بھی ختم ہوگیا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں صلح کرلینے سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ آپؐ نے وہ بیعت جنگ وجہاد کے واسطے نہیں لی تھی۔ بیعت الرضوان کی روایات میں بیعت کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد اس طرح کا جملہ بھی آتا ہے:

ثم أتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الذی ذکر من أمر عثمان باطل۔ (سیرت ابن ہشام)	پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ عثمان ابن عفان کے بارے میں جو بات ذکر کی گئی تھی وہ باطل ہے۔

اس طرح کے الفاظ سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتلِ عثمانؓ کی خبر پاکر خونِ عثمانؓ کا انتقام لینے کے لیے جہاد وقتال کی بیعت لی تھی، اور چونکہ حضرت عثمانؓ کے قتل کیے جانے کی خبر غلط ثابت

ہوئی اس لیے جہاد و قتال کی ضرورت نہیں پڑی ۔

غور و فکر کے چند اور پہلو :

صلح حدیبیہ کے واقعہ پر ہمیں ایک اور پہلو سے بھی نظر ڈالنی چاہیے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کا جو عمل کیا اس کی بنیاد وحی پر تھی یا اپنی رائے اور صحابۂ کرامؓ کے مشورہ سے آپؐ نے صلح کی۔ دوسرا قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کا واقعہ کیا کوئی عام انداز کا واقعہ تھا یا غیبی انتظامات کے زیر اثر اللہ تعالیٰ کے مخصوص نظام کے تحت اس کا وجود ہوا۔ جب ہم سیرت وحدیث کی روایات کی روشنی میں اس واقعہ کو پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیبیہ کی صلح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد یا صحابہ کے مشورہ سے عمل میں نہیں آئی بلکہ حکم الٰہی کی بنا پر اس کا انعقاد ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر مواقع پر جنگی کاروائیاں صحابۂ کرامؓ کے مشورہ کے بعد کیا کرتے تھے، اور بہت سے مواقع پر اپنی رائے کو چھوڑ کر صحابۂ کرامؓ کی رائے کو اختیار کر لیتے تھے۔ لیکن جس معاملہ میں آپؐ کے پاس وحی آجاتی تھی اس میں کسی سے مشورہ نہیں کرتے تھے۔

غزوۂ خندق کا واقعہ :

غزوۂ خندق کا وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے لیے سب سے سخت گزرا ہے۔ عرب کے قبائل مسلمانوں کے خلاف اُمڈ آئے تھے اور اہلِ مدینہ کو اپنی حفاظت کے لیے تاریخِ عرب میں پہلی بار خندق کا سہارا لینا پڑا تھا۔ اس وقت مسلمان جن شدید حالات سے دوچار تھے ان کی تصویر کشی قرآن کی ان آیات میں بڑی بلاغت کے ساتھ کی گئی ہے :

إِذْ جَاءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ   جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے

ومن اسفل منکم واذ زاغت	کی طرف سے تم پر چڑھ آئے، اور
الأبصار وبلغت القلوب الحناجر	جب آنکھیں پھر گئیں اور دل (مارے
وتظنون بالله الظنونا ھنالك	دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے اور تم
ابتلی المؤمنون وزلزلوا زلزالاً	خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے
شدیداً۔	لگے وہاں مومن آزمائے گئے اور سخت
(احزاب آیت ۱۱-۱۰)	طور پر ہلائے گئے۔

غزوۂ خندق کے موقع پر جب مسلمان ان شدید تر حالات سے دوچار تھے اور ضعف ولاچاری آخری حد کو پہونچی ہوئی تھی اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر شفقت ورحمت کی بنا پر یہ چاہا کہ بعض قبائل سے مدینہ کے نخلستان کی پیداوار کے ایک حصہ پر صلح کرلیں، تاکہ محاصرہ کی شدت میں کمی آئے اور بعض قبائل کے چلے جانے سے دشمنانِ اسلام کی ہمتیں پست ہوں لیکن یہ صلح جو حالات کے زبردست دباؤ کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرنا چاہتے تھے، صحابۂ کرامؓ نے اس سے اختلاف کیا اور صلح نامہ کے حروف مٹا دیئے۔ ابن ہشام نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب میں یہ واقعہ تفصیل سے درج کیا ہے۔ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کتب احادیث وسیر کی روشنی میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"محاصرہ کی شدت اور سختی سے رسول اللہ کو یہ خیال ہوا کہ مسلمان بمقتضائے بشریت کہیں گھبرا نہ جائیں۔ اس لیے یہ قصد فرمایا کہ عیینہ ابن حصن اور حارث ابن عوف سے جو قبائل غطفان کے قائد اور سردار تھے مدینہ کے نخلستان کے تہائی پھل دے کر ان سے صلح کرلی جائے تاکہ یہ لوگ ابوسفیان کی مدد سے کنارہ کش ہوجائیں اور مسلمانوں کو اس حصار سے نجات ملے۔ چنانچہ آپؐ نے سعدؓ ابن معاذ اور سعد ابن عبادہؓ سے اپنا یہ خیال ظاہر فرمایا۔ ان دونوں نے کہا یا رسول اللہ! کیا اللہ نے آپ کو ایسا حکم دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہم اس کی تعمیل کے لیے حاضر ہیں، یا آپ محض

ازراہ شفقت و رأفت ہمارے خیال سے ایسا قصد فرما رہے ہیں. آپؐ نے فرمایا اللہ کا کوئی حکم نہیں محض تمہاری خاطر ایسا ارادہ کیا ہے اس لیے کہ عرب نے متفق ہوکر ایک کمان سے تم پر تیر باری شروع کی ہے. اس طریق سے میں ان کی شوکت اور اجتماعی قوت کو توڑنا چاہتا ہوں. سعد ابن معاذ نے عرض کیا یارسول اللہ! جب ہم اور یہ سب کافر اور مشرک تھے، بتوں کو پوجتے تھے، اللہ عزوجل کو جانتے بھی نہ تھے. اس وقت بھی ان کی یہ مجال نہ تھی کہ ہم سے ایک خورمہ بھی لے سکیں، الّا یہ کہ مہمانی کے طور پر یا خرید کر اور اب جب کہ ہم کو اللہ عزوجل نے ہدایت کی لازوال اور بے مثال نعمت سے سرفراز فرمایا ہے اور اسلام سے ہم کو عزت بخشی ہے تو اپنا مال ہم ان کو دے دیں یہ ناممکن ہے، واللہ انھیں اپنا مال دینے کی ہمیں کوئی حاجت نہیں. خدا کی قسم ہم ان کو سوائے تلوار کے کچھ نہ دیں گے. ان سے جو ہوسکتا ہے وہ کر گزریں، اور اس بارے میں جو صلح کی تحریر لکھی گئی تھی سعد ابن معاذ نے نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کے ہاتھ سے لے کر اس کی تمام عبارت مٹادی۔"

(سیرت المصطفیٰ جلد دوم ص ۲۲ - ۲۳)

غزوۂ خندق میں انتہائی شدید اور پُرآشوب حالات میں بھی مسلمانوں نے دب کر صلح گوارا نہیں کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صلح کی دفعات طے کر لینے کے باوجود جب صحابۂ کرام کو معلوم ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صلح حکم الٰہی کی بنا پر نہیں کی ہے بلکہ مسلمانوں پر رحم کھاتے ہوئے، محاصرہ کا دباؤ کم کرنے کے لیے اس صلح کا ارادہ فرمایا ہے، تو انھوں نے اس صلح کی مخالفت کی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک حد تک صلح مکمل ہوجانے کے باوجود صحابۂ کرام کی رائے سے اتفاق کیا اور صلح کی بات ختم ہوگئی. رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر صحابہ کرام سے یہ نہیں فرمایا کہ صلح تو اسلام میں

ہر حال میں مطلوب ہے خواہ فریقِ ثانی کی یک طرفہ شرطوں پر ہو، لہٰذا صلح کو ختم کرنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا، صلح تو ہر قیمت پر ہونی چاہیے۔

صلح حدیبیہ میں رسولِ اکرم کا طرزِ عمل:

صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل غزوۂ خندق سے بالکل مختلف نظر آتا ہے، جاں نثاروں کی زبردست جماعت آپ کے ہمراہ ہے، مسلمانوں کی عسکری پوزیشن غزوۂ بدر و احد وغیرہ سے کہیں زیادہ مستحکم ہے، کفارِ مکہ کا رویہ خالص معاندانہ اور غیر مصالحانہ ہے، صحابۂ کرام عمرہ کرنے سے کم کسی بات پر راضی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی سے مشورہ کیے بغیر کفار قریش کی تمام شرطیں مان کر بظاہر دب کر صلح کر رہے ہیں، صلح کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان اسلام سے پھر کر مکہ چلا آئے تو اسے مسلمانوں کے پاس واپس نہیں کیا جائے گا اور اگر مکہ سے کوئی شخص اسلام قبول کر کے مسلمانوں کے پاس مدینہ چلا آئے تو اسے کفار مکہ کے پاس واپس کر دیا جائے گا۔ آخر حدیبیہ کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نئے اور انوکھے فیصلے کا راز کیا ہے؟ ہر صاحب علم محسوس کرتا ہے کہ صلح حدیبیہ کا واقعہ دوسرے تمام غزوات نبوی سے منفرد اور مختلف نظر آتا ہے۔

جن لوگوں نے حدیث اور سیرت کی مستند کتابوں میں صلح حدیبیہ کا واقعہ تفصیل سے پڑھا ہوگا انھیں بخوبی علم ہوگا کہ یہ پورا واقعہ اشارۂ غیبی کے تحت پیش آیا اور سفرِ حدیبیہ میں ہر اہم موڑ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی فرمائی گئی اور ہدایات دی گئیں۔ اسی لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفرِ حدیبیہ میں جو فیصلے فرمائے ان میں کسی سے مشورہ نہیں کیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ عام طور پر اجتماعی کاموں میں صحابۂ کرام سے مشورہ کرتے اور انھیں اعتماد میں لینے کے بعد کوئی قدم اٹھاتے اور بسا اوقات صحابۂ کرام کی عمومی رائے دیکھ کر اپنی رائے

کے خلاف فیصلہ فرماتے صلح حدیبیہ کے بارے میں جاں نثار صحابہ سے مشورہ کرنے کی کوئی روایت حدیث اور سیرت کی کتابوں میں نہیں آئی ہے بلکہ اس کے برعکس صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آسمانی ہدایات پر فیصلے فرما رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو جو حکم مل رہا ہے اس پر عمل کر رہے ہیں۔ حدیبیہ میں کفار مکہ سے جن شرائط پر صلح کی گئی تھی صحابۂ کرام اس سے سخت رنجیدہ تھے۔ حضرت عمرؓ سے حالات کا تحمل نہ ہو سکا اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو گفتگو کی اس میں صحابۂ کرام کے تاثرات کی جھلک پورے طور پر موجود ہے۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا آپ اللہ کے رسول نہیں؟ آپؐ نے فرمایا، کیوں نہیں! حضرت عمرؓ نے سوال کیا، کیا ہم لوگ مسلمان نہیں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں؟ حضرت عمرؓ نے سوال کیا، کیا وہ لوگ مشرک نہیں ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کیوں نہیں! حضرت عمرؓ نے عرض کیا، پھر ہم لوگ اپنے دین کے بارے میں ذلت کیوں برداشت کریں؟ حضرت عمرؓ کے اس قول کے جواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو الفاظ فرمائے وہ یہ ہیں:

انا عبد اللّٰہ ورسولہ لن	میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں،
أخالف امرہ ولن یضیعنی۔	میں اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا
(سیرت ابن ہشام، قصہ صلح حدیبیہ)	اور نہ ہی اللہ تعالیٰ مجھے ضائع فرمائیں گے

بعض روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کے الفاظ یہ ہیں:

إنی عبد اللّٰہ ولست أعصیہ	بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں،
ھو ناصری۔	میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہی
(الروض الأنف ج ۲ ص ۱۳۴)	میرا مددگار ہے۔

صحیح بخاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

إنی رسول اللّٰہ ولست	بے شک میں اللہ کا رسول ہوں اور

أعصيه۔ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتا۔

(صحیح بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد)

حافظ ابن حجرؒ حدیث کے مذکورہ بالا ٹکڑے کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس جواب سے یہ بات ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ نے اس میں سے کوئی چیز وحی کے بغیر نہیں کی"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب صاف بتلاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں صلح کا جو انوکھا اقدام کیا تھا وہ حکم الٰہی کی بنا پر تھا۔ اس لیے حضرت عمرؓ کی اس گفت وشنید کے جواب میں آپ نے پوری وضاحت سے فرمایا کہ میں اللہ کے حکم کی مخالفت نہیں کرتا۔ میں اللہ کی نافرمانی نہیں کرتا۔ غرضیکہ صلح حدیبیہ کا واقعہ خالص ربانی ہدایات کے تحت وجود میں آیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی بنا پر وہ صلح کی گئی۔ اگر صلح کا یہ اقدام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رائے سے کرتے تو آپؐ حضرت عمرؓ کو اس اقدام کے فوائد بتاتے اور انھیں اس اقدام کی افادیت پر مطمئن کرنا چاہتے۔

غور وفکر کا ایک اور اہم پہلو:

صلح حدیبیہ کے واقعہ میں غور وفکر کے لیے ایک پہلو بہت اہم ہے۔ وہ یہ کہ اگر صلح حدیبیہ اسلام کی اُن عمومی تعلیمات کی روشنی میں وجود میں آتی جس کی تبلیغ وتلقین آپؐ نے سالہاسال سے صحابۂ کرام کو فرمائی تھی، تو صحابۂ کرام کے رنج والم کی وہ کیفیت نہ ہوتی جس کا تذکرہ سیرت کی کتابوں میں آتا ہے۔ اگر اسلام کی یہ مستقل تعلیم ہوتی کہ صلح ہر حال میں مطلوب وپسندیدہ ہے خواہ دب کر اور فریق مخالف کی یکطرفہ شرائط پر ہو تو صحابۂ کرام کو صلح حدیبیہ پر استعجاب نہیں ہونا چاہیے تھا، بلکہ بے پایاں مسرت ہونی چاہیے تھی، حالانکہ سیرت نگار لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دفعات پر صلح کی تھی اُن کی بنا پر لوگ سخت رنجیدہ تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا رنج وغم کی شدت سے ہلاک ہو جائیں گے۔ (سیرت ابن ہشام)

صحابۂ کرام کا یہ تأثر اور حسرت و افسوس اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ حدیبیہ میں جس طرح صلح کی گئی وہ اسلام کی مثالی اور دائمی تعلیم نہیں تھی، بلکہ ان مخصوص حالات میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ صلح انجام پائی۔ صلح حدیبیہ اور اس کی دفعات کو مسلمانوں کے لیے ہر زمانے اور تمام حالات میں مطلوب قرار دینا کتاب و سنت کی تعلیمات اور سیرت نبوی سے افسوس ناک حد تک ناواقفیت کی بات ہے۔ صلح حدیبیہ کے چند سال بعد ۸ھ میں فتح مکہ کا واقعہ پیش آیا جو کفار قریش کی طرف سے صلح حدیبیہ کی بعض دفعات کی خلاف ورزی کا نتیجہ تھا۔ فتح مکہ سے پہلے ابوسفیان کفار مکہ کا نمائندہ بن کر صلح حدیبیہ کی تجدید کرنے مدینہ آیا اور اس نے تجدید صلح کی ہر ممکن کوشش کر لی، کبار صحابہ کو تجدید صلح کے لیے سفارشی بنانا چاہا، لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا، نہ صحابۂ کرام اس کی سفارش کے لیے آمادہ ہوئے۔ اگر صلح اسلام میں ہر حال میں مطلوب ہوتی تو رسول اکرمؐ اور صحابۂ کرام صلح کی اس پیش کش کو ہرگز مسترد نہ کرتے۔

طرزِ استدلال کی خامی:

جناب وحید الدین خاں صاحب نے صلح حدیبیہ سے جو احکام اور نتائج اخذ کیے ہیں ان کا جائزہ لینے سے ان کے طرزِ استدلال کی خامی واضح ہو جاتی ہے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ سیرتِ نبوی کے کسی خاص واقعہ کو لے کر جس کے خاص اسباب و محرکات تھے عمومی اور کلی احکام مستنبط کرنے لگتے ہیں اور اس مسئلہ میں سیرت نبوی کے دوسرے واقعات اور قرآن و سنت کی تعلیمات کو اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں گویا ان سے واقف ہی نہیں ہیں۔ ان کے افکار و نظریات کا بیشتر سرمایہ سیرتِ نبوی کے مختلف واقعات سے اخذ نتائج پر مبنی ہے۔ لیکن جب ہم ان کی تحریروں پر نظر ڈالتے ہیں تو واقعاتِ سیرت سے ناواقفیت کی مضحکہ خیز مثالیں سامنے آتی ہیں، "پیغمبر انقلاب" ان کی بڑی اہم کتاب مانی جاتی ہے، جس پر انھیں انعام بھی مل چکا

ہے۔ لیکن اس میں تاریخ و سیرت کے اعتبار سے بہت سی بھیانک غلطیاں موجود ہیں۔ یہاں صرف دو نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

واقعاتِ سیرت سے بے خبری :

غزوۂ خندق کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں :

"خندق کے بیس روزہ محاصرہ کے بعد جب ایک شدید آندھی سے مجبور ہو کر قریش کی فوج مکہ واپس ہوئی تو آپ نے اس موقع کو مدینہ کے اندرونی یہودیوں سے نمٹنے کے لیے موزوں ترین سمجھا جس میں ان یہودیوں کی سازش اور بغاوت برہنہ ہو کر سامنے آچکی تھی، آپ نے مدینہ کے قبائل (بنو نضیر، بنو قینقاع، بنو قریظہ) کو خندق سے لوٹتے ہی فوراً گھیر لیا، اور ان پر خود ان کی کتاب تورات کے قانون کو جاری کر کے ان کے مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔"

(پیغمبر انقلاب ص ۱۴۹، طبع چہارم)

اس اقتباس سے وحیدالدین خاں صاحب سے جو فحش غلطی ہوئی سیرت نبویؐ کے متوسط طلبا بھی اس سے واقف ہیں۔ سیرت کی تمام چھوٹی بڑی کتابوں میں یہی بات مذکور ہے کہ غزوۂ خندق سے بہت پہلے یہود کے دو قبائل بنو قینقاع اور بنو نضیر مدینہ سے ترک وطن کر چکے تھے۔ شوال ۲ھ میں غزوۂ بنی قینقاع پیش آیا۔ تقریباً پندرہ روز تک رسولِ اکرمؐ بنو قینقاع کا محاصرہ کیے رہے، سولہویں روز مجبور ہو کر یہ لوگ قلعہ سے اُتر آئے۔ عبداللہ ابن ابی ابن سلول کی سفارش پر ان کی جان بخش دی گئی۔ لیکن مال و اسباب لے کر جلاوطنی کا حکم دیا گیا۔ غزوۂ بنو نضیر ربیع الاول ۴ھ میں پیش آیا۔ اس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس قبیلہ کو بھی مدینہ سے جلاوطن کر دیا گیا۔ غرضیکہ شوال ۵ھ میں غزوۂ خندق پیش آنے سے بہت پہلے یہ دونوں قبیلے مدینہ سے جلاوطن کر دیے گئے تھے۔ غزوۂ خندق کے

بعد رسول اللہؐ نے صرف بنو قریظہ کا محاصرہ کیا۔ یہودیوں کا یہی قبیلہ مدینہ میں رہ گیا تھا اور غزوۂ خندق کے نازک موقع پر معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسلام دشمنوں سے مل گیا تھا۔ اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خندق سے فارغ ہونے کے بعد ذی قعدہ ۵ھ میں بنو قریظہ پر حملہ کیا۔ انصار کے قبیلہ اوس اور یہود کے قبیلہ بنو قریظہ میں حلیفانہ تعلق تھا۔ بنو قریظہ نے مجبور ہو کر جب اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ رسول اللہؐ جو حکم دیں وہ ہمیں منظور ہے، تو قبیلۂ اوس کی تحریک پر رسول اکرمؐ نے اوس کے سردار سعد ابن معاذؓ کو بنو قریظہ کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا۔ حضرت سعد ابن معاذؓ نے فیصلہ دیا کہ مرد قتل کر دیے جائیں، عورتیں اور بچے، لونڈی اور غلام بنا لیے جائیں، اور تمام مال واسباب مسلمانوں میں تقسیم کیے جائیں۔ یہ فیصلہ سن کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک تو نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ غزوۂ خندق کے بعد صرف بنو قریظہ سے معرکہ آرائی پیش آئی۔ جہاں تک بنو قینقاع اور بنو نضیر کا تعلق ہے یہ دونوں قبائل غزوۂ خندق سے پہلے جلاوطن کیے جا چکے تھے۔ اس لیے وحید الدین خاں صاحب کا یہ بیان واقعاتِ سیرت سے ناواقفیت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ: "آپؐ نے مدینہ کے قبائل (بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ) کو خندق سے لوٹتے ہی فوراً گھیر لیا اور ان پر خود ان کی کتاب توراۃ کے قانون کو جاری کر کے ان کے مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

واقعاتِ سیرت سے ناواقفیت کا دوسرا نمونہ:

واقعاتِ سیرت سے بے خبری کی دوسری مثال وحید الدین خاں صاحب کی وہ تحریر ہے جس میں انھوں نے حضرت ابو جندلؓ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ صلح حدیبیہ کے سیاق و سباق میں حضرت ابو جندلؓ کا واقعہ سیرت کی تمام کتابوں میں آتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کی ایک دفعہ کی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو جندلؓ کو مکہ واپس بھیج دیا، حالانکہ وہ اسلام قبول کرنے کی بنا پر اہل مکہ

کے مظالم سے بھاگ کر مسلمانوں کی پناہ میں آئے تھے۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد حضرت ابو بصیرؓ مکہ سے بھاگ کر مدینہ حاضر ہوئے۔ کفارِ مکہ کے دو آدمی انھیں واپس لے جانے کے لیے مدینہ آ گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ میں طے شدہ دفعہ کی پابندی کرتے ہوئے انھیں بھی مکہ واپس جانے کا حکم دیا۔ راستہ میں حضرت ابو بصیرؓ نے حسن تدبیر سے دو مشرکین میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرا بھاگ گیا۔ حضرت ابو بصیرؓ نے مدینہ یا مکہ جانے کے بجائے سمندر کے ساحل پر جا کر پناہ لی، جہاں سے گزر کر قریش کے تجارتی قافلے شام جایا کرتے تھے۔ مکہ میں رہ کر جو مسلمان کفارِ مکہ کے ظلم وستم کی چکی میں پس رہے تھے ان کی ایک خاصی تعداد بھاگ کر حضرت ابو بصیرؓ کے پاس پہونچ گئی اور ان لوگوں نے قریش کے تجارتی قافلوں پر حملے شروع کر دیے۔ ابو جندلؓ بھی ان لوگوں میں سے تھے جو مکہ سے بھاگ کر ساحل سمندر پر حضرت ابو بصیرؓ سے جا ملے تھے۔ قریش نے تنگ آ کر رسول اکرمؐ سے از خود درخواست کی کہ صلح حدیبیہ کی وہ مخصوص دفعہ ختم کر دی جائے اور ابو بصیرؓ اور ابو جندلؓ اور ان کے ساتھیوں کو ساحل سمندر سے بلا لیا جائے۔ اس واقعہ کی تفصیل حدیث وسیرت کی بیشتر کتابوں میں موجود ہے۔ صحیح بخاری میں بھی ابو جندل کا بھاگ کر ابو بصیر کے پاس چلے جانے کا ذکر ہے (بخاری، کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد)۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ: "ابو جندلؓ ستر مسلمان سواروں کے ساتھ ابو بصیرؓ سے جا ملے، اور ذی المروہ کے قریب پڑاؤ ڈالا" (فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۹)

جناب وحید الدین خاں صاحب سیرت نبویؐ کے اس مشہور واقعہ سے ناواقفیت کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اپنی مشہور کتاب "پیغمبر انقلاب" میں لکھتے ہیں:

> "آپؐ کے ساتھیوں کے لیے یہ بات بے حد تکلیف کی تھی، مگر آپ نے ابو جندل کو دوبارہ مکہ والوں کے حوالہ کر دیا (صحیحین)۔ بظاہر اس واقعہ کے معنی یہ تھے کہ مظلوم کو دوبارہ ظالم کے چنگل میں دے دیا جائے۔ مگر اس واقعہ میں اصول پسندی کا جو شاندار عملی مظاہرہ ہوا اس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ ظالم اندر سے بالکل ڈھ گئے۔ اب ان کا ابوجندل کو لے جانا اور اپنے یہاں ان کو قید میں رکھنا محض ایک عام واقعہ نہ رہا، بلکہ ان کی طرف سے اخلاقی گراوٹ اور اسلام کے لیے اخلاقی بلندی کی ایک مثال بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ کے لوگ اسلام کے اخلاقی برتری سے مرعوب ہو گئے، وہاں کثرت سے لوگ مسلمان ہونے لگے۔ ابوجندلؓ کا وجود مکہ میں اسلام کی زندہ تبلیغ بن گیا، حتیٰ کہ قید و بند کی حالت میں بھی ابوجندل ان کو اپنی قومی زندگی کے لیے خطرہ معلوم ہونے لگے۔ چنانچہ انھوں نے اس میں عافیت سمجھی کہ ان کو رہا کر کے مکہ کے باہر بھیج دیا جائے۔

(پیغمبر انقلاب ص ۲۸)

وحیدالدین خاں صاحب نے اگرچہ اپنی تحریروں میں زیادہ تر مواد سیرت کے واقعات ہی سے لیا ہے، لیکن انھوں نے سیرت کے واقعات کو بھی اپنے نظریات پر ڈھالنے کی انتھک کوشش کی ہے۔ واقعات سیرت سے نتائج اخذ کرنے کا ان کا طریقہ غیر علمی اور غیر سنجیدہ ہے۔ سیرت کی واقعات نگاری میں غلطیاں بھی بکثرت ہیں، جس کے دو نمونے ابھی قارئین کے سامنے پیش کیے گئے۔

وحیدالدین خاں صاحب کا

تصوّرِ دین

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے اگرچہ ابتدائی تعلیم دینی مدرسہ ہی میں حاصل کی، لیکن ان کے بقول اس تعلیم سے انھیں دین کا صرف روایتی علم حاصل ہوا۔ اسی لیے ۲۰ سال کی عمر ہونے کے باوجود انھیں ذہنی اور قلبی اطمینان حاصل نہیں ہوا" اور پانچ سال تک وہ "تلاشِ حق" کے دشوار ترین مراحل سے گزرے۔ بار بار خودکشی تک کرنے کی نیت کر لی۔ ملک تقسیم ہونے کے بعد جماعت اسلامی میں شمولیت پر ان کا یہ تلاشِ حق کا سفر مکمل ہوا۔ "تعبیر کی غلطی" میں لکھتے ہیں:

> "میں تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۹ء میں جماعت اسلامی کی تحریک سے متاثر ہوا اور تقریباً دس سال تک یکسوئی کے ساتھ اس سے مل کر کام کرتا رہا۔ یہ وقت تھا جب کہ اس کے بہت سے دیگر افراد کی طرح میں یہ سمجھتا تھا کہ مجھ کو آخری صداقت کا علم ہوگیا اس زمانہ میں زیادہ تر جماعت کے عملی کاموں میں مشغول رہا، اور جماعت کے مخصوص لٹریچر کے علاوہ دیگر چیزوں کے مطالعہ کی طرف بہت کم توجہ دے سکا۔"
>
> (تعبیر کی غلطی ص۲۳ دوسرا ایڈیشن)

اس بیان کا واضح مفہوم یہ ہے کہ ۱۹۵۹ء تک جب کہ وحیدالدین خاں صاحب کی عمر ۳۲ سال تھی۔ موصوف اس تصورِ دین سے پورے طور پر متفق تھے، جسے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تحریروں میں پیش کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد

کیا ہوتا ہے یہ بھی وحیدالدین خاں صاحب ہی کے قلم سے پڑھیے:

"اس کے بعد ایک ایسا وقت آیا جب بعض اسباب نے مجھے یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کے مواقع فراہم کر دیے۔ خاص طور پر دو سال کا بیشتر وقت میں نے قرآن کو پڑھنے اور اس کے مطالب پر غور و فکر کرنے پر صرف کیا۔ اس وقت پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ اس فکر پر میرا یقین متزلزل ہو رہا ہے، قرآن کے مطالعہ کے دوران میں شدت سے مجھ پر یہ احساس طاری ہوا کہ قرآن میرے اس تصور دین کی تصدیق نہیں کر رہا ہے جس کو میں اب تک صحیح ترین اسلام کا تصور سمجھ رہا تھا۔"
(تعبیر کی غلطی صـ۲۳)

جماعت اسلامی سے الگ ہونے کے بعد جناب وحیدالدین خاں صاحب نے تعبیر کی غلطی لکھی، جس میں مولانا مودودی کے پیش کردہ تصور دین پر مفصل تنقید کی۔ پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ وحیدالدین خاں صاحب نے اپنی دانست میں مولانا مودودی کے تصور دین کی تردید تو بھرپور کی ہے لیکن اس کے بالمقابل کوئی دوسرا جامع تصور دین پیش نہیں کیا، یعنی اس کتاب میں منفی عنصر غالب ہے۔ تصور دین سے متعلق جو تحریریں وحیدالدین خاں صاحب نے بعد میں لکھی ہیں ان میں بھی کوئی واضح اور جامع تصور دین نہیں پایا جاتا ہے، اور جگہ جگہ انتشار ذہنی اور تضاد بیانی کے نمونے جلوہ گر ہیں، پھر بھی وحیدالدین خاں صاحب کی مختلف تحریروں میں اسلام کی تعبیر اور دین کے تصور کے بارے میں جو خیالات پائے جاتے ہیں ان کا جائزہ لینے کی یہاں کوشش کی جارہی ہے۔

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے جو تصور دین قائم کیا ہے وہ دراصل مثبت بنیادوں پر قائم نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیادیں تمام تر منفی ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مولانا مودودی نے اسلام کی جو تعبیر پیش کی ہے اس میں اسلام کے اجتماعی پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور اسلامی حکومت

برپا کرنے کو اسلام کا اصل مشن قرار دیا گیا ہے، اس کا ردِ عمل وحید الدین خاں صاحب کی تحریروں میں یہ ہوا کہ انھوں نے اسلام کے انفرادی پہلوؤں ہی کو اصل اسلام قرار دیا اور اپنے تصورِ دین میں اسلام کے اجتماعی پہلوؤں کو بُری طرح نظر انداز کیا۔ موصوف "اسلام کیا ہے؟" کے عنوان سے "الرسالہ" فروری ۱۹۸۰ء کے شمارہ میں لکھتے ہیں:

"موجودہ زمانہ میں جب یہ کہا گیا کہ "مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے" تو اس کے جواب میں پُرجوش طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ "مذہب ایک مکمل اجتماعی نظام ہے" بظاہر دونوں گروہ ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں۔ مگر دونوں میں ایک چیز مشترک ہے۔ دونوں ہی گروہ مذہب کا تصوّر ایک "ڈھانچہ" کی صورت میں کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلا گروہ اس کو انفرادی ڈھانچہ کے معنی میں لیتا ہے اور دوسرا گروہ اجتماعی ڈھانچہ کے معنی میں۔

مگر مذہب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے نہ انفرادی ڈھانچہ ہے اور نہ اجتماعی ڈھانچہ۔ وہ ایک ربانی طریقہ ہے۔ مذہب (اسلام) کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے خدا کی معرفت حاصل کرے، وہ غیبی حقیقت کو اپنے لیے مشہود حقیقت بنائے۔ اس کے قلب و دماغ پر خدا اور آخرت کا اتنا غلبہ ہو کہ وہ ہر وقت اسی کی بات سوچے، اس کی زندگی کا ہر رویہ اسی رنگ میں رنگا ہوا ہو۔

اسلام کا اصل مقصد ربانی انسان کو وجود میں لانا ہے، ایک ایک فرد کو خدا کی محبت اور خوف میں ڈھالنا۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان اپنے وجود کے اندر اس ربانی انسان کی تخلیق کرے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرے، جو سب سے زیادہ آخرت کے لیے فکرمند ہو، جو اپنے روزمرہ کے معاملات میں سب سے زیادہ خدا کی مرضی کا لحاظ کرے، جو نفس و شیطان کو چھوڑ کر ایک خدا کے آگے جُھک جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا مخاطب فرد ہے نہ کہ اجتماع۔ اجتماع کے اندر وہ نفسیاتی واقعات ظہور ہی میں نہیں آتے جو اسلام کا اصل مقصود ہیں۔ اجتماع کو اسلام کا مخاطب بنانا اسلام کو گھٹانا ہے نہ کہ اس کو مکمل کرنا۔"

(الرسالہ فروری ۱۹۸۵ء، ص ۴۴)

جناب وحید الدین خان صاحب کے تصوّرِ دین کو سمجھنے کے لیے ان کی درج ذیل تحریر بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ موصوف ایک کانفرنس کی روداد میں لکھتے ہیں:

"اسلامی نقطۂ نظر سے اگر اس کانفرنس کا خلاصہ کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ بیشتر مذاہب کے نمائندوں نے یہ کہا کہ مذہب کا مقصد شخصیت کی تعمیر کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کے نمائندوں نے تقریباً متفقہ طور پر اسلام کی امتیازی صفت یہ بیان کی کہ اسلام صرف فرد کا دین نہیں وہ پورے اجتماعی نظام میں مکمل انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں۔ کیونکہ میرے نزدیک اسلام کا اصل نشانہ فرد ہے نہ کہ اجتماع۔ اجتماعی تعمیر اس کا بالواسطہ جزء ہے نہ کہ براہ راست۔ تاہم میں نے اس سے اعراض کیا کہ کانفرنس میں دیگر مذاہب کے نمائندوں کے سامنے مسلمانوں سے اختلافی بحث کرنے لگوں۔ البتہ الگ سے ان کے سامنے اپنا نقطۂ نظر رکھنے کی کوشش کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کی مذکورہ تعبیر درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی شخصیت کی تعمیر ہی خود اسلام کا مقصد بھی ہے، جس طرح وہ دوسرے مذاہب کا مقصد بتایا جاتا ہے۔ اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان جو فرق ہے وہ کامل اور ناقص کا نہیں بلکہ مستند اور غیر مستند کا۔ اسلام دینِ خداوندی کا محفوظ اور مستند ایڈیشن ہے، جب کہ دوسرے مذاہب دینِ خداوندی کا بگڑا ہوا ایڈیشن۔ اصل مقصد کے اعتبار سے

اسلام اور دوسرے مذاہب میں کوئی فرق نہیں۔"

(الرسالہ مارچ ۱۹۸۶ء ص ۴۰)

اسلام کا مخاطب فرد ہے نہ کہ اجتماع:

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے وحید الدین خاں صاحب کے تصور دین کی ایک فکری اساس معلوم ہوتی ہے۔ موصوف کو اس بات پر اصرار ہے کہ اسلام کا مخاطب فرد ہے نہ کہ اجتماع۔ یا دوسرے الفاظ میں اسلام کا اصل نشانہ فرد ہے نہ کہ اجتماع۔ کتاب وسنت پر نظر رکھنے والوں کو معلوم ہے کہ اسلام کے اوامر واحکام دو قسم کے ہیں۔ انفرادی احکام۔ اور۔ اجتماعی احکام۔ انفرادی احکام سے مراد وہ احکام ہیں جن کا مطالبہ فرداً فرداً ہر مکلف مسلمان سے ہے۔ مثلاً نماز، روزے اور زکوٰۃ کی ادائیگی، اور اجتماعی احکام سے مراد وہ احکام ہیں جن کا مخاطب فرداً فرداً ہر شخص نہیں ہے بلکہ پورا معاشرہ اس کا مخاطب ہے۔ اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ ان اجتماعی اوامر کی ادائیگی ہو۔ اگر سماج کے بعض افراد نے اس حکم کی ادائیگی کر لی اور اتنے لوگ اس کام میں لگ گئے جو اس کے انجام دہی کے لیے کافی ہیں تو پورا سماج اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا اور گناہ سے بچ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر کسی شخص نے بھی وہ فرض انجام نہیں دیا تو سارے لوگ گنہگار ہوتے ہیں۔ ان اجتماعی احکام کو فرض کفایہ بھی کہا جاتا ہے۔ اسلام میں فرض کفایہ کی طویل فہرست ہے۔ ان تمام فرائض کفایہ میں اسلام کا مخاطب پورا سماج ہوتا ہے، اور سماج کی اجتماعی ذمہ داری ہوتی ہے کہ ان فرائض کو کما حقہ ادا کرنے کا انتظام کرے۔ جناب وحید الدین خاں صاحب نے ایک مختصر سا جملہ لکھ کر "اسلام کا مخاطب فرد ہے نہ کہ اجتماع" سارے فرائض کفایہ کو اسلامی احکام کی فہرست سے خارج کر دیا۔ حالانکہ خود تبلیغ و دعوت جس کا علمبردار وحید الدین خاں صاحب نے اپنے آپ کو بنا رکھا ہے وہ بھی فرائض کفایہ

ہی میں شمار ہوتا ہے اور اس کا فرض کفایہ ہونا خود قرآن پاک کی درج ذیل آیت سے ظاہر ہے :-

ولتکن منکم امۃ یدعون	تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا
إلی الخیر ویأمرون بالمعروف	چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائیں،
وینھون عن المنکر۔	بھلائی کا حکم دیں، برائی سے روکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا مخاطب فرد بھی ہے اور معاشرہ بھی، اسلام نے جہاں فرد کی اصلاح و تربیت اور کردار سازی نیز تصحیح عقیدہ کو اپنا موضوع بنایا وہیں سماج کی تشکیل و تعمیر اور اسلامی بنیادوں پر معاشرہ کو اٹھانے کی جانب بھی پوری توجہ کی۔ اسلام نے روح و مادہ، فرد و معاشرہ، ہر ایک کو اپنے احکام کے دائرہ میں لیا اور ایک جامع ترین ربانی ہدایت عالم انسانیت کے سامنے پیش کی، انیسویں و بیسویں صدی میں بین الاقوامی حالات کے تقاضہ سے اسلام کی جو "نظامی تعبیر" پیش کی گئی اس میں قدرے بے اعتدالی کا پایا جانا کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ اس تعبیر کے بارے میں یہ شکایت کسی حد تک درست ہوسکتی ہے کہ اس میں اسلام کے انفرادی پہلو کو دبا کر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس بے اعتدالی کا مداوا یہ نہیں تھا کہ ردعمل کا شکار ہو کر اسلام کی جامعیت کا خون کیا جائے اور اسلام کے وہ بے شمار احکام جن کا تعلق سماج کی تنظیم و اصلاح اور صحیح اسلامی معاشرہ برپا کرنے سے ہے انھیں اسلام کی فہرست احکام سے خارج کر دیا جائے یا ان کی حیثیت بے انتہا گھٹا دی جائے۔ زیر مطالعہ کتاب میں وحیدالدین خاں صاحب کے جو افکار و خیالات مختلف صفحات میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وحیدالدین خاں صاحب بڑی حد تک اہل یورپ کے اس نظریہ سے متفق ہو چکے ہیں کہ مذہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے۔ وحیدالدین خاں صاحب کی مختلف ادوار کی تحریروں کے مطالعہ سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ اسلام کے اجتماعی احکام کے بارے میں ان کے ذہن نے مختلف کروٹیں لی ہیں، اور

مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے ان کا ذہن یہاں تک پہنچا ہے کہ "اسلام کا اصل نشانہ فرد ہے نہ کہ اجتماع" مولانا مودودی کے پیش کردہ تصور دین سے برگشتہ ہونے کے بعد انھوں نے "تعبیر کی غلطی" لکھی ہے۔ لیکن اس کتاب میں اجتماعی احکام کے بارے میں موصوف وہاں تک نہیں پہونچے تھے جس کا مشاہدہ ان کی اس دور کی تحریروں میں کیا جاتا ہے، مثلاً مسلم ممالک میں اسلامی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کے بارے میں انھوں نے تعبیر کی غلطی میں لکھا ہے:

"بعض لوگوں کی طرف سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ "اقتدار حاصل کرنے کی براہ راست کوشش کرنا اسلام کے پیروؤں کی دینی ذمہ داری نہیں۔ اقتدار کی حیثیت دراصل انعام کی ہے جو دین کی مخلصانہ پیروی کے نتیجہ میں اللہ کی طرف سے اہل ایمان کو عطا ہوتا ہے"۔ زیر بحث تعبیر کے حامی اس تصور پر سخت تنقید کرتے ہیں، وہ اسلام کے سیاسی و سماجی احکام کی فہرست پیش کر کے کہتے ہیں کہ اگر حکومت حاصل کرنا ضروری نہیں ہے تو ان احکام کی تعمیل کس طرح ہوگی۔ مگر اس بحث میں دونوں فریق غلطی پر ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ ایک آزاد مسلم معاشرہ کا فرض تو یقیناً یہی ہے کہ اپنے درمیان اسلام کی بنیادوں پر ایک سیاسی نظام قائم کرے کیونکہ اس کے بغیر معاشرہ کے پیمانہ پر شریعت کی تعمیل نہیں کی جاسکتی۔ مگر جہاں مسلمان اس حیثیت میں نہ ہوں وہاں اسلام ان کو خارجی زندگی کے لیے جو پروگرام دیتا ہے وہ نصب امامت نہیں بلکہ انذار و تبشیر ہے۔ اس انذار و تبشیر کی مہم میں جو مراحل بھی پیش آئیں انھیں اس میں پوری طرح ثابت قدم رہنا چاہیے۔ اگر انھوں نے ایسا کر دیا تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی مدد فرمائے گا اور ان کے لیے ایسے حالات پیدا کرے گا جو انھیں اقتدار حکومت تک لے جانے والے ہوں۔ پہلی صورت میں حکومت قائم کرنا اہل ایمان کا فرض ہے۔ دوسری صورت میں حکومت

ملنا اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔" (تعبیر کی غلطی ص ۳۰۶-۳۰۷)

اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انبیاء پہلے اصلاح معاشرہ پر اپنی قوت لگاتے ہیں اور اس کے بعد سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر تقدیم و تاخیر کی یہ بحث میرے نزدیک صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ زیر بحث تعبیر سے آزاد ہو کر سوچ نہ سکے، اور اسی کے چوکھٹے میں رہتے ہوئے ایک نئے عنوان سے اپنے عدم اطمینان کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ قرآن میں مذکور انبیاء میں آخری رسول کے سوا تین رسول ہیں جن کی زندگی میں بادشاہت اور حکومت جمع ہوئی۔ حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت یوسفؑ، ان تینوں میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ ان کی حکومت کسی معاشرتی حالات کے تقاضا کے طور پر ابھری تھی، یا یہ کہ انھوں نے پہلے معاشرہ کی اصلاح کی اور اس کے بعد حکومت قائم فرمائی۔" (تعبیر کی غلطی ص ۳۱۲)

تعبیر کی غلطی کی پہلی اشاعت ۱۹۶۳ء میں ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد "الفرقان" لکھنؤ کے جولائی ۱۹۶۴ء کے شمارہ میں وحیدالدین خاں صاحب کا ایک مضمون "دینی دعوت ہندوستان میں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون میں موصوف نے ایک جگہ لکھا ہے:

"جہاں تک غیر اسلامی اقتدار میں تغیر کے لیے جد وجہد کا سوال ہے یہ مسلم علاقہ میں تو فرض علی الکفایہ کے درجہ میں مطلوب ہے مگر غیر مسلم علاقہ میں اس کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ غیر مسلم علاقہ میں شرعی نصب العین کے طور پر ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ وہاں ہم لازمی طور پر اسلامی حکومت برپا کرنے کی جد وجہد کریں۔ مگر شرعی فریضہ نہ ہونے کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ حکومت و اقتدار ہر فکر اور ہر عقیدہ کے لیے ایک اہم ترین

عنصر ہے۔ حکومت کا مسلمان ہونا ہر پہلو سے دین اور اہل دین کے لیے اپنے اندر بے شمار فوائد رکھتا ہے، اور اس اعتبار سے وہ یقینی طور پر اہل ایمان کی ایک پسندیدہ چیز (اُخری تحبونہا) ہے، اور اگر حالات اور مواقع موجود ہوں تو یقیناً یہ جدوجہد بھی ہونی چاہیے کہ اقتدار بدلے اور اسلامی نظام حکومت کا قیام عمل میں آئے اس طرح کی مہم میں حصہ لینا عین جہاد ہے اور اس کی راہ میں جان قربان کرنا یقینی طور پر شہادت کا درجہ پانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مسلم علاقہ میں اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد کا مسئلہ ایک نظریاتی مسئلہ ہے۔ یعنی وہ عقیدہ کے براہ راست تقاضہ کے طور پر پیدا ہوتا ہے جب کہ غیر مسلم علاقہ میں اسلامی اقتدار لانے کی کوشش ایک عملی سوال ہے جس کا شامل پروگرام ہونا حالات پر موقوف ہے نہ کہ عقیدہ اور نظریہ پر۔"

(الفرقان جولائی ۱۹۶۴ء ص ۵۲)

مذکورہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دور میں وحیدالدین خاں صاحب مسلم ممالک میں غیر اسلامی اقتدار کو ختم کرنے کی جدوجہد کو فرض کفایہ قرار دیتے تھے اور مسلم اقلیتی ممالک میں بھی اگر حالات سازگار ہوں تو اسلامی حکومت برپا کرنے کی جدوجہد کو جہاد اور اس راہ میں جان دینے کو شہادت قرار دیتے تھے۔ لیکن ادھر چند سالوں سے ان کا نقطۂ نظر کافی تبدیل ہو چکا ہے۔ بہت سے مسلم ممالک میں اسلامی جماعتیں اور تحریکیں اسلامی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کر رہی ہیں اور بسا اوقات انھیں حکومت وقت کے ظلم و استبداد کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ ان تحریکوں اور جماعتوں کی وحیدالدین خاں صاحب برابر مذمت کر رہے ہیں اور مسلم یا غیر مسلم ممالک میں کوئی بھی ایسی تحریک جس کی بنا پر حکومت وقت سے تصادم اور ٹکراؤ کی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے، اسے موصوف درست نہیں سمجھتے، خواہ وہ تحریک کتنے ہی اہم مقصد سے قائم کی گئی ہو، اور خواہ ٹکراؤ کا رویہ

خود اس تحریک کی طرف سے نہ ہو بلکہ اقتدار وقت نے اس تحریک کو اپنے خلاف سمجھ کر خواہ مخواہ تصادم کا راستہ اپنایا ہو۔ موجودہ صدی میں اسلامی نظام کو برپا کرنے کی جو کوششیں ہوئیں خواہ عالم عربی میں "الاخوان المسلمون" کی کوششیں ہوں، یا پاکستان میں صدر ضیاء الحق مرحوم کی کوششیں ہوں۔ یہ تمام کوششیں وحید الدین خاں صاحب کی نظر میں مہمل اور نقصان دہ ہیں۔ جناب وحید الدین خاں صاحب "الرسالہ" فروری ۱۹۸۶ء میں لکھتے ہیں:

"عرب نوجوانوں پر عام طور پر سید قطب کے انقلابی فکر کا غلبہ ہے، میں نے اس کو گفتگو کا موضوع بنایا۔ میں نے کہا کہ یہ اسلام کی سراسر غلط تفسیر ہے اور اس تفسیر نے پوری نسل کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ ان لوگوں نے اسلام کو سیاسی ٹکراؤ کے ہم معنی بنا دیا ہے۔ جہاں جہاں یہ اسلامی سیاسی فکر بنا لوگ اپنے حکمرانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں حکمرانوں نے انھیں کچلنے کی کوشش کی۔ اب انھوں نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ مسلم حکمران اسلام کے دشمن ہیں، حالانکہ واقعہ صرف یہ تھا کہ مسلم حکمراں اپنے اقتدار کو چیلنج کرنے والوں کے دشمن تھے۔ یہ لوگ اگر غیر سیاسی انداز میں کام کرتے تو اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں کو وہ اپنا معاون پاتے، مگر سیاسی انداز میں کام کرنے کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا، اور مسلم ملکوں کے تمام بہترین امکانات برباد ہو کر رہ گئے۔ سیاسی قربانیوں سے عملاً قوم کو کچھ نہیں ملتا۔ البتہ سیاسی قربانی دینے والا بعد کی نسلوں کے لیے ہیرو بن جاتا ہے۔"

(الرسالہ فروری ۱۹۸۶ء ص ۴۲-۴۳)

جولائی ۱۹۹۰ء کے 'الرسالہ' میں جناب وحید الدین خاں صاحب لکھتے ہیں:

"ایک اور نشست میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں جو مسلم جماعتیں مسلم حکمرانوں سے ٹکراؤ کر رہی ہیں اس کو میں سراسر لغو سمجھتا ہوں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اسلام کا مقصد صالح نظام

بنانا ہے اور صالح نظام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ موجودہ زمانہ کی مسلم حکومتیں ہیں جو سیاسی جبر کے اوپر قائم ہیں۔ اگر ہم اس سیاسی جبر کا خاتمہ نہ کریں تو ہم کبھی بھی صالح نظام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ میں نے کہا کہ جبر (اجباری) نظام کو توڑنے کے لیے ہمیں براہ راست جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام خود خدا کی طرف سے زیادہ موثر طور پر انجام دیا جا رہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس دنیا کو خدا نے امتحان کی مصلحت کے تحت بنایا ہے۔ امتحان کی مصلحت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ لوگوں کو اپنے عمل کی آزادی ہو۔ اگر کسی آدمی کا ہاتھ پاؤں باندھ دیا جائے تو اس پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ اس نے مسجد میں جا کر نماز نہیں ادا کی۔

رات کا اندھیرا ضرور ختم ہوتا ہے، رات کو ختم کرنے کے لیے ہمیں اس سے براہ راست لڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اپنے اندر یہ استعداد پیدا کریں کہ جب رات ختم ہو کر دن آئے تو ہم اس کو پوری طرح استعمال کر سکیں۔ اسی طرح نظام جبر کے دوران ہمیں یہ تیاری کرنا چاہیے کہ جب خدا اس کو ختم کرے تو ہم نئے مواقع کو استعمال کر کے صالح نظام کو تعمیر کر سکیں۔"

(الرسالہ جولائی ۱۹۹۶ء ص ۳۵، ۳۶)

وحیدالدین خاں صاحب کی مذکورہ بالا منطق سے ان کا یہ نظریہ آشکارا ہو جاتا ہے کہ اسلامی اقتدار قائم کرنے کے لیے مسلمانوں سے کسی جدوجہد کا مطالبہ شریعت نے نہیں کیا ہے، اسلامی بنیادوں پر حکومت قائم کرنے کے لیے اجتماعی جدوجہد نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں ہے بلکہ سراسر لغو ہے۔ وحیدالدین خاں صاحب کا یہ نظریہ قرآن و سنت کی تعلیمات سے کس قدر دور ہے اہل علم اور اہل نظر کے سامنے اس کی تشریح کی حاجت نہیں ہے۔

اسلام کے اجتماعی احکام:

جناب وحیدالدین خاں صاحب کی تحریروں میں تدریجاً یہ رجحان بڑھتا جارہا ہے کہ وہ اسلام کے اجتماعی احکام کی اہمیت کم کرتے جارہے ہیں، حالانکہ اسلام کے اجتماعی احکام بھی اسلامی شریعت میں اسی طرح مطلوب ہیں جس طرح انفرادی احکام مطلوب ہیں۔ لیکن کوئی حکم خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی اسی وقت لازم ہوگا جب کہ وہ شرائط مکمل طور پر موجود ہوں جنھیں شارع نے اس حکم کے لزوم کے لیے بیان کیا ہے۔ وحیدالدین خاں صاحب کا نقطۂ نظر سمجھنے کے لیے چند تحریروں کا مطالعہ مفید ہوگا۔ موصوف اپنی کتاب "تبلیغی تحریک" میں لکھتے ہیں:

"قرآن و سنت کے مطالعہ سے دین کا جو مطلب میں سمجھا ہوں، وہ یہ ہے کہ دین کے تقاضے دو قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک تقاضہ تو وہ ہے جو دین کی اصل اور اس کی روح ہے۔ یہ ہے اللہ کی معرفت، اس سے خشیت و محبت کا تعلق، اس کے اوپر اعتماد، اور اس طرح مؤمن و قانت بن کر خدا کی عبادت اور معاملات زندگی میں اس کی تابعداری۔ دوسرا تقاضہ وہ ہے جو مادی دنیا اور دین کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ دین کو فکری اور عملی طور پر غالب اور سربلند رکھنے کے لیے مختلف صورتیں پیش آتی ہیں اور موقع کے اعتبار سے ہر جگہ مؤمن کو نپٹنا پڑتا ہے، کہیں رکانہ سے کشتی لڑنی پڑتی ہے اور کہیں حسان ابن ثابت کو حکم دیا جاتا ہے نظم سنائیں، کہیں وقت کے وکلاء کو مطمئن کرنے کے لیے حجت ابراہیمی ظہور میں آتی ہے، کہیں بدر و حنین کے معرکے پیش آتے ہیں، کہیں غیر مسلموں سے معاہدہ کیا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک پہلے تقاضہ کا تعلق ہے، وہ دین کی اصل ہے اور دائمی طور پر دین کے مطلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر دوسری چیز کی یہ حیثیت

نہیں وہ دین کا اضافی جز ہے نہ کہ حقیقی۔ حالات جس وقت اس طرح کے
کسی تقاضہ کو بروئے کار لاچکے ہوں اس وقت اضافی جز بھی عملی طور پر
حقیقی جز کی طرح مطلوب ہوتا ہے۔ مگر جب حالات نے اس کی ضرورت پیدا
نہ کی ہو اس وقت مومن کے اوپر اس سلسلہ میں کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔"
(تبلیغی تحریک ص ۴۸۔ ۴۹)

جون ۱۹۸۸ء کے 'الرسالہ' میں جناب وحید الدین خاں صاحب لکھتے ہیں:

"اسلام کامل سپردگی (Total submission) کا نام ہے
نہ کہ کامل نظام (Total system) کا ایک شخص جو اللہ پر ایمان لائے
اس کو اپنی سوچ، اپنے جذبات، اپنے کردار اور اپنی عبادت گزاری میں
کامل طور پر خدا کا فرمانبردار ہونا چاہیے۔ بہ حیثیت ایک فرد کے اس کو
پوری طرح خدا کا بندہ بن کر رہنا چاہیے۔ حتی کہ جو شخص سیاسی اقتدار کی کرسی
پر ہو وہ بھی اپنی انفرادی حیثیت ہی میں اللہ کے یہاں جوابدہ ہے نہ کہ
اجتماعی حیثیت میں۔

جہاں تک اجتماعی احکام کا تعلق ہے، اس کا معاملہ اس سے بالکل
الگ ہے۔ انفرادی احکام علی الاطلاق مطلوب ہیں۔ جب کہ اجتماعی احکام
حالات کی نسبت سے مطلوب ہوتے ہیں۔ ایک شخص اگر اپنے انفرادی اختیار
کے دائرہ میں اسلامی احکام کو اختیار کرلے تو وہ کامل مسلم ہوگیا۔ اس
کے اسلام کی تکمیل اس پر منحصر نہیں کہ وہ انفرادی اختیار کے دائرہ سے
باہر اجتماعی اختیار کے دائرہ میں بھی لازماً اسلام کی پیروی کرے۔

اس معاملہ کو زکاۃ کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ زکاۃ مسلمان کے
اوپر اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز فرض ہے۔ مگر دونوں کے درمیان
ایک بنیادی فرق ہے۔ نماز ایک ایسا حکم ہے جس کی ادائیگی ہر حال میں
لازم ہے۔ نماز ایک مسلمان سے کسی حال میں ساقط نہیں ہے۔ مگر زکاۃ

کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ایک شخص اگر صاحب نصاب ہو تو اس کے لیے زکاۃ کی ادائیگی ضروری ہوگی۔ مگر جو شخص صاحب نصاب نہ ہو اس پر نہ زکاۃ کی ادائیگی واجب ہے اور نہ یہ واجب ہے کہ وہ کمائی کرکے صاحب نصاب بنے تاکہ وہ قرآنی حکم کے مطابق زکاۃ ادا کر سکے۔"

(الرسالہ جون ۱۹۸۶ء ص ۲۴)

ان دونوں اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب وحید الدین خاں صاحب اسلام کے اجتماعی احکام کو اضافی جزء کی حیثیت دیتے ہیں اور ان کی نظر میں اسلام میں اجتماعی احکام کی وہی حیثیت ہے جو کسی مجموعہ میں اضافی اجزاء کی ہوتی ہے۔ انفرادی احکام ہی کو اختیار کر لینے سے انسان ان کے نزدیک کامل مومن بن جاتا ہے۔ موصوف نے انفرادی اور اجتماعی احکام کی حیثیت میں جو فرق بیان کیا ہے اس کے لیے انھوں نے کتاب وسنت سے کوئی دلیل پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ حالانکہ موصوف کے دعاوی اتنے اصولی اور دور رس ہیں کہ ان کا اثر اسلام کے بے شمار احکام پر پڑتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی احکام میں حیثیت اور مطلوبیت کے اعتبار سے انھوں نے جو فرق بیان کیا ہے۔ اس کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اسلام کے اجتماعی احکام بھی جب کتاب وسنت میں اسی شدومد کے ساتھ مذکور ہیں جس طرح انفرادی احکام مذکور ہیں تو پھر اجتماعی احکام کو اسلام کا غیر حقیقی اور اضافی جزء بنانا کیا معنی رکھتا ہے۔ جہاں تک کسی حکم شرعی کے لزوم کا تعلق ہے خواہ انفرادی حکم ہو یا اجتماعی، اس کا دارومدار دراصل لزوم کی شرائط پائے جانے یا نہ پائے جانے پر ہے۔ اسلام نے کسی بھی حکم کو لازم اور واجب ہونے کے لیے جو شرطیں رکھی ہیں، ان کے متحقق ہونے پر ہی وہ حکم لازم ہوتا ہے۔ خواہ وہ انفرادی حکم ہو یا اجتماعی۔ نماز، روزہ، زکاۃ اور حج کا شمار بلا شبہ انفرادی احکام میں ہے۔ یہ چاروں اسلام کے ارکان (بنیادی ستون) ہیں۔ لیکن ان کی فرضیت کے لیے بھی کتاب وسنت میں شرطیں

بیان کی گئی ہیں۔ ان شرطوں کے پورا ہوئے بغیر یہ عبادات فرض نہیں ہوتی ہیں۔ مثلاً حیض یا نفاس والی عورت پر نماز فرض نہیں، فقیر پر زکاۃ فرض نہیں۔ جو شخص زادراہ اور سواری کا مالک نہ ہو اس کے ذمہ حج فرض نہیں۔ لیکن بعض حالات میں ان عبادات کے فرض نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم ان ارکان اسلام کو اسلام کے اضافی اجزاء قرار دے کر ان کی اہمیت گھٹائیں۔

اسلام کے تمام اجتماعی احکام کو اسلام کا اضافی جزء قرار دینے کے جو نتائج ہو سکتے ہیں وہ سب وحیدالدین خاں صاحب کی تحریروں میں ہویدا ہیں۔ اسلامی ممالک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی جو تحریکیں چل رہی ہیں، وحیدالدین خاں صاحب نے نہ صرف ان کی مخالفت کی ہے بلکہ ان کا مذاق بھی اُڑایا ہے۔ موصوف نے "الرسالہ" جنوری ۱۹۸۴ء کے شمارہ میں لکھا ہے کہ:

> "بیسویں صدی میں مسلم ممالک کم از کم سیاسی معنوں میں اجنبی اقتدار سے آزاد ہو چکے ہیں مگر مسلمانوں کی باہمی سیاسی لڑائیاں اب بھی ختم نہیں ہوئیں بلکہ اس نے نظریاتی صورت اختیار کر کے مزید شدت پکڑ لی ہے۔ اب اس کا عنوان ہے: "اسلامی قانون کا نفاذ یا حکومت الٰہیہ کا قیام" جس ملک میں بھی چیخ پکار کرنے یا احتجاجی سیاست چلانے کے مواقع ہیں وہاں ہمارے مصلحین اور قائدین اسلامی قانون کا جھنڈا لیے ہوئے اپنی قومی حکومتوں سے ٹکرا رہے ہیں اور پوری قوم کو ایک لامتناہی جنگ میں الجھائے ہوئے ہیں۔ انڈونیشیا کے عبدالقہار مذکر (۱۹۰۲ــ ۱۹۷۲) کو سابق صدر سوئیکارنو، ہر قسم کے اصلاحی کام کے مواقع دے رہے تھے۔ مگر وہ دستور اسلامی کے نفاذ کے نام پر لڑ لڑ کر ختم ہو گئے۔ مصر کے سید قطب (۱۹۰۶ــ ۱۹۶۶) کو سابق صدر جمال عبدالناصر نے اسلامی تعلیم و ترقی کے کاموں کے لیے حکومتی تعاون کی پیش کش کی مگر وہ اور ان کی پوری جماعت صدر ناصر کی معزولی سے کم کسی چیز

پر راضی نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے اسے پیس ڈالا۔ پاکستان کے سید ابوالاعلیٰ مودودی کو پاکستان کے حکمرانوں نے دعوتی اور تعمیری کاموں کے لیے ہر قسم کا تعاون دینا چاہا، مگر ان کے نزدیک سب سے بڑا کام بے دین حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنا تھا تاکہ پاکستان میں اسلام کے دیوانی اور فوجداری قانون کو نافذ کیا جا سکے۔"

(الرسالہ جنوری ۱۹۸۹ء ص ۳۱)

اسلامی ممالک میں جو لوگ اسلام کے دیوانی یا تعزیراتی قوانین کے نفاذ کی مہم چلا رہے ہیں ان کا یہ نظریہ ہرگز نہیں کہ دیوانی یا فوجداری قوانین ہی کا نام اسلام ہے۔ انھیں اسلام کی جامعیت اور اسلامی احکام کے متنوع گوشوں کا بخوبی احساس ہے لیکن وہ لوگ اسلام کے قوانین دیوانی یا تعزیراتی قوانین کو وحید الدین خاں صاحب کی طرح اسلام کا اضافی جزء نہیں کہتے بلکہ اسے اسلامی قانون کا ایک اہم حصہ تصور کرتے ہیں۔ اس لیے اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ جن ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ـــــ وہاں اسلامی قوانین بھی نافذ کیے جائیں، اور اس کے لیے وہ لوگ حتی الامکان پوری جدوجہد کر رہے ہیں۔ اگر مسلم علاقوں میں اسلامی اقتدار کا قیام یا اسلامی قوانین کی تنفیذ فرض کفایہ ہے، تو جو لوگ اس عظیم کام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور قربانیاں دے رہے ہیں۔ ان کا اگر ہم عملی تعاون نہ کر سکیں تو کم از کم ان کے حق میں کلمۂ خیر ہی کہیں اور دعا کریں۔ لیکن وحید الدین خاں کا رویہ یہ ہے کہ وہ ان مبارک کوششوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان پر اوچھی تنقیدیں کرتے ہیں۔ جولائی ۱۹۷۹ء کے الرسالہ میں موصوف لکھتے ہیں:

"موجودہ زمانہ میں کچھ تحریکیں ابھری ہیں جو اسلام کے حدود تعزیرات (سزاؤں) کے اجراء کو اسلامی نظام کے نفاذ کا نام دیتی ہیں یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ اسلام کے اس فوجداری تصور نے اسلام کے اصل مدعیٰ کو

ختم کر دیا ہے، کسی تعلیم گاہ میں بید کی سزاؤں کا اجرا، تعلیم گاہ کے اندر ڈسپلن قائم کرنے سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ اصل تعلیمی مقصد سے۔ اسی طرح اسلام میں جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں وہ مسلم معاشرہ کی تنظیم کے لیے ہیں، یہی اسلام کا اصل مقصد نہیں ہے۔ دورِ اول میں جب مدینہ میں اسلامی ریاست قائم ہوئی تو مذکورہ معنوں میں وہاں اسلامی نظام قائم ہوگیا، مگر اسی معاشرہ میں وہ "مسلمان" بھی تھے جن کے بارے میں قرآن میں اعلان کیا گیا کہ " ان المنافقين فى الدرك الاسفل من النار (منافقین جہنم کے سب سے نچلے حصہ میں ہوں گے) حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا اصل مقصد افراد کا تزکیہ ہے جو ان کے اندر وہ باطنی اوصاف پیدا کرے جو ان کو جنت کا مستحق بنانے والے ہوں۔ اسلام کی کوششوں کا نشانہ لوگوں کو جنتی انسان بنانا ہے نہ کہ ان کو کوڑے مارنا اور پھانسی دینا۔" (ص ۲۹)

اسلام کے اجتماعی احکام کو اسلام کا اضافی جزء قرار دینے کے جو طبعی نتائج ہونے چاہئیں وہ سب کے سب وحید الدین خاں صاحب کی تحریروں میں ظاہر ہیں۔ ان کی تحریروں کا مطالعہ کرنے سے اسلام کے اجتماعی احکام کی اہمیت کم ہوتی ہے، اور مذہب کے بارے میں تقریباً وہ تاثر پیدا ہوتا ہے جو اہلِ یورپ کے ہاں رائج ہے کہ مذہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے۔ اسلام کے دیوانی، فوجداری قوانین کا معاملہ ہو یا راہِ خدا میں جہاد و قتال کا، یا اسلامی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کا۔ ان تمام چیزوں کی اہمیت وحید الدین صاحب کے تصورِ دین میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ بلکہ ان کی بعض تحریروں سے دین کے ان اجزاء اور ان کی خاطر جدوجہد کرنے والوں کا استخفاف ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ اسلام کے تمام احکام یکساں اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ احکامِ اسلامی مدارج کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے، لیکن اسلام کے مجموعۂ احکام کے کسی

حد کو "اضافی" کہنا یا اسے اسلام کے اصل نشانہ سے خارج تصور کرنا، دین اسلام کے صحیح تصور کو تبدیل کرنا ہے۔ غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ و دعوت کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اور یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانے میں مسلمانوں سے ماضی میں بھی مجرمانہ غفلت ہوئی ہے اور عصر حاضر میں بھی غفلت برتی جارہی ہے۔ لیکن ان دونوں باتوں کے باوجود قرآن و سنت کی رو سے اس کا کوئی جواز نہیں کہ تبلیغ و دعوت کی آڑ میں دوسرے دینی فرائض واحکام کا استخفاف وانکار کیا جائے، مسلمانوں کے ذمہ اجتماعی طور سے جن جن فرائض کی ادائیگی لازم ہے مجموعی طور پر ایک ہی وقت میں ان سب کی ادائیگی ہونی چاہیے۔ مسلمان تقسیم کار کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ان تمام اجتماعی فرائض کو ہر زمانہ میں ادا کرنے کی کوشش کرتے رہے، اور عصر حاضر میں بھی یہ کوششیں جاری ہیں۔ کوئی بھی اجتماعی فریضہ خواہ وہ کتنا ہی بنیادی اور اہم ہو تنہا اس کی ادائیگی کرنے سے دوسرے اجتماعی فرائض سے سبکدوشی نہیں ہوسکتی۔ اگر سو اجتماعی فرائض میں سے ننانوے فرائض کی ادائیگی کی جارہی ہے اور صرف ایک فریضہ کی ادائیگی سے کمل غفلت برتی جارہی ہے تو پورا مسلم سماج گنہگار اور قابلِ مواخذہ ہوگا۔

وحید الدین خاں صاحب کا

تصوّرِ جہاد

جہاد کا لفظ اگرچہ قرآن وسنت میں مختلف دینی اعمال اور سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے لیکن قرآن وسنت میں مجاھد اور جہاد کے استعمالات کا تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کا لفظ اسلامی شریعت کی ایک اصطلاح بن چکا ہے اور قرآن وسنت نیز فقہاء ومفسرین کی عبارتوں میں جب کسی قید وقرینہ کے بغیر مطلق لفظ جہاد کا استعمال ہو تو اس سے وہی اصطلاحی معنی مراد ہوتا ہے۔ مشہور محدث حافظ ابن حجر عسقلانیؒ متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

الجهاد بكسر الجيم اصله لغة	جہاد (جیم کے زیر کے ساتھ) لغت میں
المشقة يقال جهدت جهداً	اس کا اصل معنی مشقت ہے۔ کہا جاتا ہے
بلغت المشقة وشرعاً بذل	جهدت جهداً یعنی میں پوری مشقت
الجهد في قتال الكفار ويطلق	میں پڑ گیا، اور شریعت کی اصطلاح میں جہاد
ايضاً على مجاهدة النفس	کا مفہوم ہے کفار سے قتال میں پوری طاقت
والشيطان والفساق۔	صرف کرنا۔ جہاد کا لفظ نفس، شیطان اور
(فتح الباری ج ۶ ص ۳ کتاب الجهاد والسير)	فساق کے خلاف مجاہدہ پر بھی بولا جاتا ہے۔

جہاد کے فضائل واحکام سے قرآن وسنت معمور ہیں، حدیث کی تمام کتابوں میں ایک حصہ "کتاب الجہاد" کے عنوان سے ہوتا ہے، جہاد کے فضائل بے شمار ہیں، یہاں صرف دو حدیثیں نقل کی جاتی ہیں:

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لولا أن رجالاً من المؤمنین لا تطیب انفسھم أن یتخلفوا عنی ولا أجد ما احملھم علیہ ما تخلفت عن سریۃ تغزو فی سبیل اللہ والذی نفسی بیدہ وددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل۔

(متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر یہ بات نہ ہوتی کہ مومن مردوں کا میرے ساتھ جہاد میں شریک نہ ہو پانا انھیں سخت ناگوار ہوگا اور میں ان کے لیے سواری نہ پاؤں گا تو میں راہ خدا میں حملہ کرنے والے کسی سریہ سے پیچھے نہ رہتا۔ خدائے پاک کی قسم میری دلی خواہش ہے کہ راہ خدا میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں۔

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لغدوۃ فی سبیل اللہ او روحۃ خیر من الدنیا وما فیھا۔ (متفق علیہ)

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جہاد فی سبیل اللہ میں ایک صبح یا ایک شام دنیا اور دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔

حدیث پاک میں جہاد کو اسلام کی بلند ترین چوٹی قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

من مات ولم یغز ولم یحدث بہ نفسہ مات علی شعبۃ من نفاق۔

(رواہ مسلم)

جس شخص کی موت اس طرح آئی کہ اس نے (زندگی بھر) نہ جہاد کیا، نہ اس کے دل میں جہاد کی آرزو پیدا ہوئی اس کی موت نفاق کی ایک خاص قسم پر ہوئی۔

جہاد اسلام کی سربلندی کا ذریعہ اور افضل ترین عمل ہے۔ امام احمدؒ نے فرمایا:
"مجھے نیکی کے کاموں میں کوئی ایسا کام نہیں معلوم ہے جو راہ خدا میں جہاد سے افضل ہو"
ایک بار امام احمدؒ کے سامنے جہاد کا ذکر کیا گیا تو آپ پر گریہ طاری ہو گیا اور آپ نے
فرمایا: کوئی نیک عمل اس سے بہتر نہیں ہے۔ (الشرح الکبیر مع المغنی ج۱۰ ص ۳۶۸)

جہاد کے بارے میں وحید الدین خاں صاحب کے خیالات:

جذبۂ جہاد مسلمانوں کے لیے قوت و شوکت کا عظیم ذخیرہ ہے، جس سے دشمنان اسلام ہمیشہ تھراتے ہیں اور اس جذبہ کو مسلمانوں کے دل و دماغ سے نکالنے کی سازشیں کرتے رہتے ہیں، تاریخ اسلام پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ تمام تر بے سر و سامانی کے باوجود مسلمانوں کے جذبۂ شہادت و جہاد نے بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں، اور اسلام کی روشن تاریخ تیار کی ہے، اسی لیے اعدائے اسلام کی طرف سے خود مسلمانوں میں ایسے لوگ کھڑے کیے گئے جنھوں نے جہاد کے خلاف ذہن سازی کی، مسلمانوں کے دل و دماغ سے جہاد کی عظمت اور تقدس ختم کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کیں، جہاد کے لیے ایسی خود ساختہ شرطیں بیان کیں جن کا یکجا وجود جوئے شیر لانے سے کم نہیں، ماضی قریب کی اس کی ایک نمایاں مثال غلام احمد قادیانی ہے۔ یہ شخص دعوتِ اسلام کے نام پر اٹھا، پادریوں سے مناظرے بھی کیے جس سے اس کی خاصی شہرت اور نیک نامی ہوئی۔ اس نے اپنی اس شہرت اور مقبولیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تدریجاً ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی، جہاد کی عظمت و اہمیت کم کرنے اور جہاد کو منسوخ کرنے کے لیے اس نے ہزاروں صفحات سیاہ کیے۔

جناب وحید الدین خاں صاحب کے بارے میں ابھی یہ دعویٰ تو محتاج ثبوت ہے کہ وہ بھی کسی مقصد کے لیے کھڑے کیے گئے ہیں، غیر مسلم اداروں اور دشمنِ اسلام تنظیموں کے ساتھ ان کے گہرے دوستانہ روابط "مصلحتِ دعوت" کا تقاضا ہو سکتے ہیں لیکن ان کی تحریروں کا پابندی سے مطالعہ کرنے والا محسوس کرتا ہے کہ خاں صاحب

شعوری یا غیر شعوری طور پر جہاد و شہادت کی اہمیت کم کر رہے ہیں۔ جہاد کے لیے ایسی خود ساختہ شرائط عائد کر رہے ہیں جس کی بنا پر زمانہ حال اور مستقبل قریب میں جہاد کا جواز مشکوک نظر آتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر گزشتہ چند صدیوں کی مجاہدانہ سرگرمیاں قابلِ تقلید و ستائش ہونے کے بجائے "سرکشی" اور احمقانہ چھلانگ" قرار پاتی ہیں۔ جہاد کے بارے میں خاں صاحب کے نظریات انہی کے الفاظ میں پڑھیے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ معلوم تاریخ میں پہلی بار آپ نے جنگ اور صلح کا صحیح انسانی اصول مقرر کیا اور اس پر خود عمل فرمایا۔ آپ نے جارحانہ جنگ کو مطلق طور پر ممنوع قرار دیا۔ آپ نے بتایا کہ جنگ صرف اس وقت کی جائے جب کہ دفاعی طور پر جنگ لڑنے کی ضرورت پیش آ جائے یعنی اپنی طرف سے کبھی جنگ میں پہل نہ کی جائے۔ البتہ اگر دوسرا فریق جارحیت کر دے تو اس سے بچاؤ کے لیے لڑا جا سکتا ہے۔ دوسرا ضروری اصول آپ نے یہ مقرر کیا کہ جنگ کے مقابلہ میں امن ہر حال میں بہتر اور مطلوب چیز ہے۔ اس لیے جنگ پیش آ جانے کی صورت میں بھی مسلسل امن کی تلاش جاری رکھی جائے۔ اور اگر فریق ثانی صلح پر آمادہ ہو تو فوراً جنگ کو ختم کر کے اس سے صلح کر لی جائے، خواہ یہ صلح خود فریق ثانی کی یک طرفہ شرط پر کیوں نہ ہو"۔

(الرسالہ فروری ۱۹۹۰ء ص ۲۸)

"اہلِ ایمان کو جنگ کی اجازت صرف اس وقت ہے جب کہ فریق مخالف کی طرف سے حملہ کا آغاز ہو چکا ہو۔ دوسرے یہ کہ جب اہل ایمان غلبہ پالیں تو اس کے بعد ماضی پر کسی کے لیے کوئی سزا نہیں۔ ہتھیار ڈالتے ہی ماضی کے جرائم معاف کر دیے جائیں گے۔ اس کے بعد سزا کا مستحق صرف وہ شخص ہوگا جو آئندہ کسی قابلِ سزا جرم کا ارتکاب کرے۔ عام حالات میں قتل کا حکم اور ہے اور جنگی حالات میں قتل کا حکم اور"۔ (تذکیر القرآن ج ۱ ص ۸۱)

"ایک صاحب نے کہا کہ آپ کی بہت سی باتوں سے مجھے اتفاق ہے۔ مگر آپ کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ مسلمانوں کو بس صبر و اعراض ہی کا سبق دیتے رہتے ہیں۔ حالانکہ اسلام میں سب سے بڑی چیز جہاد و قتال ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جہاد و قتال کو منسوخ ہی کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے جہاد کو منسوخ نہیں کیا ہے، بلکہ مشروط کیا ہے۔ آپ قرآن و سنت کی روشنی میں غور کیجئے، تو معلوم ہوگا کہ جہاد (بمعنی قتال) کچھ لازمی شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلی بات یہ کہ نزاع کو یک طرفہ طور پر اوائڈ کرتے ہوئے دعوت دینا اور اس وقت تک صبر و برداشت پر قائم رہنا جب تک دعوت پوری طور پر مدعو تک پہنچ نہ جائے۔ اس کے بعد مدعو سے علیحدگی جس کو ہجرت کہا گیا ہے (مدعو کے ساتھ مخلوط آبادی میں جہاد نہیں)۔ تیسری چیز یہ کہ قوت کی فراہمی، یہاں تک کہ وہ درجۂ ارہاب تک پہنچ جائے۔ چوتھی چیز ہے باہمی اختلاف کا خاتمہ، کیوں کہ مسلمانوں کے درمیان اگر اختلاف کی حالت ہو تو پیغمبر کی موجودگی میں بھی شکست ہو جائے گی، جیسا کہ احد کے موقع پر ہوا۔ میں نے کہا کہ یہ سب جہاد کی ناگزیر شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کی تکمیل کے بغیر جو جہاد کیا جائے وہ محض قومی لڑائی ہے نہ کہ اسلامی جہاد۔"

(الرسالہ اگست ۱۹۸۸ء ص ۲۹)

"اسلام میں جنگ بطور دفاع ہے۔ اسلام میں اصل چیز دعوت ہے، یعنی لوگوں کو پُر امن طور پر اور حکیمانہ انداز میں حق کی طرف بلانا۔ یہی اسلامی عمل کا آغاز ہے اور یہی اس کا اختتام بھی۔ تاہم اگر فریق ثانی جارحیت سے باز نہ آئے تو اس سے دفاعی جنگ کی جائے۔

مگر دفاعی جنگ کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس سے پہلے مسلمان نماز کو قائم کرنے والے بن جائیں۔ نماز کیا ہے؟ نماز ایک مکمل دینی تربیت ہے۔ نماز میں یہ ہوتا ہے کہ مؤذن پکارتا ہے: "آؤ فلاح کی طرف" اور تمام

مسلمان اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ وہ اپنے کو پاک صاف کرکے نماز میں داخل ہوتے ہیں۔ نماز میں وہ بار بار اللہ اکبر کہہ کر، اللہ کے بڑے ہونے اور اس کے مقابلہ میں اپنے چھوٹے ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ تمام مسلمان صف بستہ ہوکر صرف ایک امام کے پیچھے نماز ادا کرتے ہیں۔ کوئی ایک شخص بھی اِدھر اُدھر منتشر نہیں ہوتا۔ نماز ختم ہونے کے بعد تمام نمازی دائیں بائیں رُخ کرکے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہیں۔ اس طرح وہ ظاہر کرتے ہیں کہ دوسرے انسانوں کے لیے ان کے اندر خیر خواہی کا جذبہ اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ ان کے لیے اللہ سے دعا کرنے والے بن گئے ہیں۔

یہی وہ نماز ہے جس کی اقامت کو جہاد سے پہلے لازم قرار دیا گیا ہے۔ مسلمان جب تک ان معنوں میں نماز کو قائم کرنے والے نہ بن چکے ہوں ان کے لیے جہاد و مقابلہ کے لیے نکلنا جائز نہیں۔ اس تربیتی کورس سے پوری طرح گزرنے سے پہلے صرف صبر کرنا ہے، فریق ثانی خواہ کتنا ہی ظلم کرے انھیں یک طرفہ طور پر صرف صبر و برداشت کے رویہ پر قائم رہنا ہے۔ مسلمان اس نماز پر اپنے آپ کو پوری طرح قائم کرلینے سے پہلے جہاد کی باتیں کریں تو وہ سراسر باطل ہے۔ اس کا خدا اور رسول کے طریقے سے کوئی تعلق نہیں۔ خدا نے جہاد کا جو طریقہ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے پہلے پورے اہتمام کے ساتھ نماز قائم کی جائے۔ ایسی حالت میں جو لوگ نماز کی اقامت کے بغیر جہاد کی اقامت کا نعرہ لگائیں وہ بلاشبہ غلطی پر ہیں۔ وہ لوگوں کو ایک ایسے دین کی طرف بلا رہے ہیں جس کو انھوں نے خود گھڑا ہے، اور جو دین خود گھڑا جائے وہ یقینی طور پر صرف آدمی کی بربادی میں اضافہ کرے گا، وہ کسی حال میں آدمی کی کامیابی اور ترقی کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

(الرسالہ جون ۱۹۹۳ء ص ۱۰)

کیا جہاد محض دفاعی عمل ہے؟

انیسویں اور بیسویں صدی میں بہت سے مغربی مصنفین نے اسلام کے نظریۂ جہاد کو نشانہ بنایا، انھوں نے نظریۂ جہاد کی آڑ میں اسلام کو خونخوار اور دہشت گرد مذہب ثابت کرنے کی کوشش کی، مغربی مصنفین کے مسلسل پروپگنڈے سے مرعوب ہو کر بعض مسلم مصنفین نے جہاد کو محض دفاعی عمل قرار دینے کا نظریہ ایجاد کیا، اور اسے ثابت کرنے کے لیے آیات واحادیث کی رکیک تاویلات کیں، غزوات نبوی کی خود ساختہ تشریحات کیں، محمد عبدہٗ اور سرسید کے یہاں جہاد اسلامی کی دفاعی تعبیر پوری وضاحت کے ساتھ ملتی ہے، لیکن جہاد کے موضوع پر عربی، اردو دونوں زبانوں میں ایسی متعدد بلند پایہ محققانہ تحریریں آچکی ہیں جن میں ثابت کیا گیا ہے کہ جہاد کو محض دفاعی عمل کہنا بے شمار آیات واحادیث سے متعارض ہے اور غزوات نبوی کا سرسری مطالعہ ہی اس نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ تاریخ اسلام کا سب سے اولین غزوہ یعنی غزوۂ بدر دفاعی نہیں تھا بلکہ اقدامی تھا، اقدام مسلمانوں کی طرف سے ہوا تھا، قریش کے تجارتی قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے مسلمانوں کی طرف سے پیش قدمی ہوئی تھی، اسی کی خبر پاکر کفار مکہ کی فوج تجارتی قافلے کی حفاظت کے لیے مدینہ کی طرف روانہ ہوئی اور غزوۂ بدر کا واقعہ پیش آیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر غزوات اقدامی تھے، عہد خلفاء راشدین اور عہد بنوامیہ میں پیش آنے والے واقعات جہاد اور جنگی مہمیں بھی اقدامی نوعیت کی تھیں، محض دفاع کے لیے جہاد کو جائز کہنے والوں کے نزدیک اسلامی تاریخ کی کم از کم نوے فیصد جنگیں نہ صرف جہاد کے دائرے سے خارج ہیں بلکہ سراسر باطل اور فساد فی الارض ہیں۔

وحید الدین خاں صاحب کی شرائط جہاد پر ایک نظر:

دفاعی جہاد کے لیے خاں صاحب نے جو شرطیں اپنی مختلف تحریروں میں

بیان کی ہیں ان میں سے بیشتر موصوف کے "زرخیز" ذہن کی پیداوار ہیں، ان شرطوں کو قرآن وسنت میں اور مفسرین، محدثین، فقہاء کی تحریروں میں تلاش کرنا فعل عبث ہے، ان شرطوں کا باطل اور بے اصل ہونا اتنا واضح ہے کہ اس کی نقاب کشائی کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاد کے لیے ہجرت کی شرط سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ خاں صاحب کا نظریہ ہے کہ مدعو کے ساتھ مخلوط آبادی میں جہاد نہیں، موصوف ہی بتا سکتے ہیں کہ بنو قریظہ (مدینہ میں رہنے والا یہود کا ایک قبیلہ) سے جہاد کرنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ سے ہجرت کیوں نہیں فرمائی اور مدعو کے ساتھ مخلوط آبادی میں جہاد کیوں کیا؟ جہاد کے لیے اقامت نماز کے مکمل تربیتی کورس کی شرط موصوف کی قرآن فہمی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اس سلسلے میں جناب وحید الدین خاں صاحب کی دلیل قرآن پاک کی یہ آیت ہے:

ألم تر الی الذین قیل	کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا
لهم کفوا أیدیکم واقیموا	جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں
الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ۔	کو روکو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ
(سورۂ نساء۔ ۷۷)	ادا کرو۔

خاں صاحب نے آیت کے جو الفاظ درج کیے ہیں وہ پوری آیت نہیں بلکہ آیت کا ایک ٹکڑا ہے ـــــ اگر موصوف نے پوری آیت نقل کر دی ہوتی تو ان کی خود ساختہ شرط کا محل خود بخود مسمار ہو جاتا، جیسا کہ آئندہ واضح ہوگا۔ خاں صاحب کے نقل کردہ آیت کے ٹکڑے میں اگر "أقیموا الصلوٰۃ" کے اندر (خاں صاحب کے بقول) دفاعی جنگ کی ایک شرط بیان کی گئی ہے تو خاں صاحب کو کہنا چاہیے کہ "اٰتوا الزکوٰۃ" (زکوٰۃ ادا کرو) میں دفاعی جنگ کی دوسری شرط بیان کی گئی ہے۔ خدا جانے کیوں خاں صاحب نے "ادائیگی زکوٰۃ" کو دوسرا "تربیتی کورس" قرار دے کر اسے دفاعی جنگ کی دوسری شرط نہیں قرار دیا، حالانکہ "اٰتوا الزکوٰۃ" "اقیموا الصلوٰۃ" پر عطف ہے اور عربی گرامر کے اعتبار سے معطوف علیہ اور معطوف کا حکم یکساں ہوتا

ہوتا ہے۔ ذیل میں پوری آیت اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے قلم سے اس کا ترجمہ اور تشریح درج کی جاتی ہے اس سے خاں صاحب کے شرط کی حیثیت واضح ہو جائے گی۔

"الم تر الی الذین قیل لھم کفوا أیدیکم واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ فلما کتب علیھم القتال اذا فریق منھم یخشون الناس کخشیۃ اللّٰہ او اشد خشیۃ ج وقالوا ربنا لم کتبت علینا القتال لولا اخرتنا الی اجل قریب قل متاع الدنیا قلیل والآخرۃ خیر لمن اتقی ولا تظلمون فتیلا"

"(اے مخاطب!) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (قبل نزول حکم جہاد تو جنگ کرنے کا ایسا تقاضا تھا کہ) ان کو (منع کرنے کے لیے) یہ کہا گیا تھا کہ (ابھی) اپنے ہاتھوں کو (لڑنے سے) روکے رہو اور (جو جو حکم تم کو ہو چکے ہیں اس میں لگے رہو مثلاً) نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو (یا تو یہ حالت تھی اور یا) پھر ان پر جہاد کرنا فرض کر دیا گیا تو کیا حال ہوا کہ ان میں سے بعض بعض آدمی (مخالف) لوگوں سے (طبعاً) ایسا ڈرنے لگے (کہ ہم کو قتل کر دیں گے) جیسا (کوئی) اللہ سے ڈرتا ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ ڈرنا (زیادہ ڈرنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اکثر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا عقلاً ہوتا ہے اور دشمن کا ڈر طبعی ہے اور قاعدہ ہے کہ طبعی حالت عقلی حالت سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ خدا تعالیٰ سے جیسا خوف ہے ویسی امید رحمت بھی تو ہے اور کافر دشمن سے تو ضرر کا خوف ہی خوف ہے اور چونکہ یہ خوف طبعی تھا اس لیے گناہ نہیں ہوا، اور زیادہ حکم قتال کو ملتوی کرنے کی تمنا میں) یوں کہنے لگے (خواہ زبان سے یا دل سے اور خدا تعالیٰ کے علم میں قول نفسی قول لسانی کے برابر ہے) کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے ابھی سے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا، ہم کو (اپنی عنایت سے) اور تھوڑی مدت مہلت دے دی ہوتی (ذرا بے فکری سے اپنی ضروریات پوری

کر لیتے اور چونکہ یہ عرض کرنا بطور اعتراض یا انکار کے نہ تھا، اس لیے گناہ نہیں ہوا: آگے جواب ارشاد ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرمائیے کہ دنیا سے فائدہ اٹھانا (جس کے لیے تم مہلت کی تمنا کرتے ہو) محض چند روزہ ہے اور آخرت (جس کے حصول کا اعلیٰ ذریعہ جہاد ہے) ہر طرح سے بہتر ہے (مگر وہ) اس شخص کے لیے (ہے) جو اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچے (کیونکہ اگر کفر کے طور پر مخالفت کی تب تو اس کے سامان آخرت کچھ بھی نہیں اور اگر معصیت کا مرتکب ہوا تو اعلیٰ درجہ سے محروم رہے گا) اور تم پر ذرا بھی ظلم نہ کیا جائے گا (یعنی جتنے اعمال ہوں گے ان کا پورا پورا ثواب ملے گا، پھر جہاد جیسے عمل کے ثواب سے کیوں خالی رہتے ہو۔)"

(معارف القرآن جلد دوم ص ۴۷۹، ۴۸۰)

عہد حاضر اور جہاد:

جناب وحید الدین خاں صاحب نے جہاد کو دفاعی جہاد میں محدود کرنے کے ساتھ اس کے جواز کے لیے جو خود ساختہ شرطیں بیان کی ہیں ان کا مقصد عملاً جہاد کو منسوخ کرنا اور مسلمانوں کے دل و دماغ سے جہاد کا خیال محو کر دینا ہے' خاں صاحب کے نزدیک صدیوں سے جہاد کا وجود نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کی دعوت پر مرہٹوں سے احمد شاہ ابدالی کی جنگ' سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد' ۱۸۵۷ء میں شاملی وغیرہ میں انگریزوں کے خلاف مجاہدین اسلام کی معرکہ آرائی ان میں سے کوئی چیز خاں صاحب کے نزدیک اسلامی جہاد نہیں بلکہ "سرکشی" اور "احمقانہ چھلانگیں تھیں" افغانستان کا جہاد بھی خاں صاحب کی نظر میں جہاد نہیں بلکہ قومی معرکہ آرائی ہے ـــ موصوف کی بعض تحریریں یہ تاثر دیتی ہیں کہ قرآن و سنت کی روشنی میں دور حاضر میں جہاد بمعنی قتال کی ضرورت نہیں ہے۔ جناب وحید الدین خاں صاحب نے ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس روایت کی ذیلی تفصیلات سے ہٹ کر اس کے اصل مدعا کو دیکھئے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آئندہ ایسا زمانہ آئے گا جب لا الہ الا اللہ کہہ دینے سے فتح حاصل ہوگی، بالفاظ دیگر ہتھیار کو استعمال کرنے کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ اسلام کی فکری اور نظریاتی طاقت ہی قوموں کو مسخر کرنے کے لیے کافی ہوگی۔" (الرسالہ مئی ۱۹۸۰ء ص ۱۲)

اپنی کتاب احیاء اسلام میں لکھتے ہیں: موجودہ زمانہ میں کرنے کا اصل کام یہی ہے کہ ملحدانہ طرز فکر کو مغلوب کیا جائے تاکہ توحید اپنا غلبہ کا مقام دوبارہ حاصل کرسکے۔ اللہ تعالیٰ کو یقیناً معلوم تھا کہ آئندہ دور الحاد آنے والا ہے اس لیے اس کی نصرت دوبارہ متحرک ہوئی، پچھلے ہزار سالہ عمل کے دوران اس نے ایسے حالات پیدا کرنے شروع کیے جو بالآخر دعوت توحید کے معاون بن سکیں۔ یہ عمل اب اپنی تکمیل کے آخری مرحلہ میں پہنچ گیا ہے، آج اگرچہ بظاہر الحاد کا فکری غلبہ ہے مگر وہ حالات پوری طرح پیدا ہو چکے ہیں جن کو استعمال کرکے دوبارہ توحید کو فکری غلبہ کا مقام دیا جاسکے۔ پہلے مرحلہ میں غلبۂ توحید کا کام دعوت کے بعد طاقت کے ذریعہ انجام پایا قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ (البقرہ۔ ۱۹۳) بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق (الانبیاء۔ ۱۸) مگر دوسرے مرحلہ میں یہ کام تبیین و تبلیغ کے ذریعہ انجام پانا ہے جیسا کہ قرآن کے اشارہ سے معلوم ہوتا ہے: سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق اولم یکف بربک انہ علی کل شیئ شھید (ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے دنیا میں بھی اور ان کے اندر بھی، یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ قرآن بالکل حق ہے، کیا تیرے رب کا ہر بات پر شاہد ہونا کافی نہیں)۔ (ص ۱۰۲)

نفاذ اسلام کے لیے جہاد وحیدالدین خاں کی نظر میں:

اسلام کے کامل نفاذ کے لیے ملک کے اقتدار کی تبدیلی کی جدوجہد نہ صرف جائز

ہے بلکہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلے میں جناب وحید الدین خاں نے متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے ان کی پراگندہ ذہنی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جولائی ۱۹۷۹ء کے "الرسالہ" میں لکھتے ہیں:

"بعض لوگوں کے نزدیک جہاد یہ ہے کہ وقت کے حکمرانوں سے لڑکران سے "اقتدار کی کنجیاں" چھین جائیں تاکہ اسلام کو ایک مکمل ریاستی نظام کی حیثیت سے زمین پر نافذ کیا جاسکے۔ مگر اس قسم کے نظریہ کا کوئی تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ جہاد سے۔ قرآن و حدیث کے پورے ذخیرہ میں کوئی ایک نص بھی ایسی موجود نہیں ہے جس سے اس انقلابی جہاد کا حکم نکلتا ہو۔ قرآن کے مطابق اللہ کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ آدمی ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرلیتا ہے تو بطور انعام اس کو زمین کا اقتدار بھی دے دیا جاتا ہے (نور۔ ۵۵) مگر یہ نظریہ اپنے حصہ کا کام چھوڑ کر خدا کے حصہ کا کام انجام دینا چاہتا ہے۔" (ص ۲۳)

'الرسالہ' مارچ ۱۹۸۰ء کے شمارہ میں جناب وحید الدین خاں صاحب لکھتے ہیں:

"ملک کا اقتدار اگر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جن سے یہ امید نہ ہو کہ وہ مجرم کے اوپر شرعی سزا کا نفاذ کریں گے تب بھی مسلمانوں کے لیے قانون اپنے ہاتھ میں لینا جائز نہیں۔ ایسے ماحول میں مسلمانوں کے لیے نصیحت و صبر ہے نہ کہ سزا کا نفاذ۔ یہ اصول مکی دور کے عمل سے ثابت رہے۔ اس وقت مکہ کے لوگ کھلے طور پر شراب پیتے تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے اصحاب نے ان پر حد جاری کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ حد کا نفاذ اقتدار ملنے کے بعد کیا گیا۔" (ص ۱۳)

اس دوسرے اقتباس میں غیر معمولی دلچسپ چیز خاں صاحب کا یہ استدلال ہے کہ مکہ والے کھلے طور پر شراب پیتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر حد جاری کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ حد کا نفاذ اقتدار ملنے کے بعد کیا گیا۔

وحید الدین خاں صاحب کے ذہن سے غالباً یہ بات غائب ہو گئی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور میں شراب کی حرمت کے بارے میں کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، شراب نوشی کی سزا تو دور کی بات ہے، شراب کی حرمت کے بارے میں تمام آیتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ شراب نوشی کی قطعی حرمت کا حکم سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۹۰ میں وارد ہوا، اور سورۂ مائدہ مدنی سورت ہے بلکہ مدینہ میں نازل ہونے والی آخری سورتوں میں سے ہے۔ حدیث و تفسیر کے طلبہ بھی ان روایات سے آگاہ ہیں کہ مدینہ میں شراب کی قطعی حرمت نازل ہونے کے بعد اس روز مدینہ میں شراب اس طرح بہہ رہی تھی جیسے بارش کے رُو کا پانی، اتنی کثرت سے شراب مدینہ کی گلیوں میں بہائی گئی کہ جب بارش ہوتی تو شراب کی بُو اور رنگ مٹی میں نظر آتا تھا۔ جب یہ بات واضح ہو چکی کہ شراب کی قطعی حرمت ہجرت کے کافی عرصہ بعد نازل ہوئی تو اس کا کیا سوال اٹھتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب مکہ میں شراب پینے والوں پر سزا جاری کرنے کی کوشش کرتے۔ اگر وحید الدین خاں صاحب نے کسی دینی مدرسہ میں مکمل تعلیم حاصل کی ہوتی تو وہ اتنی موٹی اور معروف بات سے بے خبر نہ ہوتے اور ان سے استدلال میں اتنی بھیانک غلطی نہ ہوتی۔

بہرحال اس ضمنی بحث سے قطع نظر خاں صاحب کے مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی احکام کے مکمل نفاذ کے لیے اقتدار میں تبدیلی کے لیے جدوجہد جائز ہی نہیں، ان کے فہم کے مطابق اس انقلابی جہاد کا حکم کسی نص سے نہیں نکلتا لیکن موصوف نے اپنی بعض دوسری تحریروں میں اقتدار میں تبدیلی کی جدوجہد کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیا ہے۔ جناب وحید الدین خاں صاحب نے ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ کے جولائی ۱۹۶۲ء کے شمارے میں "دینی دعوت ہندوستان میں" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، اس مضمون میں موصوف لکھتے ہیں:

> "جہاں تک غیر اسلامی اقتدار میں تغیر کے لیے جدوجہد کا سوال ہے تو یہ مسلم علاقے میں تو فرض علی الکفایہ کے درجہ میں مطلوب ہے، مگر غیر مسلم علاقے میں اس کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ غیر مسلم علاقے میں شرعی نصب العین کے طور پر ہمارا یہ فریضہ نہیں ہے کہ وہاں ہم لازمی طور پر اسلامی حکومت

برپا کرنے کی جدوجہد کریں۔ مگر شرعی فریضہ نہ ہونے کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ حکومت و اقتدار ہر فکر اور ہر عقیدہ کے لیے ایک اہم ترین عنصر ہے۔ حکومت کا مسلمان ہونا ہر پہلو سے دین اور اہل دین کے لیے اپنے اندر بے شمار فوائد رکھتا ہے اور اس اعتبار سے وہ یقینی طور پر اہل ایمان کی ایک پسندیدہ چیز (اخریٰ تحبونہا) ہے اور اگر حالات اور مواقع موجود ہوں تو یقیناً یہ جدوجہد بھی ہونی چاہیے کہ اقتدار بدلے اور اسلامی نظام حکومت کا قیام عمل میں آئے۔ اس طرح کی مہم میں حصہ لینا عین جہاد ہے اور اس کی راہ میں جان قربان کرنا یقینی طور پر شہادت کا درجہ پانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مسلم علاقے میں اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد کا مسئلہ ایک نظریاتی مسئلہ ہے یعنی وہ عقیدے کے براہ راست تقاضے کے طور پر پیدا ہوتا ہے، جب کہ غیر مسلم علاقے میں اسلامی اقتدار لانے کی کوشش ایک عملی سوال ہے، جس کا شامل پروگرام ہونا حالات پر موقوف ہے نہ کہ عقیدے اور نظریے پر۔

(الفرقان لکھنؤ جولائی ۱۹۹۳ء ص ۵۲)

جہاد کے بارے میں کچھ اور خیالات:

جناب وحید الدین خاں صاحب نے اپنے ماہنامہ 'الرسالہ' میں ایک مضمون شائع کیا جس کا عنوان ہے: "اسلام: دور شمشیر کا خاتمہ، دور دعوت کا آغاز"۔
یہ مضمون 'الرسالہ' کے آٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس کے جستہ جستہ اقتباسات یہاں نقل کیے جارہے ہیں، ابتدا میں قوم لوط کی ہلاکت کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یہی معاملہ تمام نبیوں کے منکرین و مخالفین کے ساتھ پیش آیا۔ اتمام حجت کے بعد کوئی قوم موجودہ دنیا میں بود و باش کے حق سے محروم ہوجاتی ہے، اس لیے فرشتوں یا خود اہل ایمان کے ذریعہ اس دنیا سے

اس کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ پیغمبر آخر الزماں کے مخالفین بھی آپ کا انکار کرنے اور آپ کو آپ کے وطن سے نکال دینے کے بعد اس خدائی سزا کے مستحق ہو گئے تھے (اسراء۔ ۷۷) چنانچہ انھیں بھی یہ سزا دی گئی۔ البتہ اس کی صورت بدلی ہوئی تھی۔ دیگر انبیاء کے ساتھیوں کی تعداد چونکہ بہت کم تھی، اس لیے ان کے مخالفین کو ہلاک کرنے کے لیے زلزلہ اور طوفان آئے۔ (عنکبوت۔ ۴۰) مگر نبی آخر الزماں کے ساتھ حمایت کرنے والوں کی بھی معقول تعداد ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے خود آپ کے ساتھیوں کی تلوار کو آپ کے مخالفین کی ہلاکت کے لیے استعمال کیا (قاتلوھم یعذبھم اللّٰہ بأیدیکم) بدر کی قتل گاہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ٹھیک ویسی ہی تھی جیسا عاد و ثمود کے برباد شدہ مساکن۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تلوار پیغمبر اسلام کے مشن کا اضافی جزء تھی نہ کہ حقیقی جزء۔ وہ شکلاً دفاعی جنگ اور حقیقتہً خدائی سزا کے طور پر ظاہر ہوئی، جیسے پچھلی قوموں پر آنے والا عذاب شکلاً زلزلہ یا طوفان تھا اور حقیقتہً ایک منکر قوم پر خدا کی سزا۔ مگر بعد کے دور میں اسلام کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں عام رواج کے اثر سے "تلوار" کے واقعات بہت زیادہ نمایاں ہو گئے۔ لوگوں کو اسلام کی تاریخ تلوار کی تاریخ نظر آنے لگی حتی کہ خود مسلمان بھی شمشیری کارنامے دکھلانے کو سب سے بڑا جہاد سمجھنے لگے۔

بعد کے دور میں اسلام کے ساتھ جو المیے پیش آئے، ان میں یہ المیہ سر فہرست ہے کہ دین رحمت دین شمشیر بن گیا۔ اسلام جن مقاصد کے لیے آیا، ان میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انسانوں کے درمیان جنگ و جدل کو ختم کر کے سمجھنے اور سمجھانے کے طریقے کو رائج کرے (نمل۔ ۲۹) طاقت کی منطق کی جگہ عقل و خرد کی منطق کو اونچا مقام دے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام دور تلوار کا خاتمہ اور دور دعوت کا آغاز تھا۔ قرآن میں یہ حکم کہ قرآن کے

ذریعہ جہاد کبیر کرو (فرقان) گویا اس بات کا اعلان تھا کہ پیغمبر اسلام کی بعثت سے تاریخ انسانی میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جو کہ نظریۂ شمشیر وسنان کا بدل ہوگا نظریاتی طاقت سے فتوحات حاصل ہوا کریں گی۔"

(الرسالہ جنوری ۱۹۷۶ء ص ۲۵)

"مسلمانوں کے اندر بعد کے زمانے میں یہ جو ذہن پیدا ہوا کہ وہ سیاسی اقتدار سے ٹکرانے اور شمشیری کمال دکھانے کو جہاد سمجھنے لگے، اس کی ایک وجہ اور تھی۔ اور وہ وہی فتنہ تھا جس میں اکثر پچھلی امتیں مبتلا ہوئی ہیں سلیمان بن داؤد (۹۳۷ - ۹۷۷ ق م) یہودیوں کے ایک جلیل القدر پیغمبر تھے، آپ کی حکومت شام وفلسطین کے علاوہ مشرق میں فرات کے ساحل تک اور مغرب میں سرحد مصر تک پھیلی ہوئی تھی، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان کو بعض غیر معمولی معجزے دیے گئے تھے، ہوا ان کے لیے مسخر تھی، وہ جانوروں کی بولیاں سمجھ سکتے تھے (نمل) معدنیات پر انھیں قدرت حاصل تھی، جنات ان کے تابع کر دیے گئے تھے (ص، سبا) اسی قسم کے ایک جن نے ملکۂ سبا کا تخت پلک جھپکتے میں یمن سے لاکر فلسطین میں رکھ دیا تھا۔ (نمل)۔

حضرت سلیمان کی وفات کے بعد ان کی یہ خصوصیات یہود کے لیے فتنہ بن گئیں۔ اپنے "قومی بزرگ" کی تقلید میں انھوں نے کوشش شروع کر دی کہ وہ بھی اس قسم کے کمالات اپنے اندر پیدا کریں۔ انھوں نے بطور خود کچھ کراماتی فنون ایجاد کر لیے اور ان کو حضرت سلیمان کی طرف منسوب کر دیا۔۔۔۔

پیروان اسلام کے پاس فتنہ میں پڑنے کے لیے حضرت سلیمان جیسے معجزات وکرامات نہ تھے۔ آپ کی امتیازی خصوصیت ظاہری طور پر دیکھنے والوں کے لیے فتوحات اور سیاسی انقلابات تھے۔ بعد کے زمانہ میں اسلام کے پیروؤں کے لیے یہی چیز فتنہ بن گئی۔ وہ آپ کی زندگی کے سیاسی پہلو کو آپ کے مشن سے الگ کر کے نہ دیکھ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ پیغمبر عربی اقتدار وقت

سے ٹکرانے اور سیاسی معجزات دکھانے کے لیے آئے تھے۔ اس لیے انھیں بھی تلوار زنی اور سیاست رانی کے جوہر دکھانے چاہئیں۔"

(الرسالہ جنوری ۱۹۹۳ء ص ۲۶، ۲۷)

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے اپنے اس مضمون میں بے ضرورت دعوت اور جہاد کو ٹکرانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ جہاد دعوت کی ایک اہم قسم ہے۔ بعد کی اسلامی فتوحات کو چھوڑیے جن لوگوں کی عہدِ نبوی کے غزوات اور دورِ خلفاءِ راشدین کی فتوحات پر نظر ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ان تمام غزوات و فتوحات کو دفاعی کہنا تاریخی حقائق کو تحریف زدہ کرنا ہے۔ کیا نعوذ باللہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خلفاءِ راشدین اور صحابۂ کرام وحیدالدین خاں صاحب کے بیان کردہ "فتنہ" میں مبتلا ہو کر تلوار زنی اور سیاست رانی کے جوہر دکھانے میں لگ گئے؟ اسلام میں جہاد ایسا عمل نہیں ہے جو عہدِ نبوی کے ساتھ مخصوص تھا، جہاد کے سلسلے کی آیات اور کتبِ حدیث میں کتاب الجہاد کے تحت مذکور احادیث کا سرسری مطالعہ کرنے سے بھی یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ جہاد کی فضیلت و فرضیت قیامت تک کے لیے ہے اور جہاد بلند ترین اسلامی عمل ہے۔

طعن اور استہزاء کے پیرایے میں جہاد کا ذکر:

جناب وحیدالدین خاں صاحب کے دل و دماغ میں جہاد کا منفی تصور بسا ہوا ہے اس لیے اسلامی تاریخ کی تمام مجاہدانہ سرگرمیاں انھیں بے وقعت نظر آتی ہیں، اور ان سرگرمیوں کا تذکرہ موصوف نے توہین آمیز انداز میں کیا ہے۔ تاتاریوں کے خلاف شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا جہاد ان کے عظیم کارناموں میں شمار ہوتا ہے، حافظ ابن تیمیہ ہی کی تلقین و ترغیب پر سلطانِ مصر (جو شام کا بھی حکمراں تھا) تاتاریوں کا مقابلہ کرنے اور شام کی تاتاریوں سے حفاظت کرنے پر آمادہ ہوا، اور بالآخر تاتاریوں کے مقابلہ میں سلطانِ مصر کو فتح ہوئی اور مصر و شام تاتاریوں کی غارت گری سے

محفوظ رہے لیکن حافظ ابن تیمیہؒ کے اس عظیم مجاہدانہ کارنامہ کا ذکر جناب وحیدالدین خاں صاحب کے الفاظ میں پڑھیے :

"تاتاریوں کا یہ قیامت خیز واقعہ امام تقی الدین ابن تیمیہ (۶۲۸-۶۶۱ھ) کے زمانہ میں ہوا۔ اسلام کی عظمت کو لٹتا ہوا دیکھ کر انھیں جوش آیا۔ امام ابن تیمیہ مجاہدانہ جذبہ کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے شام و مصر کے مسلمانوں کو یہ نعرہ دیا کہ جنگ کا علاج جنگ ہے (الحرب انفی للحرب) ۷۰۲ھ میں مصر کے سلطان الناصر کے ساتھ تاتاریوں سے جنگ کے لیے نکلے۔ ابتدائی طور پر انھیں تاتاریوں کے ایک دستہ کے مقابلہ میں کچھ فوجی کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر بالآخر تاتاری غالب رہے، اور امام ابن تیمیہ کچھ دن دمشق کے قلعہ میں اور کچھ دن تدریس و تصنیف میں زندگی گزار کر اس دنیا سے چلے گئے۔"

(احیاء اسلام، ص ۷۴)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"جہاد قیامت تک جاری رہے گا، نہ تو امت کے فسق و فجور کے سبب معطل کیا جائے گا اور نہ امت کے عدل و انصاف اور دینداری کے سبب موقوف کیا جائے گا، یہاں تک کہ میرا آخری امتی دجال سے جہاد کرے۔"

(کنز العمال جلد رابع، کتاب الجہاد)

عملی حکمت کا فلسفہ

نسخ اسلامی شریعت کی ایک اصطلاح ہے۔ نسخ کے موضوع پر قرآن پاک میں ایک مستقل آیت ہے۔ ناسخ و منسوخ کو ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل ہے جس کے بارے میں متعدد تصنیفات مختلف مصنفین کی پائی جاتی ہیں۔ نسخ کا اصطلاحی اور شرعی مفہوم اہلِ علم پر واضح ہے۔ اس اصطلاح کے بارے میں متقدمین اور متاخرین میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ متاخرین کے یہاں قرآن پاک یا حدیث نبوی میں مذکور کسی حکم کو دوسری آیت یا حدیث سے ختم کرنے کا نام نسخ ہے، لیکن متقدمین کے یہاں نسخ کی اصطلاح اس سے کہیں زیادہ عام ہے۔ ان کے یہاں کسی آیت یا کسی حدیث میں کوئی معمولی تبدیلی (مثلاً کوئی قید بڑھانا) بھی نسخ کہلاتی ہے۔ جناب وحیدالدین خاں صاحب نے ہر موضوع پر سب سے علاحدہ رائے قائم کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے اس لیے انھوں نے نسخ کے بارے میں بھی اپنی پوری قابلیت اور انفرادیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے اس معروف نسخ کا انکار کیا ہے جسے محدثین اور فقہاء بیان کرتے ہیں۔ اس اصطلاحی نسخ کا انکار اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں بعض معتزلہ نے کیا تھا۔

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے "الرسالہ" جنوری ۱۹۸۶ء کے شمارہ میں "حکمت اسلام" کے عنوان سے چھ صفحات کا ایک مضمون لکھا ہے، اور اسی شمارہ میں نسخ کی حقیقت کے عنوان سے بھی چار صفحات کا مضمون شامل اشاعت ہے۔

ان دونوں مضامین میں موصوف نے نہ صرف یہ کہ اصطلاحی نسخ پر خطِ نسخ پھیرا ہے بلکہ خود ساختہ نسخ کے ہتھیار سے بہت سے بڑوں کی گردن ناپی ہے ہم یہاں "حکمت اسلام" سے کچھ اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

مضمون کے شروع میں وحید الدین خاں صاحب نے حضرت علیؓ کا ایک اثر نقل کیا ہے، جس کا ترجمہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

> "حضرت ابو عبدالرحمٰن عبداللہ ابن حبیب السلمی تابعی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ ایک شخص کے پاس سے گزرے جو لوگوں کو جمع کرکے تقریر کررہا تھا۔ انھوں نے اس سے کہا کیا تم جانتے ہو کہ منسوخ کیا ہے اور ناسخ کیا ہے؟ مقرر نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا تم خود بھی ہلاک ہوئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔"

حضرت علیؓ کا یہ اثر نقل کرنے کے بعد وحید الدین خاں صاحب لکھتے ہیں:

> "عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ناسخ اور منسوخ کا تعلق چند مخصوص احکام سے ہے اور وہ ابدی ہے۔ مثلاً ہجرت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد سورۂ بقرہ (رکوع ۱۷) کی آیات اُتریں اور پچھلا حکم منسوخ ہوگیا اور کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا اسی طرح عام خیال یہ ہے کہ نسخ کے جو احکام ہیں وہ ابدی ہیں، جو چیز منسوخ ہے وہ ہمیشہ کے لیے منسوخ ہے اور جو چیز ناسخ ہے وہ ہمیشہ کے لیے ناسخ ہے۔
>
> مگر یہ خیال درست نہیں ہے۔ ناسخ اور منسوخ کا معاملہ نہ تو چند احکام سے متعلق ہے اور نہ وہ غیر مبدل ہے۔ ناسخ اور منسوخ ایک مستقل شرعی اصول ہے۔ اس کا تعلق اس اہم چیز سے ہے جس کو عملی حکمت (Practical wisdom) کہا جاتا ہے، اور وہ پورے دین سے

متعلق ہے نہ کہ چند احکام سے متعلق۔ اس اصول کے تحت کبھی ایک حکم میں تدریج کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جیسا کہ شراب کے معاملہ میں کیا گیا۔ چنانچہ شراب کو تین مرحلہ میں حرام قرار دیا گیا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حالات کی رعایت سے ایک طرح کا حکم مطلوب ہوتا ہے اور کبھی بدلے حالات کے اعتبار سے دوسرا حکم مطلوب ہو جاتا ہے۔

حضرت علیؓ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ داعی کو یہ فریضہ انجام دینا ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے تقاضوں کو وقت کے عملی حالات پر منطبق کرے۔ وہ لوگوں کو عین تقاضائے وقت کے مطابق صحیح دینی مشورہ دے۔ اب جو شخص ناسخ و منسوخ بہ الفاظ دیگر دین کی عملی حکمتوں اور مصلحتوں کو جانے گا وہی شخص لوگوں کو صحیح رہنمائی دے سکتا ہے۔ جو شخص دین کے حکیمانہ پہلو کو نہ جانے وہ دین کے نام پر بے دینی کی بات کرے گا وہ لوگوں کو غلط راہوں میں دوڑانا شروع کر دے گا . . . .

جو شخص دعوت و اصلاح کے کام کے لیے اٹھے اس کو ناسخ و منسوخ کے اس شرعی حکم سے باخبر ہونا چاہیے۔ اس کو اس حکمت بالغہ کو اچھی طرح جاننا چاہیے جس کے تحت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک طرح کے حالات میں ایک طریقہ اختیار فرمایا، اور دوسری طرح کے حالات میں اس کو چھوڑ کر دوسرے طریقہ پر عمل کیا۔ جو شخص اس راز سے واقف نہ ہو اور اس کے باوجود وہ خطیب اور قائد بن کر کھڑا ہو جائے وہ اسلام کے نام پر صرف بگاڑ پیدا کرے گا۔ مثلاً وہ لوگوں کو ایک مسلم حکمراں سے ٹکراؤ پر ابھارے گا جب کہ اسلام کا حقیقی تقاضا اس وقت یہ ہوگا کہ سیاسی ٹکراؤ سے الگ رہ کر کام کیا جائے۔ وہ ایک مسلم گروہ کو یہ مشورہ دے گا کہ وہ اپنے حریف قوم کو نقصان پہونچا کر اس سے اپنے لیے زندگی کا حق وصول کریں جب کہ اسلامی حکمت اس وقت یہ چاہتی ہوگی کہ حریف قوم کے لیے نفع بخش بن کر اس کے

درمیان اپنے لیے عزت کی جگہ حاصل کی جائے ....

موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین تقریباً سب کے سب حضرت علیؓ کے اس قول کے مصداق ثابت ہوئے ہیں۔ وہ "ناسخ اور منسوخ" کی حقیقت سے بے خبر تھے۔ چنانچہ جہاں ناسخ پر عمل کرنا تھا وہاں انھوں نے منسوخ پر عمل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ایسے ایسے اقدامات کیے جو غیر حکیمانہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے صرف بربادی کا سبب بنے ۱۸۵۷ء میں علماء ہند کا انگریزوں سے جنگ کرنا بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ علماء کے اس فیصلہ کے مطابق ہزاروں مجاہدین تھانہ بھون" سہارن پور" میں جمع ہو گئے اور انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد کی باتیں ہونے لگیں۔ اس وقت صرف ایک عالم مولانا شیخ محمد اس مہم کے مخالف تھے۔"

(الرسالہ جنوری ۱۹۸۶ء ص ۳۱ - ۳۴)

وحید الدین خاں صاحب نے "نسخ کی حقیقت" والے مضمون میں اپنا مذکورہ فلسفۂ نسخ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

"موجودہ زمانہ میں اکثر مسلم ملکوں میں یہ مہم چل رہی ہے کہ شریعت کے قوانین کو حکومت کی طاقت سے جاری و نافذ کیا جائے مگر اس قسم کی تمام کوششیں اب تک سراسر بے اثر ثابت ہوئی ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ تمام تحریکیں نسخ کی حکمت کو ملحوظ رکھے بغیر چلائی جا رہی ہیں۔ اسلامی قانون کو نافذ کرنے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کے حق میں ذہنی فضا تیار کی جائے۔ جب معاشرہ کی قابل لحاظ تعداد ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو جائے تو قانون کو جزئی طور پر نافذ کیا جائے۔ پھر جیسے جیسے اس تعداد میں اضافہ ہو قانون کا مزید حصہ نافذ کیا جائے، یہاں تک کہ دھیرے دھیرے پورا قانون آخری شکل میں نافذ کر دیا جائے۔"

اسی مضمون کے آخر میں وحید الدین خاں صاحب نسخ کے ہتھیار سے حضرت

سید احمد شہیدؒ کی تحریک پر زور دار حملہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسلمان پچھلے تقریباً ڈیڑھ سو سال سے اس ناکام کہانی کو دہرا رہے ہیں وہ نسخ کے قرآنی اصول پر عمل کیے بغیر اقدام کرتے ہیں اور پھر سراسر ناکام رہتے ہیں۔ اس سلسلہ کا پہلا نمایاں واقعہ سید احمد شہید بریلویؒ (۱۷۸۶ء۔ ۱۸۳۱ء) کی وہ تحریک تھی جس کو عام طور پر تحریک مجاہدین کہا جاتا ہے، وہ یوپی بہار اور بنگال سے اپنے معتقدین کو لے کر پنجاب پہنچے وہاں انھوں نے پشاور کو "فتح" کیا اور اس میں اسلامی قانون کی حکومت قائم کر دی مگر یہ اسلامی حکومت بہت تھوڑے عرصہ میں ختم ہو گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں کے اوپر اسلامی قانون کی حکومت قائم کی گئی وہ اگرچہ نسلی طور پر مسلمان تھے مگر اسلامی قانون کو قبول کرنے کا مزاج ان کے اندر بالکل پیدا نہیں کیا گیا تھا، چنانچہ مقامی مسلم آبادی سید صاحب کے عمال کی باغی ہو گئی، وہاں کے قبائلی سرداروں نے سید صاحب کے آدمیوں کو قتل کر ڈالا اور خود سید صاحب کا یہ حال ہوا کہ انھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے انتہائی غیر حکیمانہ جنگ چھیڑ دی اور اس میں لڑتے ہوئے ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو قتل کر دیے گئے اسلامی حکومت بننے کے ساتھ ہی ختم ہو گئی ....

مسلمانوں کے پرجوش لیڈروں کو نہ قرآن و سنت سے ہدایت ملی اور نہ ماضی اور حال کے واقعات ان کی آنکھ کھولنے والے ثابت ہوئے۔ وہ ایک ہی ناکام کہانی کو ڈیڑھ سو سال سے مسلسل دہرائے چلے جا رہے ہیں۔" (الرسالہ جنوری ۱۹۸۶ء ص ۳۸۔ ۴۰)

ان دونوں مضامین میں جناب وحید الدین خاں صاحب نے نسخ کا جو تصور پیش کیا ہے وہ نہ صرف گمراہ کن ہے بلکہ ساری اسلامی شریعت کو ملیا میٹ کرنے والا ہے۔ خاں صاحب کا یہ نظریہ بہت دور رس اثرات کا حامل ہے کہ "ناسخ اور منسوخ کا معاملہ نہ چند احکام سے متعلق ہے اور نہ وہ غیر مبدل ہے۔ ناسخ اور منسوخ ایک مستقل

شرعی اصول ہے اس کا تعلق اس اہم چیز سے ہے جس کو عملی حکمت کہا جاتا ہے اور وہ پورے دین سے متعلق ہے نہ کہ محض چند احکام سے متعلق "۔ اس نظریہ کے تہہ میں اگر جایا جائے تو اس کی زہرناکی واضح ہوتی ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ شریعت میں نہ تو ایسے احکام ہیں جو ہمیشہ کے لیے منسوخ ہو چکے ہیں اور دوبارہ ان کی بحالی قیامت تک نہیں ہو سکتی اور نہ ایسے احکام ہیں جو دائمی طور پر ناسخ ہوں اور کبھی ان کو منسوخ کہنا اور سمجھنا درست نہ ہو۔ نسخ کا تعلق چند احکام سے نہیں ہے بلکہ پوری شریعت سے ہے، اور نسخ دراصل عملی حکمت کا نام ہے۔ اس نظریہ کے اعتبار سے جب کبھی کوئی "داعیٔ اسلام" یا "حاکم اسلام" دعوتی مصلحت سمجھے تو اسلام کے کسی بھی حکم کو منسوخ کر سکتا ہے، اور جب چاہے کسی منسوخ حکم کو بحال کر دے۔ مثلاً قرآن پاک میں نماز کے دوران بیت المقدس کا استقبال کرنے کے حکم کو منسوخ کر کے خانۂ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا، اور اس کا استقبال کرنے کا حکم دیا گیا، لیکن اگر آج کوئی داعیٔ اسلام دعوتی مصلحت سمجھتا ہے کہ پھر بیت المقدس کا استقبال کرنے کا حکم دے، تاکہ عیسائیوں اور یہودیوں کو مسلمانوں سے اُنس پیدا ہو اور دعوت اسلام کے لیے راہیں ہموار ہوں، تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اسلام کے وہ احکام جو دائمی اور غیر منسوخ ہیں انھیں حکمت عملی کی بنا پر کسی مصلحت سے منسوخ کیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر نسخ کے بارے میں وحید الدین خاں صاحب کے اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے تو پوری اسلامی شریعت داعیوں اور حاکموں کی تختۂ مشق بن جائے گی اور جب جس حکم کو چاہا جائے گا منسوخ یا بحال کیا جائے گا۔ اسلامی شریعت کا استقرار و دوام ختم ہو جائے گا، اور یہ شریعت بازیچۂ اطفال بن جائے گی۔

اس نسخ یا عملی حکمت کے استعمال کے لیے وحید الدین خاں صاحب جیسے داعی اور مفکر کا ہونا ضروری ہوگا، کیونکہ یہ نسخ اتنا سربستہ راز ہے کہ اسے حضرت

سید احمد شہیدؒ اور ان کے جلیل القدر رفقا ر مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ مولانا عبدالحیؒ بڑھانوی جیسے اصحاب علم ونظر بھی نہ جان سکے، اسی طرح مجاہدین شاملی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے علوم اسلامیہ کے شناور بھی اس کا ادراک نہ کر سکے۔ کئی سو سالوں میں تنہا وحید الدین خاں صاحب کو یہ مقام بلند حاصل ہوا کہ انھوں نے نسخ کی روح کو سمجھ کر کئی سو سال سے مسلمانوں کی طرف سے کیے جانے والے اقدامات کے بارے میں درست یا نادرست ہونے کا فیصلہ فرمایا۔

بلا تبصرہ

ہندوستان میں ہمارے بزرگوں نے دعوت کا کام زیادہ تر پست طبقات میں کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں اسلام کا معیار بھی پست ہو گیا۔

(الرسالہ جولائی سنہ ۱۹۸۹ء، ص ۲۷)

وحید الدین خاں صاحب کے نزدیک

قرآن فہمی کے اصول

حفاظتِ قرآن کا الٰہی وعدہ:

اسلام، اللہ تعالیٰ کا آخری دین اور قرآن آخری کتاب ہے، خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسولوں کی بعثت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا خدا کا آخری دین اسلام قیامت تک اپنی اصلی حالت میں باقی رہے گا۔ تاکہ قیامت تک تمام انسانوں کے لیے ہدایت کا راستہ کھلا رہے۔ قرآن سے پہلے جو آسمانی کتابیں نازل ہوئیں ان کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ان امتوں پر ڈالی جن کے درمیان انبیاء کرام ان کتابوں کے ساتھ مبعوث کیے گئے۔ اس کے برخلاف اللہ جلّ شانہٗ نے قرآن کی حفاظت اپنے ذمہ لی اور بڑے صاف الفاظ میں اعلان فرمایا: "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" (بے شک ہم نے ہی یہ قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔ قرآن کی حفاظت سے صرف قرآنی الفاظ کی حفاظت مراد نہیں بلکہ معانیِ قرآن کی حفاظت بھی اس کے دائرہ میں آتی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں جو دراصل قرآن کے اجمال کی تفصیل اور قرآن کریم کا عملی نمونہ ہیں ان کی حفاظت بھی حفاظتِ قرآن کے الٰہی وعدے میں شامل ہے۔ جس طرح امتِ مسلمہ میں الفاظِ قرآن کا تسلسل نہیں ٹوٹا ہر بعد والی نسل نے پہلے والی نسل سے قرآن کے الفاظ پوری دیانت داری اور بیدار مغزی سے سیکھے اسی طرح قرآنی آیات کے معانی کا تسلسل بھی اسلامی تاریخ کے کسی بھی دور میں نہیں ٹوٹا۔ ہر نسل نے اپنے سے

پہلے والی نسل سے قرآنی آیات کے معانی سیکھے اور یہ ورثہ بھی امت میں اپنی اصل شکل میں منتقل ہوتا رہا۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے بڑی پتہ کی بات لکھی ہے:

نحن نعلم ان القرآن قرأه الصحابة والتابعون وتابعوهم وانهم كانوا اعلم بتفسيره ومعانيه كما انهم اعلم بالحق الذي بعث به رسوله فمن خالف قولهم وفسر القرآن بخلاف تفسيرهم فقد اخطأ في الدليل والمدلول جميعًا۔	ہمیں اس بات کا علم ویقین ہے کہ صحابۂ کرام، تابعین اور تبع تابعین نے قرآن پڑھا اور یہ لوگ قرآن کی تفسیر اور معانی سے سب سے زیادہ واقف تھے، جس طرح یہ لوگ اس سچائی سے سب سے زیادہ واقف تھے، جس کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے تھے۔ لہٰذا جس شخص نے ان کے قول کی مخالفت کی اور ان کی تفسیر کے خلاف قرآن کی تفسیر کی اس نے دلیل اور مدلول دونوں میں غلطی کی۔
[مقدمہ لاصول التفسیر لابن تیمیہ ص ۲۴]	

اسلام تحریفات سے محفوظ ہے:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر دور میں اسلامی تعلیمات کے اندر آمیزش اور تحریف کی کوشش بھی کی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے قیامت تک اسلام کو صاف وشفاف باقی رکھنے کا جو وعدہ فرمایا ہے اس کا نتیجہ ہے کہ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ایسے مجددین اور اصحاب عزیمت رونما ہوتے رہے جنھوں نے اسلام کو ہر طرح کی آمیزشوں سے پاک کرکے اصلی حالت میں باقی رکھا اور دینِ حق کو تحریف، غلو اور اضافی اجزاء سے پاک رکھا اس لیے اسلام کی تعلیمات اور قرآن کے معانی کسی دور میں بھی اہلِ ایمان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے۔ اس لیے بعد کی صدیوں میں اگر کوئی شخص قرآنی آیات کے ایسے معانی بیان کرے جس سے قرونِ اولیٰ کے مسلمان

ناآشنا رہے ہوں تو اس کا بیان ذرہ برابر قابلِ توجہ نہیں ہوگا اور واضح مطلب یہ ہوگا کہ اس شخص نے قرآن کے معنی میں تحریف کی ہے۔ قرآن کریم صحابۂ کرامؓ کے دور میں نازل ہوا، انھیں بخوبی معلوم تھا کہ کون آیت کس موقع پر اور کن حالات میں نازل ہوئی اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہے، عربی زبان ان کی مادری تھی، اس زبان کے اسالیب سے صحابۂ کرام پوری طرح واقف تھے اس لیے انھیں قرآن کے معنی سمجھنے اور آیتوں کا مصداق طے کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی، اور جہاں کہیں قرآن میں ایسا اجمال و ابہام ہوتا جسے صحابۂ کرام از خود نہ حل کر پاتے وہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیتے۔ غرضیکہ صحابۂ کرام میں قرآن فہمی کی تمام بنیادی شرطیں بدرجۂ اتم موجود تھیں، علمِ دین کا یہی سرمایہ منتقل ہو کر تابعین تک پہونچا اور پھر بعد والی نسلیں اس کی حامل ہوئیں۔ اسلامی تاریخ میں ایسے متعدد مفسرین رونما ہوئے جنھوں نے ذخیرۂ احادیث اور آثارِ صحابہ و تابعین کو نظر انداز کر کے محض اپنے فہم سے قرآنی آیات کے معانی طے کرنا چاہے اور تفسیرِ قرآن کا جو تسلسل آغازِ اسلام سے چلا آرہا تھا اسے توڑنے کی کوشش کی، لیکن امتِ اسلامیہ نے ایسی کوششوں کو ہمیشہ اسلام دشمن اقدام اور تحریفِ قرآن قرار دیا، اس لیے ہر وہ جماعت، تحریک اور شخصیت جو قرآنی آیات کو نئے نئے معانی پہنائے اور دین کا کوئی ایسا تصوّر پیش کرے جس سے قرونِ اولیٰ کے مسلمان ناآشنا تھے، اسے مسترد کر دیا جائے گا اور دین میں تحریف کرنے کی وجہ سے اس پر لگام لگائی جائے گی۔

وحیدالدین خاں صاحب:

جناب وحیدالدین خاں ہند و پاک کے لیے غیر معروف نہیں ہیں۔ اللہ نے انھیں بہت سی صلاحیتوں اور خصوصیات سے نوازا ہے۔ ان کی مفید تحریروں نے فکرِ آخرت پیدا کرنے اور علومِ جدیدہ کی روشنی میں قرآنی تعلیمات کی صداقت اور دوامیت کو اجاگر کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اگرچہ انھوں نے تعلیم و تعلّم کی

راہ سے علوم اسلامیہ کی تکمیل نہیں کی ہے لیکن اپنی محنت اور ذاتی مطالعہ سے علوم اسلامیہ کے میدان میں خاصی ترقی کی ہے۔ رسمی طور پر انھوں نے جدید دانش گاہوں میں بھی تعلیم کی تکمیل نہیں کی لیکن اپنی انتھک محنت اور ذوق مطالعہ کے ذریعہ انگریزی زبان اور بعض علوم جدیدہ میں دسترس حاصل کی۔ ان کا اسلوب تحریر دلکش اور سادہ ہے اس لیے ان کی تحریریں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان کی کتاب "علم جدید کا چیلنج" (جسے انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں قیام کے زمانہ میں تصنیف کیا اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے شائع کیا) انتہائی مفید ثابت ہوئی۔ انھوں نے یہ حقیقت آشکارا کی کہ علوم جدیدہ خصوصاً سائنس اسلام کے مخالف نہیں، بلکہ اسلام کے مؤید اور خادم ہیں نیز علوم جدیدہ نے اسلام کے عقائد واحکام کو تجربات ومشاہدات کی روشنی میں دو دو چار کی طرح ثابت کر دیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جناب وحیدالدین خاں صاحب نے اگر اسی طرح کے موضوعات پر مزید تحقیقات کی ہوتیں اور ذہنی توانائیاں انہیں موضوعات کے لیے وقف کر دیتے تو وہ اسلام کی زیادہ بہتر خدمت انجام دے سکتے۔ اور ان کی صلاحیتیں صحیح مصرف ومحل میں خرچ ہوتیں۔

وحیدالدین خاں صاحب کی بنیادی غلطی:

وہ انسان انتہائی خوش نصیب ہے جو اپنی صلاحیتوں کا پوری دیانت داری کے ساتھ صحیح اندازہ لگا کر برمحل استعمال کرے لیکن تاریخ میں یہ سانحہ بار بار پیش آیا ہے کہ ایک شخص کو اگر کسی خاص میدان میں کامیابی حاصل ہوئی اور اس کے جوہر کھلے تو وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ مجھ میں ہر میدان میں شہسواری کی اہلیت موجود ہے۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایسے میدانوں میں کود پڑا جس کی نہ اس نے بھرپور تیاری کی تھی۔ اور نہ ہی اس میں کوئی مفید کام انجام دینے کی اہلیت تھی۔ جناب وحیدالدین خاں بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہوئے۔ علم جدید کا چیلنج اور اس طرح کی بعض دوسری تحریروں کی جو شہرت اور قدر افزائی ہوئی اس سے انھیں یہ محسوس ہونے لگا کہ مجھ میں

نہ صرف ہر اسلامی موضوع پر لکھنے کی بھرپور اہلیت ہے بلکہ میں عصرِ حاضر میں اسلام کی جدید تعبیر و تشریح کر سکتا ہوں حالانکہ اس کام کے لیے علومِ اسلامیہ (قرآن و سُنّت، علم عقائد، فقہ و اصولِ فقہ وغیرہ) کے جس عمیق مطالعہ کی ضرورت تھی اس سے وہ بہرہ ور نہیں تھے۔

ان صفحات میں ہم جناب وحید الدین خاں صاحب کے فہمِ قرآن کے چند اصول اور قرآن فہمی کے چند نمونے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وحید الدین خاں صاحب کی تحریروں میں قرآنی آیات کے حوالے بہت کثرت سے آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تعلیم اور مطالعہ کے جو مراحل بتائے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے علوم اسلامیہ میں سے اگر کسی علم پر اپنا اچھا خاصا وقت خرچ کیا ہے تو وہ قرآن اور تفسیر قرآن ہے، لیکن ان کے یہاں قرآن فہمی کا جو طریقہ اور دوسرے علوم اسلامیہ سے ناواقفیت اور لاپرواہی کا جو مظاہرہ پایا جاتا ہے اس کے بعد دور دور تک ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ قرآن کی تعلیمات کا صحیح زاویۂ نظر سے مطالعہ کر سکیں گے، اور قرآنی تعلیمات کی صحیح ترجمانی کر سکیں گے۔

قرآن فہمی کی شرطیں:

وحید الدین خاں صاحب نے جون ۱۹۸۱ء کے "الرسالہ" میں قرآن فہمی کے بارے میں اپنے بعض نظریات لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا نظریہ انھیں کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

"اہل فن نے قرآن کی تفسیر کے لیے پندرہ علوم پر مہارت ضروری بتائی ہے۔ (۱) لغت (۲) نحو (۳) صرف (۴) اشتقاق (۵) علم معانی (۶) علم بیان (۷) علم بدیع (۸) علم قرأت (۹) علم عقائد (۱۰) اصول فقہ (۱۱) اسباب نزول (۱۲) علم ناسخ و منسوخ (۱۳) علم فقہ (۱۴) روایات (۱۵) علم وہبی۔

بعض لوگوں نے قرآن فہمی کے لیے اس سے کم یا اس سے زیادہ علوم بھی بیان کیے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام غیر ضروری شرائط ہیں ان کا غیر متعلق ہونا اس سے واضح ہے کہ ان میں سے اکثر علم وہ ہیں جن سے صحابہ بالکل ناواقف تھے، وہ بعد کے دور میں بنائے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لیے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک ایمان، دوسرے عربی زبان۔ اگر آدمی کو فی الواقع ایمانی شعور حاصل ہو، اور وہ عربی زبان سے بخوبی واقف ہے تو یقیناً وہ اللہ کی مدد سے کلام الٰہی کو سمجھنے لگا، واضح ہو کہ ایمان میں ایمان بالرسالت اور احادیث سے کما حقہ آشنا ہونا بھی لازماً شامل ہے۔ ایمان محض کلمہ کے الفاظ کو دوہرانا نہیں ہے، ایمان دراصل فطرت اللہ کو پا جانے کا نام ہے۔ وہ فطرت جس پر سارے انسانوں کو پیدا کیا گیا، ایمان مجمل شعور کے طور پر آدمی کو خالق اور مخلوق کے تمام رموز سے آشنا کر دیتا ہے، اس کے بعد اگر وہ عربی زبان جانتا ہو اور قرآن کو پڑھے تو وہ اپنے آپ کو ملہم کے مقام پر کھڑا ہوا پاتا ہے، اس کو محسوس ہونے لگتا ہے گویا کہ خدا براہ راست اس سے مخاطب ہو گیا ہے۔ اس مقام کو پہونچنے کے بعد انسانی ساخت کے دوسرے علوم قرآن اور بندہ کے درمیان ایک قسم کی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ بجائے کہ وہ قرآن کے معانی کو آدمی کے اوپر کھولنے کا ذریعہ بنیں"۔

(الرسالہ جون ۱۹۸۰ء، ص ۴۴ - ۴۵)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جن علوم کو مفسرین نے تفسیر قرآن کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ ان میں سے اکثر کو وحید الدین خاں صاحب نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں سمجھتے بلکہ قرآن فہمی کے لیے انہیں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ "ان میں اکثر علم وہ ہیں جن سے صحابہ بالکل ناواقف تھے، وہ بعد کے دور میں بنائے گئے"۔ موصوف کی یہ دلیل انتہائی مغالطہ انگیز ہے، وہ

علوم اگرچہ صحابہ کے دور میں مرتب نہیں ہوئے تھے لیکن ان علوم کی روح اور مقاصد سے صحابۂ کرام کامل طور پر آگاہ تھے۔ جہاں تک علوم عربیت کا تعلق ہے، اس سلسلے میں عرض ہے کہ صحابۂ کرام کی مادری زبان عربی تھی، وہ حضرات عربی زبان وادب کا اعلیٰ ترین ذوق رکھتے تھے اور فطری فصاحت و بلاغت کی وجہ سے عربی زبان کے اسالیب، طرزِ ادا اور اسرار و رموز سے بخوبی آگاہ تھے۔ قرآن پاک ان کے سامنے نازل ہوا اس لیے وہ اسباب نزول، ناسخ و منسوخ وغیرہ سے کماحقہٗ واقف تھے، عقائد و احکام کی تعلیم انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی تفسیری روایات کا ذخیرہ ان سے نقل ہو کر ہم تک پہونچا، اس لیے اگر صحابۂ کرام کے زمانہ میں یہ علوم مدون نہیں تھے، تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ ہم لوگوں کو بھی قرآن فہمی اور تفسیر کے لیے ان علوم کی حاجت نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مفسرین اور علوم قرآنیہ کے ماہرین نے جن علوم میں مہارت تفسیر قرآن کے لیے شرط قرار دی ہے ان میں سے اکثر کو موصوف قرآن فہمی میں رکاوٹ سمجھتے ہیں کیونکہ ان میں سے بیشتر علوم سے وہ ناآشنا ہیں۔ مذکورہ بالا اقتباس میں انھوں نے معلوم نہیں کس لیے ایمان و عربی زبان کی شرط لگا دی ہے ان کی ایک دوسری تحریر قرآن فہمی کے لیے ان شرائط کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء کے 'الرسالہ' میں موصوف اپنے ایک سفر نامہ میں لکھتے ہیں:

قرآن فہمی کا آسان نسخہ:

"مجھ سے پوچھا گیا کہ مطالعۂ قرآن کے رہنما اصول کیا ہیں؟ میں نے کہا یوں تو اس موضوع پر موٹی موٹی کتابیں لکھی گئی ہیں اور درجنوں علوم کی مہارت کو فہم قرآن کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے، مگر قرآن کا اصل مقصد نصیحت ہے، اور اس سے نصیحت حاصل کرنے کے لیے صرف ایک چیز کافی ہے اور وہ ہے دعا۔ آپ قرآن کو اہتمام اور

سنجیدگی کے ساتھ پڑھیں، اور جہاں کوئی بات سمجھ میں نہ آئے اللہ سے
اس کے لیے دعا کریں۔ قرآن کا مصنف خود اللہ تعالیٰ ہے اور قرآن بتاتا
ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے قریب ہے اور ہر وقت ان کی پکار کو سنتا ہے،
پھر اس سے بڑی چیز اور کیا ہے جس پر قرآن فہمی کے سلسلے میں بھروسہ کیا
جائے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے اللہ سے مدد طلب کرنا گویا خود کتاب کے
مصنف سے کتاب کی تشریح پوچھنا ہے، اس سے بڑا خوش قسمت اور
کون ہے جو کسی کتاب کا مطالعہ اس حال میں کر رہا ہو کہ کتاب کا مصنف
ہر وقت اس کے پاس مراجعت کے لیے موجود ہو۔"

(الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۶ء ص ۴۰)

قرآن کی تفسیر اور فہم قرآن کے لیے مفسرین جن علوم میں مہارت شرط بتاتے
ہیں ان سارے علوم سے دامن جھاڑ کر جب وحید الدین خاں صاحب تفسیر قرآن
کے نازک میدان میں قدم رکھتے ہیں ایسی صورت میں وہ جو بھی گل کھلائیں کم ہے۔
قرآنی آیات کو آڑ بنا کر موصوف ایسے خیالات و نظریات کا اظہار کرتے ہیں جن سے
اسلامی تاریخ خالی ہے، قرآنی آیات کی تفسیر میں انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے
ہیں، قرآنی آیات کو من پسند معانی پہناتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی ایک ہی آیت کی مختلف
تفسیریں کرتے ہیں۔ اگلے صفحات میں موصوف کی قرآن فہمی کے چند نمونے درج
کیے جاتے ہیں۔

آیتِ تبلیغ کی خود ساختہ تفسیر

سورہ مائدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

" یا ایہا الرسول بلّغ ما انزل إلیک من ربک و إن لم تفعل فما بلّغت رسالتہ ، واللہ یعصمک من الناس ، إن اللہ لا یہدی القوم الکٰفرین ٥ (مائدہ - ٦٧)

جناب وحید الدین خاں نے اس کا ترجمہ کیا ہے :

" اے پیغمبر! جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اُترا ہے اس کو پہنچا دو ، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔ اللہ یقیناً منکر لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔"

اس کے بعد موصوف نے صفوۃ التفاسیر کے حوالے سے اس آیت کے شانِ نزول سے متعلق چند روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ :

" اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا ہوا ہے ، رسول کے لیے حفاظت کا مسئلہ ہو تو اس کا الگ سے مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں ۔ دعوت کا عمل ہی اس کی حفاظت کا ضامن بھی ہے ۔ اللہ کا یہ وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اصلاً تھا اور آپ کی امت کے لیے یہ وعدہ تبعاً ہے ۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جس کی روشنی میں ہمیں اپنے معاملات کو دیکھنا چاہیے ، دوسری اقوام کی طرف

سے جب بھی اہلِ اسلام کے لیے حفاظت کا مسئلہ پیدا ہو تو اس کا سبب یہی ہوگا
کہ امت نے دعوت الی اللہ کے فریضہ کو چھوڑ دیا ہے اور جب امت دعوت
الی اللہ کے فریضہ کے لیے اٹھے تو اس کو یقین رکھنا چاہیے کہ بقیہ تمام خطرات
اور اندیشے کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی ضمانت ہے، بقیہ خطرات کے لیے
الگ سے مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں، دعوت الی اللہ کا کام کیجیے اور بقیہ
تمام خطرات کے دفعیہ کی صورتیں اپنے آپ پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔ دعوت
سے یہاں مراد غیر مسلموں میں دعوت ہے، یعنی اللہ کا پیغام اللہ کے ان بندوں
تک پہنچانا جو ابھی اللہ کے حلقۂ اطاعت میں داخل نہیں ہوئے، قرآن میں
دعوت یا تبلیغ کا لفظ جہاں بھی آیا ہے غیر مسلموں میں ہی دعوت پہنچانے کے لیے
آیا ہے۔ مسلمانوں کے اندر جو کام کرنا ہے اس کے لیے قرآن میں تذکیر، اصلاح،
تواصی بالحق، اور تواصی بالصبر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کے الفاظ
آئے ہیں۔ مسلمانوں کی دینی اصلاح کے کام کو مجازی طور پر دعوت اور تبلیغ
کہا جاسکتا ہے، مگر دعوت اور تبلیغ کا لفظ اصلاً جس دینی کام کا عنوان ہے وہ
اصلاً غیر مسلم اقوام تک خدا کا پیغام پہونچانا ہے نہ کہ مسلمانوں کی داخلی اصلاح
کرنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دعوت الی اللہ کے کام پر عصمت و حفاظت کا خدائی وعدہ
بلاشبہ یقینی ہے، مگر اس وعدہ کی تکمیل حقیقی دعوت ہی کے کام پر ہو سکتی ہے
نہ کہ کسی اور کام پر۔ اگر ہم کوئی اور کام کریں اور اس کو دعوت الی اللہ کا
عنوان دے دیں تو ہمیں ہرگز یہ توقع نہیں رکھنا چاہیے کہ خدا کا وعدۂ حفاظت
ہمارے حق میں پورا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (الرسالہ اگست ۱۹۸۶ء، ص ۱۸، ۲۰)

اس کے بعد جناب وحید الدین خاں صاحب نے امتِ اسلامیہ کی دعوتی تاریخ
کی روشنی میں یہ بات ثابت کرنی چاہی ہے کہ ہر نازک موڑ پر دعوت الی اللہ نے مسلمانوں
کی حفاظت کی ہے۔

غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت بلاشبہ امتِ مسلمہ کا سب سے اہم فریضہ ہے اور

اس عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت بھی ہوتی ہے اور غیب سے حفاظت کا سامان بھی ہوتا ہے۔ لیکن جناب وحید الدین خاں صاحب کی مذکورہ بالا تحریر میں چند باتیں نظر ثانی کی محتاج ہیں اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک خاص پہلو کے ذہن پر غالب ہونے کی وجہ سے دوسرے پہلوؤں کا لحاظ نہیں کیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس آیت کے بارے میں یہ کہنا کہ اس میں تبلیغ و دعوت سے مراد محض غیر مسلموں میں دعوت ہے یہ اس آیت کے مفہوم کو تبدیل کر دینا ہے۔ صحابہ و تابعین اور مفسرین امت نے بلغ ما أنزل الیك میں ایمان و عقیدہ کے ساتھ پورے دین و شریعت کی تبلیغ شامل کی ہے اور خود اس آیت کے جو الفاظ ہیں وہ بھی عموم پر دلالت کرتے ہیں اسی لیے خود وحید الدین خاں صاحب نے ترجمہ کیا ہے، "اے پیغمبر! جو کچھ تمھارے اوپر تمھارے رب کی طرف سے اُترا ہے اس کو پہنچا دو"۔ عربی زبان میں "ما" کا لفظ عموم کے لیے آتا ہے، اس کے استعمال ہونے سے آیت کا مفہوم ہو گیا کہ جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے سب کو بندوں تک پہنچا دو۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ آیت سورۂ مائدہ کا جزء ہے اور سورۂ مائدہ مدنی سورت ہے، اس کا نزول مدینہ منورہ میں ہوا، مدنی سورتوں میں بھی یہ سورت سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

> "سورۂ مائدہ بالاتفاق مدنی سورۃ ہے اور مدنی سورتوں میں بھی آخری سورۃ ہے، یہاں تک کہ بعض حضرات نے اسے قرآن کی آخری سورۃ بھی کہا ہے۔ مسند احمد میں بروایت حضرت عبد اللہ بن عمر و اسماء بنت یزید منقول ہے کہ سورۂ مائدہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت نازل ہوئی جب کہ آپ سفر میں عضباء نامی اونٹنی پر سوار تھے۔ نزول وحی کے وقت جو غیر معمولی ثقل اور بوجھ ہوا کرتا تھا حسب دستور اس وقت بھی ہوا، یہاں تک کہ اونٹنی عاجز ہو گئی تو آپ اس سے نیچے اُتر آئے۔ یہ سفر بظاہر حجۃ الوداع کا سفر ہے جیسا کہ بعض روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے

حجۃ الوداع ہجرت کے نویں سال میں ہوا اور اس سے واپسی کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیوی حیات تقریباً اسّی دن رہی۔ ابو حیانؒ نے بحر محیط میں فرمایا کہ سورۂ مائدہ کے بعض اجزاء سفر حدیبیہ میں اور بعض فتح مکہ کے سفر میں اور بعض حجۃ الوداع کے سفر میں نازل ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورۃ نزول قرآن کے آخری مراحل میں نازل ہوئی، خواہ بالکل آخری سورۃ نہ ہو۔" (معارف القرآن ج ۳، ص ۱۰۱۹)

سورۂ مائدہ کے نزول قرآن کے آخری مراحل میں نازل ہونے کا واضح مطلب یہ ہے کہ زیر بحث آیت کے نازل ہونے سے قبل اسلامی شریعت کے تقریباً تمام احکام نازل ہو چکے تھے، اسلامی عقائد کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق قرآنی آیات کا نزول ہو چکا تھا خود سورۂ مائدہ تمام تر احکام والی آیتوں پر مشتمل ہے، لہٰذا اسلامی شریعت کے نزول کے بعد جب یہ آیت نازل ہوتی ہے، یا ایہا الرسول بلّغ ما اُنزل الیک تو جس طرح اس کے اندر اسلامی عقائد (توحید، رسالت، آخرت وغیرہ) شامل ہوتے ہیں، اسی طرح قرآنی احکام خواہ عبادت سے متعلق ہوں یا معاملات اور معاشرت سے، اخلاق سے متعلق ہوں یا عقوبات سے، سب اس کے دائرے میں آ گئے۔ لہٰذا یہ دعویٰ کرنے کی کوئی بنیاد نہیں کہ بلّغ ما اُنزل الیک سے مراد صرف غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح اس کے مکلف تھے کہ غیر مسلموں تک اللہ کا پیغام پہنچائیں، اسی طرح ان کی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے تمام احکام (خواہ وہ کسی شعبۂ زندگی سے متعلق ہوں) بندوں تک پہنچائیں۔

اس آیت کا مفہوم احادیث و آثار کا مطالعہ کرنے سے زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ امام بخاری نے کتاب التفسیر میں اس آیت کے ذیل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک اثر نقل کیا ہے، جس سے اس آیت کا مفہوم اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ قیاس آرائی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے:

عن عائشۃؓ قالت: من حدثك ان محمداصلی اللہ علیہ وسلم کتم شیئاً مما اُنزل علیہ فقد کذب، واللہ یقول یاأیھا الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك الآیۃ۔

(صحیح بخاری کتاب التفسیر باب یاایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک)

"حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا، جو شخص تم سے یہ بتائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر نازل کیے ہوئے دین میں سے کوئی چیز چھپالی ہے اس نے جھوٹ بولا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اے رسول! جو کچھ تم پر تمھارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دو۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ مائدہ کی مذکورہ بالا آیت میں دین اسلام کی مکمل تبلیغ کا جو حکم دیا گیا اس کا گہرا اثر آپ کی پوری حیات طیبہ پر محسوس ہوتا ہے، تبلیغ دین کی یہی عمومی ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام اور پوری امت کو ان الفاظ میں سونپی:

عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ... (بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ اسی کا نام نہیں ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دی جائے بلکہ دین کا کوئی بھی عقیدہ، عمل، حکم انسانوں تک پہنچانا تبلیغ ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر میں جو تقریر فرمائی اس میں تمام تر عملی احکام کا بیان ہے۔ اس تقریر کے آخر میں آپ نے سوال کیا، ألا ھل بلغت (دیکھو کیا میں نے آپ کو دین پہنچا دیا؟) حاضرین نے جواب دیا: "ہاں"۔ تو آپؐ نے فرمایا، اللّٰھم اشھد فلیبلغ الشاھد الغائب فرب مبلغ اوعیٰ من سامع (بخاری ومسلم) "اے اللہ! گواہ رہیے جو لوگ اس مجمع میں حاضر ہوں وہ غائبوں تک میری بات پہنچا دیں، بسا اوقات جسے بات پہنچائی جاتی ہے وہ سننے والے سے زیادہ بات کو سمجھنے اور یاد کرنے والا ہوتا ہے۔"

اس حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری صفائی کے ساتھ احکام الٰہیہ لوگوں تک پہنچانے کو تبلیغ کا نام دیا، پھر یہ کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت پہنچانا ہی تبلیغ ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے فان لم تفعل فما بلغت رسالتہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مراد اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی ایک حکم خداوندی بھی آپ نے امت کو نہ پہنچایا تو آپ اپنے فرض پیغمبری سے سبکدوش نہیں ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنی پوری ہمت و قوت صرف فرمائی۔" (معارف القرآن جلد سوم ص ۱۹۴)

وحیدالدین خاں صاحب کا بے بنیاد دعویٰ:

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے مذکورہ بالا اقتباس میں یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ، "قرآن میں دعوت یا تبلیغ کا لفظ جہاں بھی آیا ہے غیر مسلموں میں ہی دعوت پہنچانے کے لیے آیا ہے۔ مسلمانوں کے اندر جو کام کرنا ہے اس کے لیے تذکیر، اصلاح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے الفاظ آئے ہیں۔"

صحابہ کرام اور سلف صالحین تفسیر قرآن کے بارے میں بہت محتاط تھے، قرآن کے بارے میں تحقیق و یقین کے بغیر ایک لفظ بولنا ان لوگوں پر پہاڑ سے زیادہ بھاری تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے "فاکھۃ و ابا" کی تفسیر دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا:

ای سماء تظلنی و ای أرض تقلنی ان انا قلت فی کتاب اللہ ما لا أعلم۔ (مقدمہ فی اصول التفسیر لابن تیمیہ، ص ۳۰)

"میں کس آسمان کے سایہ تلے اور کس زمین کی پشت پر رہوں گا اگر

میں قرآن کے بارے میں کوئی اجمالی بات کہوں۔"

اسلافِ امت کے برخلاف جناب وحید الدین خاں صاحب قرآن کے بارے میں بہت جری ہیں۔ تلاش و تحقیق کے بغیر بڑے بڑے دعوے کر ڈالتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ یہ کتنا بڑا دعویٰ ہے کہ قرآن میں دعوت یا تبلیغ کا لفظ جہاں بھی آیا ہے غیر مسلموں میں ہی دعوت پہنچانے کے لیے آیا ہے۔ لفظ تبلیغ کے بارے میں خاں صاحب کے دعویٰ کی حقیقت ان بحثوں سے کھل گئی جو اوپر ہم نے سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۶۷ کے سلسلے میں پیش کی ہیں۔ لفظ "دعوت" کے بارے میں خود جناب وحید الدین خاں صاحب اپنے دعویٰ پر قائم نہ رہ سکے فریضہ دعوت سے متعلق سورۂ آل عمران میں دو آیتیں وارد ہیں، پہلی آیت یہ ہے:

"ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف
وینھون عن المنکر واُولٰئک ھم المفلحون۔" (آیت ۔ ۱۰۴)
(اور ضرور ہے کہ تم میں ایک گروہ ہو جو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم
دے اور برائی سے روکے، اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے۔)

اس آیت کا سرنامہ 'دعوت' ہے پھر بھی جناب وحید الدین صاحب نے اس آیت کو امت کی داخلی اصلاح پر محمول کیا ہے۔ یہاں 'دعوت' سے غیر مسلموں میں دعوت مراد نہیں لی ہے، موصوف اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یہ ارشاد بیک وقت دو باتوں کو بتا رہا ہے۔ ایک کا تعلق خواص سے
ہے اور دوسری کا تعلق عوام سے۔ امت کے خواص کے اندر یہ روح ہونی
چاہیے کہ وہ امت کے اندر برائی کو برداشت نہ کریں، وہ نیکی اور بھلائی
کے لیے تڑپنے والے ہوں۔ ان کا یہ جذبۂ اصلاح مجبور کرے کہ لوگوں کے
احوال سے غیر متعلق نہ رہیں، وہ اپنے بھائیوں کو نیکی کی راہ پر چلنے کے لیے
اکسائیں اور انھیں برائی سے دور رہنے کی تلقین کریں۔ تاہم اس عمل کی
کامیابی کے لیے امت کے عوام کے اندر اطاعت کا جذبہ ہونا بھی لازماً ضروری
ہے، عوام کو چاہیے کہ وہ اپنے خواص کا احترام کریں، وہ ان کے کہنے سے

چلیں اور جہاں وہ روکیں وہاں رُک جائیں۔ جس مسلم گروہ میں خواص
اور عوام کا یہ حال ہو وہی فلاح پانے والا گروہ ہے"۔

(تذکیر القرآن جلد اول ص ۱۵۰)

سورۂ آل عمران کی فریضۂ دعوت سے متعلق دوسری آیت یہ ہے:

"کنتم خیر أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف
وتنهون عن المنکر وتؤمنون بالله"۔ (آیت - ۱۱۰)

(تم بہترین گروہ ہو جس کو لوگوں کے واسطے نکالا گیا ہے۔ تم بھلائی کا
حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔)

اس آیت میں امر بالمعروف ا نہی عن المنکر کا ذکر ہے، پھر بھی وحید الدین خاں
صاحب نے اپنے مذکورہ بالا دعویٰ کے بالکل برخلاف اس سے غیر مسلموں میں دعوت
مراد لی ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہود دین خداوندی کے حامل بنائے گئے تھے لیکن وہ اس کو لے کر
کھڑے نہ ہو سکے اور اس کو محفوظ رکھنے میں بھی ناکام رہے۔ اس کے بعد
اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنا دین اس کی صحیح صورت میں بھیجا۔
اب امت مسلمہ لوگوں کے درمیان خدا کی رہنمائی کے لیے کھڑی ہوئی ہے۔
اس منصب کا تقاضا ہے کہ یہ امت اللہ کی سچی مومن بنے، وہ دنیا کو بھلائی
کی تلقین کرے"۔ (تذکیر القرآن، ج ۱، ص ۱۵۱-۱۵۲)

جناب وحید الدین خاں صاحب کی تفسیر سے ہم نے سورۂ آل عمران کی فریضۂ دعوت
سے متعلق دو آیتوں کی تفسیر اس لیے نقل کر دی تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ وحید الدین
خاں صاحب خود اپنے بیان کردہ کلی اصول پر قائم نہیں رہ سکے ہیں، ورنہ قرآن و سنت
پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ بہ خوبی جانتے ہیں لفظ دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں خاں صاحب
کا دعویٰ بالکل ایک ہوائی محل ہے جس کی کوئی اساس نہیں ہے، اسی طرح سورۂ آل عمران
کی آیت نمبر ۱۰۴ کو مسلمانوں کی اصلاح کے لیے مخصوص کرنے اور آیت نمبر ۱۱۰ کو غیر مسلموں

میں دعوتِ اسلام کے ساتھ مخصوص کرنے کی بھی کوئی بنیاد نہیں ہے نہ احادیث و آثار سے نہ لغت و ادب سے۔

آیت کی غلط تشریح :

جناب وحید الدین خاں صاحب کے مذکورہ بالا اقتباس کے بارے میں تیسری بات یہ کہنی ہے کہ انھوں نے واللہ یعصمک من الناس کے فہم میں ٹھوکر کھائی ہے، اور قرآن پاک کے اس جملے کو اپنا من پسند معنی پہنایا ہے۔ تمام مفسرین تقریباً اس بات پر متفق ہیں کہ واللہ یعصمک من الناس، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔ اس آیت کے آگے پیچھے جو دوسری آیتیں ہیں ان سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدنی زندگی میں قوم یہود سے خاص طریقے سے بڑے خطرات تھے، یہ لوگ آپ کے قتل کے درپے تھے۔ ادھر کفارِ مکہ اور منافقینِ مدینہ کی طرف سے خطرات پوری شدت سے موجود تھے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہرہ داری کے لیے رات میں کچھ صحابہ کو مقرر کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنانِ اسلام سے محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو رات کی پہرہ داری سے منع فرما دیا۔ اکثر مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ اس آیت میں محض قتل سے حفاظت کا وعدہ ہے۔ دوسری طرح کی ایذا رسانیاں دشمنانِ اسلام کی طرف سے ہو سکتی تھیں اور ہوئیں، لہٰذا اس وعدۂ عصمت کو پوری امت کے لیے عام کرنا اس کا کوئی جواز نہیں ہے اور اگر بالفرض عام کیا جائے تو اس کے دائرہ میں محض داعیوں کو قتل سے محفوظ ہونا آئے گا۔ دشمنانِ اسلام کی طرف سے دوسری ایذا رسانیاں، سازشیں نہ ہونے یا ان کے کامیاب نہ ہونے کی کوئی ضمانت اس آیت میں نہیں ہے، مذکورہ بالا اقتباس میں وحید الدین خاں صاحب نے یہاں تک لکھ دیا ہے:

"اور جب امت دعوت الی اللہ کے فریضہ کے لیے اٹھے تو اس کو یقین رکھنا چاہیے

کہ بقیہ تمام خطرات اور اندیشوں کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی ضمانت ہے' بقیہ خطرات کے لیے الگ سے مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں' دعوت الی اللہ کا کام کیجیے اور بقیہ تمام خطرات کے دفعیہ کی صورتیں اپنے آپ پیدا ہوتی چلی جائیں گی"۔ اس طرح کی ہوائی باتیں قرآن پاک کی کسی آیت سے ثابت کرنا بڑی جرأت کی بات ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کے علاوہ امت کی طرف سے کوئی خود حفاظتی کام نہیں ہونا چاہیے، حالانکہ پورا قرآن اس طرح کی تعلیمات سے معمور ہے کہ مسلمانوں کو اعداء اسلام کے حملوں اور سازشوں سے بچنے کے لیے بھرپور تیاریاں کرنی چاہئیں اور اسباب کی اس دنیا میں اسباب سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ بھروسہ اسباب پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پر کرنا چاہیے کیونکہ اصل محافظ وہی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون به عدو اللہ وعدوکم"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی دعوت الی اللہ کے ساتھ حفاظتی تدابیر سے بھی آراستہ ہے، عہد نبوی کے غزوات دسرایا اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

وحید الدین خاں صاحب نے واللہ یعصمک من الناس کا وعدہ صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر امم سابقہ پر بھی اس کی تطبیق کرنی چاہی ہے، چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں حضرت موسیٰؑ کے زمانے کے رجلِ مومن کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

> "اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رجل مومن کو جو چیز سیئات ما مکروا سے بچانے والی ثابت ہوئی وہ دعوت حق تھی، رجلِ مومن کے پاس صرف حق کی معرفت اور اس کی دعوت کا سرمایہ تھا، اس کے مقابلہ میں فرعون کے پاس ہر قسم کی مادی طاقتیں تھیں مگر رجل مومن جب داعی بن کر کھڑا ہوا تو خدا کی حمایت اس کے ساتھ ہوگئی۔ فرعون اپنی ساری طاقتوں کے باوجود اس کے خلاف اپنے برے ارادوں

میں کامیاب نہ ہوسکا۔" (الرسالہ اگست ۱۹۸۶ء ص ۲۰)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دعوت الی اللہ کے ساتھ لازماً خدا کی طرف سے عصمت وحفاظت اگر اللہ تعالیٰ کا تکوینی قانون ہے یعنی قرآن کی تعبیر میں سنت اللہ میں سے ہے اور عصمت وحفاظت سے مراد جان اور دشمنوں کی طرف سے پیش آمدہ خطرات سے حفاظت ہے تو پھر بہت سے انبیاء کرام دعوت الی اللہ کی راہ میں قتل کس طرح کردیے گئے۔ بہت سے انبیاء بنی اسرائیل کا دعوت الی اللہ کی راہ میں شہید ہونا خود قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں مذکور ہے۔ سورۂ مائدہ کی آیت ہے: "لقد أخذنا میثاق بنی اسرائیل وأرسلنا الیھم رسلاً کلما جاءھم رسولٌ بما لا تھوی أنفسھم فریقاً کذبوا وفریقاً یقتلون۰" ترجمہ: (ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے، جب کوئی رسول ان کے پاس ایسی بات لے کر آیا جس کو ان کا جی نہ چاہتا تھا تو بعضوں کو انھوں نے جھٹلایا اور بعضوں کو قتل کردیا۔) سورۂ بقرہ میں ارشاد ربانی ہے: "واذا قیل لھم اٰمنوا بما أنزل اللہ قالوا نؤمن بما أُنزل علینا ویکفرون بما وراءہ وھو الحق مصدقاً لما معھم قل فلم تقتلون أنبیاء اللہ من قبل ان کنتم مؤمنین۰"

اس آیت کا ترجمہ جناب وحیدالدین خاں صاحب نے کیا ہے:

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کلام پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہمارے اوپر اترا اور وہ اس کا انکار کرتے ہیں جو اس کے پیچھے آیا ہے، حالانکہ وہ حق ہے اور سچا کرنے والا ہے اس کا جو ان کے پاس ہے، کہو اگر تم ایمان والے ہو تو تم اللہ کے پیغمبروں کو کیوں قتل کرتے رہے ہو۔)

(تذکیر القرآن جلد اول ص ۴۵)

خود وحیدالدین خاں صاحب نے بنی اسرائیل کے انبیاء و مصلحین کے قتل کرنے کی جو روایت تفسیر ابن کثیر کے حوالے سے نقل کی ہے وہ یہاں درج کی جاتی

ہے:

"ابو عبیدہ بن جراح کہتے ہیں کہ میں نے کہا اے خدا کے رسول! قیامت میں سب سے زیادہ سخت عذاب کس کو ہوگا؟ آپ نے فرمایا: وہ شخص جس نے نبی کو قتل کیا یا اس کو جو بھلائی کا حکم دیتا تھا اور ہر برائی سے روکتا تھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو عبیدہ یہود نے ایک صبح کو ایک وقت میں ۴۳ نبیوں کو قتل کیا۔ اس کے بعد ایک سو ستر آدمی بنی اسرائیل کے اٹھے اور انھوں نے قتل کرنے والوں کو بھلائی کا حکم دیا اور برائی سے روکنا شروع کیا تو انھوں نے ان سب کو اسی دن شام تک قتل کر ڈالا۔ (ابن کثیر)

(الرسالہ دسمبر ۱۹۸۲ء، ص ۲)

وحیدالدین خاں صاحب کے بعض مفروضات

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے اپنی تحریروں میں دعوت کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہ قرآن کی بے شمار آیتوں سے متصادم ہے۔ انھوں نے اپنی طرف سے بہت سے مفروضے قائم کر کے انھیں قرآن سے ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے اور اپنے کج مج نظریات کی کسوٹی پر تمام اسلامی تحریکات اور دینی کوششوں کو پرکھ کر کھوٹا ثابت کرنا چاہا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے فلسفۂ نصرت نے انہیں بھٹکا کر بہت دور تک پہنچا دیا ہے۔ انھوں نے جن جن تحریکوں کے بارے میں یہ محسوس کیا کہ جن مقاصد کے لیے انھیں برپا کیا گیا تھا وہ مقاصد بظاہر پورے نہیں ہوئے، ان تمام تحریکات کو انھوں نے اپنی فہم کے اعتبار سے دینی تحریکات کے دائرہ سے خارج کر دیا اور ان کے بارے میں رکیک تنقیدیں کی ہیں۔

چنانچہ اپنی مشہور کتاب "الاسلام" میں انھوں نے لکھا ہے:

"دور جدید میں جب مسلم ملکوں پر مغربی قوموں کا استیلا ہوا تو

ساری اسلامی دنیا کے سامنے ایک سوال تھا: "اس کے مقابلہ کے لیے کیا کیا جائے" اس وقت کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ دینی تعلیمات اور رسول کی سنت کی روشنی میں مثبت منصوبہ بنا کر اس کو بروئے کار لانے کی جدوجہد کی جاتی۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ ہمارے مجاہدین کا قافلہ منفی ردعمل کے راستوں پر چل پڑا۔

اس ردعمل کے دو بڑے دھارے تھے۔ ایک وہ جو زیادہ تر دفاعی نفسیات کے تحت وجود میں آیا تھا یہ لوگ مروجہ روایتی طریقوں کے مطابق مسلمانوں میں دینی روح پھونکنے میں لگ گئے، مثلاً دینی تعلیم کے لیے درس گاہوں کا قیام، عوام کو اسلامی عقائد اور عبادات سکھانے کے لیے دینی مجالس کا انعقاد، مسلمانوں کے مخصوص مفادات کے تحفظ کی کوشش وغیرہ۔ دوسرا طبقہ زیادہ انقلابی تھا اور اقدام کی تدبیریں تجویز کر رہا تھا۔ بیسویں صدی کا نصف اول اور اس سے پہلے کی مسلم دنیا پر نظر ڈالیں تو کثیر تعداد میں ایسے علماء و مفکرین نظر آئیں گے جو قوم کے اندر نئے انقلاب کا صور پھونک رہے تھے۔ چند نام یہ ہیں:

محمد بن اسمٰعیل الامیر	(یمن)	۱۶۸۸ - ۱۷۶۸
شاہ ولی اللہ دہلوی	(ہند)	۱۷۰۳ - ۱۷۶۲
محمد بن عبدالوہاب نجدی	(سعودی عرب)	۱۷۰۳ - ۱۷۹۱
شاہ اسمٰعیل شہید	(ہند)	۱۷۷۹ - ۱۸۳۱
محمد بن علی السنوسی	(مغرب)	۱۷۸۷ - ۱۸۶۰
سید احمد شہید رائے بریلوی	(ہند)	۱۷۸۶ - ۱۸۳۱
امیر عبدالقادر	(الجزائر)	۱۸۰۷ - ۱۸۸۳
جمال الدین افغانی	(ایران، افغانستان)	۱۸۳۸ - ۱۸۹۷
عبدالرحمٰن کواکبی		۱۸۴۹ - ۱۹۰۲

مفتی محمد عبدہٗ	(مصر)	۱۸۴۹-۱۹۰۵
رشید رضا	(مصر)	۱۸۶۵-۱۹۳۳
شکیب ارسلان	(شام)	۱۸۶۹-۱۹۴۶
ڈاکٹر محمد اقبال	(برصغیر ہند)	۱۸۷۷-۱۹۳۸
حسن البناء	(مصر)	۱۹۰۶-۱۹۴۸

اس قسم کے مفکرین کی تحریروں اور تقریروں نے سارے عالم اسلام میں ایک آگ لگادی بیسویں صدی کے آغاز میں ایسی تحریکیں اٹھیں جنھوں نے پوری پوری قوموں کو بلکہ بعض اوقات پوری مسلم دنیا کو متاثر کیا، مثلاً خلافت کمیٹی ہندوستان (سنہ ۱۹۱۳ء) مصر کی الاخوان المسلمون (سنہ ۱۹۲۸ء) جماعت اسلامی پاکستان (سنہ ۱۹۴۱ء) مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا (۱۹۴۸ء) وغیرہ

ان تمام تحریکوں کا ہدف اسلامی ریاست کا قیام تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی مگر وہ سب کی سب اپنے مقصد میں ناکام رہیں۔ اس کی واحد فیصلہ کن وجہ یہ تھی کہ انھوں نے سیاست کو اپنا میدانِ عمل بنایا جو نہ صرف نظریاتی طور پر اسلام کی جادۂ مستقیم سے ہٹا ہوا تھا اور اس لیے نصرتِ الٰہی کا استحقاق اسے نہیں مل سکتا تھا۔ بلکہ خالص عقلی طور پر بھی وہ صحیح نہ تھا؛ کیونکہ یہ لوگ اپنے حریف کو ایک ایسے میدانِ مقابلہ میں نبرد آزمائی کی دعوت دے رہے تھے جہاں ان کا حریف جدید ساز و سامان سے لیس تھا جب کہ ان کا اپنا سرمایہ روایتی ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔" (الاسلام ص ۹۵-۹۶)

جناب وحید الدین خاں کی نظر میں دین کی راہ میں کی جانے والی جو کوششیں بظاہر اس مقصد کو پورا نہ کریں جن کے لیے وہ برپا ہوئیں انھیں احیاءِ اسلام کی کوششیں کہنا غلط ہے۔ انھوں نے افریقہ کے ایک سفر کی روداد الرسالہ (مئی [illegible]

میں شائع کی ہے، اس میں لکھتے ہیں:

"ایک بار کھانے کے وقت میری میز کے قریب چند باریش بزرگ بیٹھے ہوئے تھے ان کی اردو زبان اور موضوع گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ پاکستان سے آئے ہیں اور دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں، ایک بزرگ نے پُرجوش طور پر کہا کہ ہندوستان میں صرف ستّرہ دن کے اندر پچپن ہزار علماء شہید کر دیے گئے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت اسلام میں شہادت برائے شہادت ہے کہ شہادت کا کوئی مقصد ہے۔ انھوں نے کہا کہ شہادت کا مقصد بالکل واضح ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا اعلاء کلمۃ اللہ۔ میں نے کہا کہ دورِ اوّل میں پچپن سو سے بھی کم آدمیوں نے شہادت پائی اور اللہ کا کلمہ بلند ہو گیا موجودہ دور میں پچپن ہزار بزرگ شہید ہوئے اور اب تک اللہ کا کلمہ بلند نہ ہو سکا، اس پر وہ بگڑ گئے، میں نے آگے کلام کو جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے اٹھ گیا۔" (ص ۳۶)

خاں صاحب کے نزدیک تاریخ اسلام کی سیکڑوں جہاد اور اعلاء کلمۃ اللہ کی سرگرمیاں مقصد میں ناکام ہونے کی وجہ سے غیر اسلامی قرار پائیں، موصوف کا یہ نقطۂ نظر ہے جس نے انھیں تمام اسلامی تجدید و احیاءِ دین کی چند صدیوں کی تحریکات سے بہت بدگمان کر دیا اور انھوں نے بہت رکاکت اور کج فہمی سے ان تحریکات پر نارو انتقیدیں کیں۔ حقیقت یہ ہے کسی دینی جدوجہد اور دعوتی و اصلاحی تحریک کی ظاہری ناکامی سے اس تحریک ہی کو غیر اسلامی قرار دینا قرآن و سنت سے بے خبری کی بات ہے۔ اس پیمانے سے تو نعوذ باللہ اکثر انبیاء کرام کی دعوتی جدوجہد ناکام نظر آئے گی اور ان کی کوششوں کو نعوذ باللہ غیر دینی قرار دینا پڑے گا۔ کتنے ہی انبیاء کرام ایسے گزرے ہیں جن کی طویل تر دعوتی کوششوں کے باوجود ان پر ایمان لانے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی تو کیا نعوذ باللہ ہم اپنا یہ فلسفہ چلا سکتے ہیں کہ انبیاء کرام کی دعوت کا مقصد انسانوں میں اسلام کی نشر و اشاعت

تھی اور چونکہ فلاں فلاں انبیاء کرام کی کوششوں سے دو چار آدمی ہی راہِ حق پر آئے یا کوئی بھی شخص راہِ حق پر نہیں آیا لہٰذا وہ ناکام تھے، اور ان کی یہ کوششیں اللہ تعالیٰ کے منشاء کے مطابق نہیں تھیں، جناب وحید الدین خاں صاحب نے نصرت و عصمت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ بہت سے انبیاء کرام پر صادق نہیں آتا تو کیا اس کی بنا پر جناب وحید الدین خاں صاحب اس بات کی جرأت کریں گے کہ انبیاء کرام کی دعوتی جدوجہد کے بارے میں بھی وہی باتیں کہیں جو چند صدیوں کے مصلحین اور تحریکاتِ جہاد کے قائدین کے بارے میں زبان و قلم سے برابر کہہ اور لکھ رہے ہیں۔ جن لوگوں کی قرآن و سنت پر نظر ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کسی تحریک یا کسی شخص کے بارے میں صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ اس تحریک کے نتائج اور اس شخص کی کوششوں کے ظاہری انجام کی بنا پر نہیں کیا جاتا، اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کسی شخص نے جو جدوجہد کی ہے یا جو دینی اقدام کیا ہے وہ شرعی بنیادوں پر درست ہے یا نہیں اور وہ شخص اس جدوجہد کا مامور و مکلف ہے یا نہیں، اگر کتاب و سنت کے پیمانہ پر کوئی تحریک یا دینی جدوجہد پوری اترتی ہے تو محض ظاہری ناکامی کی بنیاد پر اسے باطل یا غیر شرعی نہیں کہا جا سکتا جس طرح بہت سے انبیاء کرام کی دعوت کی ظاہری ناکامی کی بنیاد پر ان کی دعوت کی قدر و قیمت مجروح نہیں ہوتی، مسلمان احکام شرعیہ کے مطابق جدوجہد اور سعی و عمل کا مکلف ہے، نتائج کا مکلف نہیں اور نہ ہی نتائج اس کے اختیار میں ہیں۔ جناب وحید الدین خاں صاحب نے دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں لکھا ہے:

"داعی اسی جذبہ کے تحت دعوتی کام کا آغاز کرتا ہے، وہ حکمت اور خیر خواہی کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی بات آخری حد تک لوگوں کو سنا دینا چاہتا ہے اس کے بعد اس مہم کے دوران جو واقعات پیش آتے ہیں۔ ان کا تعلق اصلاً کارِ تبلیغ سے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں سے ہے جن کے

اور شہادت و تبلیغ کا کام کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی کوئی ایک
صورت متعین نہیں کی جا سکتی اور نہ اس کی کسی مخصوص مثال کو لازمی طور پر
شہادت کی تشریح قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ داعی صرف پکارتے
پکارتے مر جائے، ہو سکتا ہے کہ وقت کی بعض اہم شخصیتیں اسلام قبول
کر لیں اور ان کے اثر سے خدا کا دین یکایک پورے علاقہ میں پھیل جائے
ہو سکتا ہے کہ مخاطبین سے ٹکراؤ ہو اور وہ تنہا یا اقتدار سے مل کر تحریک
کو ختم کر دینے کی سازش کریں۔۔۔۔ گویا داعی کی نسبت سے جو کچھ مطلوب
ہے وہ صرف یہ کہ خدا کے پیغام کو وہ آخری حد تک پہونچا دے اور آخر
عمر تک پہونچاتا رہے۔" (الاسلام ۲۰۔۲۱)

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے مذکورہ بالا اقتباس میں جس فکر کو اختیار کیا ہے اسی کی بنیاد پر اصلاح و تجدید اور جہاد کی تحریکات کے بارے میں بھی تجزیہ کیا جا سکتا ہے کوئی جہاد کی تحریک اگر قرآن و سنت کے شرائط پر پوری اترتی ہے تو اسے محض اس بنیاد پر باطل یا غیر شرعی نہیں کہا جا سکتا کہ بظاہر اس کا اختتام ناکامی پر ہوا۔

قرآن پاک کی تعبیر میں بھی نصرت و غلبہ کا انحصار فوری اور نقد کامیابی پر نہیں ہے بلکہ کوئی جد و جہد اگرچہ فوری طور پر ناکام نظر آرہی ہو اور اس کے نتائج جلد ظہور پذیر نہ ہو رہے ہوں لیکن مستقبل قریب و بعید میں اس کے دیرپا اور گہرے اثرات مرتب ہوتے ہوں تو اسے بھی کامیاب اور غالب قرار دیا جاتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے سلسلہ میں قرآن پاک میں جو آیت ہے وہ اس دعویٰ کی تصدیق کرتی ہے۔ جناب وحیدالدین خاں صاحب مئی ۱۹۸۵ء کے الرسالہ میں اس آیت کا ترجمہ و تفسیر لکھتے ہیں:

"قرآن میں ارشاد ہوا ہے اے ایمان والو! تم لوگ اللہ کے
مددگار ہو جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریین سے کہا کہ کون اللہ کے لیے

میرا مددگار بنتا ہے؟ حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار، پس بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ منکر ہو گیا پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کی اور وہ غالب ہو گئے۔"

(سورہ الصف۔ ۱۴)

مگر واقعات بتاتے ہیں کہ مومنین مسیح بہت تھوڑے اور کمزور تھے اور مخالفین بہت زیادہ اور طاقتور تھے، چنانچہ اس وقت عملاً جو ہوا وہ یہ کہ حضرت مسیح کی دعوتی جدوجہد کی تکمیل کے بعد یہود کے منکر طبقہ نے آپ کے ساتھیوں کو دبا لیا اور بزعم خود پیغمبر کو سولی پر چڑھا دیا۔

پھر سوال یہ ہے کہ فاصبحوا ظاھرین کا واقعہ کب اور کیونکر پیش آیا۔ قصہ یہ ہے کہ وقتی طور پر تو منکرین مسیح کا گروہ غالب آ گیا۔ انھوں نے حضرت مسیح کو سولی پر چڑھانے کی کوشش کی مگر آپ کو خدا نے عزت کے ساتھ آسمان پر اٹھا لیا۔ مگر خدا کا قانون یہ ہے کہ اتمام حجت کے بعد انکار کو وہ معاف نہیں کرتا۔ چنانچہ جو کام مسیح کے ابتدائی مومنین نہ کر سکے تھے، اس کو دوسروں کے ذریعہ لیا گیا۔ ۷۰ء میں رومی شہنشاہ تیتس نے یروشلم پر حملہ کیا، اور مخالفین مسیح (یہود) میں سے کچھ کو ہلاک کیا اور کچھ کو ذلیل کر کے ان کے مرکز سے نکال دیا جس کے بعد وہ تتر بتر ہو گئے۔ دوسری طرف مسیح کے ماننے والوں (نصاریٰ) کو یہ موقع ملا کہ وہ مسیحیت کے مبلغ بن کر اطراف کے ملکوں میں پھیلیں وہ رومی شہنشاہیت میں داخل ہوئے انھوں نے اپنی تبلیغ سے بہت سے لوگوں کو عیسائی بنایا، توسیع مسیحیت کا یہ عمل جاری رہا یہاں تک کہ رومی شہنشاہ قسطنطین (۲۷۲ - ۳۳۷) نے مسیحیت قبول کر لی، یہ الناس علیٰ دین ملوکھم کا زمانہ تھا، رومی شہنشاہ کے قبول مسیحیت کے بعد اس کی پوری مملکت میں مشرق سے مغرب تک مسیحیت پھیلنے لگی۔ حضرت مسیح کے رفع کے تین سو سال بعد یہ حال ہوا کہ رومی شہنشاہیت کے اکثر باشندے مسیحی بن گئے یہاں تک کہ مسیحیت دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن گیا۔ یہودی مسیحی قوموں کے محکوم ہو گئے، حتیٰ کہ موجودہ اسرائیل

جمیع اھل الادیان (تفسیر سورۂ فتح) کے ذریعہ حاصل کیا گیا تھا، ان میں سے کون سا واقعہ مراد ہے، اور وہ ہو گیا یا نہیں۔ اس سلسلے میں امام رازی نے پانچ رائیں نقل کی ہیں، تیسری رائے یہ ہے:

(الوجہ الثالث) المراد لیظھر الاسلام علی الدین کلہ فی جزیرۃ العرب وقد حصل ذلک فانہ تعالٰی ما ابقی فیھا احداً من الکفار۔ (تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۴۴۴)	اس کا مطلب عرب کے تمام دینوں پر اسلام کو غالب کرنا ہے اور یہ واقعہ ہو چکا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عرب میں ایک بھی کافر باقی نہیں رکھا۔

یہی رائے آیت کے الفاظ سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے کیونکہ اس میں کافرین ومشرکین کی کراہت کے علی الرغم اظہارِ دین کے وقوع میں لانے کا اعلان ہے، اس لیے ایسی کسی صورت کو اس کا مصداق قرار نہیں دیا جا سکتا جو ابھی وقوع میں نہ آئی ہو۔ شوکانی لکھتے ہیں: قد وقع ذلک وللہ الحمد (فتح القدیر جلد دوم ص ۲۲۸) اس عمل کا دائرہ عرب کی سرزمین تھی جیسا کہ بعض علماء نے صراحت کی ہے:

قیل: اراد لیظھرہ علی الدین کلہ فی جزیرۃ العرب وقد فعل۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۸ ص ۱۲۲)	اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ تھا کہ وہ جزیرۂ عرب میں دین کو غالب کرے گا اور اس نے ایسا کر دیا۔
قیل مخصوص بجزیرۃ العرب وقد حصل ذلک ما ابقی فیھا احداً من الکفار۔ (البحر المحیط جلد پنجم ص ۱۲۳)	(اظہارِ دین کا یہ عمل جزیرۂ عرب سے مخصوص ہے جو اس طرح ہو گیا کہ وہاں کوئی کافر باقی نہیں رہا۔

اظہارِ دین کا طریقہ بنی اسماعیل کے معاملہ میں یہ اختیار کیا گیا کہ نبی نے اپنے منکرین کے خلاف ایک ایسی جنگ چھیڑ دی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ یا تو ایمان لائیں ورنہ قتل کیے جائیں، صحیح حدیث میں آیا ہے:

اُمرت اَن اُقاتل الناس	مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مشرکین سے

(و فی النسائی) اقاتل المشرکین حتی	جنگ کروں یہاں تک کہ وہ کلمۂ توحید
شہدوا أن لا الٰہ الا اللہ، فاذا	کا اقرار کریں۔ جب وہ اس کا اقرار
قالوا ذالک عصموا منی دماءھم	کرلیں تو وہ اپنے جان و مال کو مجھ سے
واموالھم وحسابھم علی اللہ۔	محفوظ کرلیں گے اور ان کا حساب
(متفق علیہ)	خدا کے ذمہ ہے۔

(تعبیر کی غلطی ص ۲۲۸ تا ۲۴۴ دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۶ء)

'تعبیر کی غلطی' کے پورے دس صفحات میں وحید الدین خاں صاحب نے اظہار دین والی آیت پر بحث کی ہے اور اہم کتب تفسیر کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ یہ آیت دراصل ایک پیشین گوئی تھی جو پوری ہوگئی، عرب میں اسلام کو مکمل غلبہ حاصل ہوگیا اور سرزمین عرب پر ایک کافر بھی باقی نہیں رہا۔ خاں صاحب نے اظہار دین کے سلسلے میں علامہ آلوسی کی اس تشریح کو بہت پسند کیا تسلیط المسلمین علی جمیع اھل الادیان (مسلمانوں کو تمام مذاہب والوں پر مسلط کر دینا)۔

بعد میں وحید الدین خاں صاحب نے اظہار دین کی تفسیر میں اپنا رنگ بدلا اور یہ لکھنے لگے کہ اظہار دین سے فکری غلبہ مراد ہے، انھوں نے اپنی متعدد کتابوں میں یہی بات دہرائی ہے۔

موصوف اپنی کتاب "احیاء اسلام" اور "پیغمبر انقلاب" میں لکھتے ہیں:

"تاہم اللہ تعالیٰ کو حق کے اعلان کے ساتھ یہ بھی مطلوب تھا کہ دوبارہ حق کا اظہار ہو۔ حق کا اعلان تو یہ ہے کہ لوگوں کو حق کے بارے میں پوری طرح بتا دیا جائے۔ خیر خواہی اور حکمت کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کو اس طرح کھول دیا جائے کہ سننے والوں کے لیے یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہم اس سے بے خبر تھے۔ ہم یہ جانتے ہی نہ تھے کہ زندگی میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ اسی کا نام اتمام حجت ہے۔
اظہار اس سے آگے کی چیز ہے۔ اظہار کا مطلب یہ ہے کہ دینی فکر

دنیا کا غالب فکر بن جائے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے افکار پست اور مغلوب ہو کر رہ جائیں۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں اعلاء کلمۃ اللہ کہا گیا ہے۔ اظہار دین یا اعلاء کلمۃ اللہ سے مراد اصلاً حدود و قوانین کا نفاذ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد فکری غلبہ ہے۔ یعنی اس قسم کا غلبہ جیسا غلبہ موجودہ زمانہ میں جدید علوم کو قدیم روایتی علوم پر حاصل ہوا ہے، مثلاً سرمایہ داری پر سوشلزم کا فکری غلبہ شہنشاہیت پر جمہوریت کا فکری غلبہ اور قیاسی فلسفہ پر تجرباتی سائنس کا فکری غلبہ۔ جدید سائنسی دنیا میں بعض علوم نے غالب علم کی حیثیت حاصل کر لی ہے اور بعض دوسرے علوم نے ان کے مقابلہ میں اپنی برتری کھو دی ہے۔ اسی قسم کا غلبہ دین حق کا بھی دین باطل کے اوپر مطلوب ہے۔

خدا قادر مطلق ہے اس کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ حق کو دوسری باتوں پر فائق و برتر کر دے جس طرح اس نے سورج کی روشنی کو دوسری تمام زمینی روشنیوں پر فائق کر رکھا ہے، مگر موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے، یہاں خدا اپنے مطلوب واقعات کو اسباب کے روپ میں ظاہر کرتا ہے نہ کہ معجزات کے روپ میں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ اسباب کے دائرے میں اس مقصد کے لیے تمام ضروری حالات پیدا کیے جائیں اور اس کے بعد ایک ایسا پیغمبر بھیجا جائے جس کو خصوصی طور پر غلبہ کی نسبت دی گئی ہو۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے منصوبہ میں شامل کر کے نہ صرف حق کا اعلان کرے بلکہ حق کا اظہار بھی کر دے تاکہ خدا کے بندوں پر خدا کی نعمت کا اتمام ہو اور ان پر ان برکتوں کے دروازے کھلیں جو ان کی نادانی سے ان کے اوپر بند پڑے ہوئے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کی ان آیتوں میں کہی گئی ہے:

"یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ۝ ھو الذی أرسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ

ولو کرہ المشرکون ٥ (سورۂ صف ۸-۹)

(احیاء اسلام ص ۸۹، ۹۰، ۱۹۸۲ء۔ پیغمبر انقلاب ص ۱۸۴، ۸۵ ۱۹۸۸ء)

اظہار دین اور اتمام نعمت کی ایک تفسیر آپ نے مذکورہ بالا اقتباس میں دیکھی جس میں اظہارِ دین سے دین کا فکری غلبہ مراد لیا گیا، اظہار دین کی یہ تفسیر تعبیر کی غلطی والی تفسیر سے بالکل مختلف ہے۔ اس غلط فہمی یا "حسن ظن" میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ موصوف نے اپنی بعد کی تحریروں کے ذریعہ تعبیر کی غلطی والی تفسیر سے رجوع کر لیا ہے، کیونکہ ان تحریروں کے بعد تعبیر کی غلطی کا نیا ایڈیشن وحید الدین خاں صاحب نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا ہے۔ اسی نئے ایڈیشن سے ہم نے اظہار دین کی تفسیر اوپر نقل کی ہے۔

جناب وحید الدین خاں صاحب کی ذہنی ٹکسال میں معانی کی کمی نہیں برابر نئے نئے معانی ڈھلتے رہتے ہیں، اظہارِ دین والی آیت کی دو مختلف تفسیریں آپ نے خاں صاحب کے قلم سے ملاحظہ کیں۔ اب انھیں کے قلم سے تیسری تفسیر بھی پڑھیے موصوف اپنی تفسیر "تذکیر القرآن" میں سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۳۲، ۳۳ کا ترجمہ لکھنے کے بعد رقمطراز ہیں:

> "ان آیتوں میں خدا نے اپنے اس مستقل فیصلہ کا اعلان کیا ہے کہ وہ اپنے دین کو قیامت تک پوری طرح محفوظ رکھے گا، ماضی کی طرح اب ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا کہ لوگ اپنی ملاوٹوں سے خدا کے دین کو گم کر دیں یا کوئی طاقت اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے میں کامیاب ہو۔ ......
>
> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اس وقت لوگوں نے خود ساختہ طور پر بہت سے دین بنا رکھے تھے، عرب کے مشرکین کا ایک دین تھا جس کو وہ دین ابراہیم کہتے تھے۔ یہود کا ایک دین تھا جس کو وہ دین موسیٰ کہتے تھے نصاریٰ کا ایک دین تھا جس کو وہ دین مسیح کہتے تھے۔ یہ سب خدا کے دین کے خود ساختہ ایڈیشن تھے جن کو انھوں نے غلط طور پر خدا کی طرف سے آیا ہوا دین قرار دے رکھا تھا۔ خدا نے ان سب دینوں کو رد کر دیا اور پیغمبر عربی کے دین کو اپنے دین کے واحد مستند ایڈیشن کے طور پر قیامت تک کے لیے

بھی۔ (ص ۲۵)

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ کسی بھی جدوجہد یا دعوت کے فوری غلبہ ہی کو غلبہ نہیں کہا جاتا بلکہ بسا اوقات سیکڑوں سال بعد اس کے نتائج مرتب ہوتے ہیں، مستقبل بعید میں ظاہر ہونے والے نتائج چونکہ کوتاہ بین انسان کو نظر نہیں آتے اس لیے اسے وہ دینی جدوجہد اور تحریک ناکام نظر آتی ہے۔

اس مسئلہ میں دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک میں رسولوں اور اہلِ ایمان کے لیے پورے اطلاق کے ساتھ نصرت کی خبر قرآن پاک میں درج کی گئی ہے ارشاد ربّانی ہے:

"انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیاۃ الدنیا و یوم یقوم الاشھاد۔"

(بیشک ہم نصرت کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور اہلِ ایمان کی دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب کہ گواہ کھڑے ہوں گے۔)

دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انبیاء کرام اور داعیانِ حق کو غیر معمولی اذیتیں دی گئیں ناقابلِ برداشت آزمائشوں میں مبتلا کیا گیا اور انسان کی ظاہری نگاہوں کے اعتبار سے بہت سے انبیاء کرام اور داعیانِ حق بظاہر کامیاب نہیں ہو سکے اور ان کے دشمن غالب رہے، اسی مشکل کی اگر عقدہ کشائی کر لی گئی تو بہت سی ذہنی الجھنیں خود بخود حل ہو جائیں گی، اس سلسلے میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بہت بصیرت افروز وضاحت کی ہے چنانچہ سورۃ المومن کی آیت۔ ۵۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے رسولوں اور مومنین کی مدد کیا کرتے ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور ظاہر یہ ہے کہ یہ مدد بمقابلہ مخالفین اور اعداء کے مقصود ہے اکثر انبیاء علیہم السلام کے متعلق تو اس کا وقوع ظاہر ہے مگر بعض انبیاء علیہم السلام جیسے یحییٰ و زکریا و شعیب علیہم السلام جن کو دشمنوں نے شہید کر دیا یا بعض کو وطن چھوڑ کر دوسری جگہ ہجرت کرنا پڑی جیسے ابراہیم اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ

وسلم، ان کے متعلق شبہ ہو سکتا ہے۔ ابن کثیر نے بحوالہ ابن جریر اس کا جواب دیا ہے کہ آیت میں نصرت سے مراد انتصار اور دشمنوں سے انتقام لینا ہے خواہ ان کی موجودگی میں ان کے ہاتھوں سے یا ان کی وفات کے بعد۔ یہ معنی تمام انبیاء و مومنین پر بلا کسی استثناء کے صادق ہیں جن لوگوں نے اپنے انبیاء کو قتل کیا پھر وہ کیسے کیسے عذابوں میں گرفتار ہو کر رسوا کیے گئے اس سے تاریخ لبریز ہے، حضرت یحییٰ، زکریا اور حضرت شعیب علیہم السلام کے قاتلوں پر ان کے دشمنوں کو مسلط کر دیا جنھوں نے ان کو ذلیل وخوار کر کے قتل کیا، نمرود کو اللہ نے کیسے عذاب میں پکڑا، عیسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں پر اللہ تعالیٰ نے روم کو مسلط کر دیا جنھوں نے ان کو ذلیل وخوار کیا اور پھر قیامت سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ ان کو دشمنوں پر غالب فرمائیں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں ہی کے ہاتھوں زیر کیا ان کے سرکش سردار مارے گئے، کچھ قید کر کے لائے گئے باقی ماندہ فتح مکہ میں گرفتار کر کے لائے گئے، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کر دیا۔ آپ کا کلمہ دنیا میں بلند ہوا اور وہی سارے ادیان پر غالب آیا۔

(معارف القرآن جلد ۷، ص ۶۰۹-۶۱۰)

مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ابن جریر کے حوالے سے نصرت کی جو تشریح کی ہے اس کی روشنی میں جس طرح متعدد انبیاء کرام کے سلسلے میں پیدا ہونے والا اشکال دور ہو جاتا ہے، اسی طرح اسلامی تاریخ کی مختلف احیاء و جہاد کی تحریکوں کی وقتی ناکامی سے پیدا ہونے والا اشکال بھی دور ہوتا ہے۔ اللہ کے مخلص بندوں کے ذریعہ جو تحریکیں احیاء اسلام یا جہاد کے لیے برپا ہوئیں اگر آدمی وقتی کامیابی یا ناکامی سے صرف نظر کر کے ان کے دور رس اور مستقبل قریب و بعید پر پڑنے والے اثرات و نتائج کا حقیقت پسندی اور گہرائی کے ساتھ جائزہ لے تو اسے محسوس ہوگا کہ وہ تمام تحریکات نصرتِ الٰہی سے ہمکنار ہوئیں اور ان کے بڑے مفید اور گہرے اثرات تاریخ عالم پر پڑے۔

تفسیری تضاد کا ایک نمونہ

جناب وحید الدین خاں صاحب نے قرآنی آیت کی تفسیر میں جس طرح کی پراگندہ خاطری، غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے اس کا ایک اور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ ایک ہی آیت کی مختلف تفسیریں موصوف ایک ساتھ کرتے رہتے ہیں، اور بدترین شتر گربگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آیات قرآنی کے بارے میں جو چاہیں لکھتے رہتے ہیں۔

سورۂ توبہ کی آیت ہے:

"ھو الذی أرسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون" ۝ (آیت ۳۳)

اس آیت سے مولانا مودودی نے اقامتِ دین کے مشن پر استدلال کیا ہے۔

جناب وحید الدین خاں صاحب، مولانا مودودی کے استدلال کی تردید کرتے ہوئے "تعبیر کی غلطی" میں لکھتے ہیں:

> "یہ آیت دراصل دو آیتوں پر مشتمل ایک ٹکڑے کا حصہ ہے جو قرآن کی تین سورتوں میں آئی ہے (توبہ، فتح، صف) یہاں میں سورۂ توبہ کا ٹکڑا نقل کرتا ہوں:
>
> یریدون أن یطفئوا نور اللہ — یہ لوگ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے
> بافواھھم ویأبی اللہ الا أن — پھونکوں سے بجھا دیں، مگر اللہ اس کے
> یتم نورہ ولو کرہ الکافرون ۝ — بغیر ماننے والا نہیں ہے کہ وہ اپنے
> ھو الذی أرسل رسولہ بالھدیٰ — نور کو مکمل کردے خواہ کافروں کو کتنا ہی

ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون ○	ناگوار ہو، وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔
(سورۂ توبہ ۳۲-۳۳)	

پہلی بات یہ ہے کہ اس آیت میں "اظہار دین" (دین کو غالب کرنے) کا ذکر ہے جو ایک ایسا عمل ہے جو کافرین و مشرکین کی "کراہت" کے باوجود وقوع میں آتا ہے، جب کہ نبی کا اصل اور اولین کام تبلیغ دین ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ برضا و رغبت نبی کی بات قبول کر لیں اور اس کو اپنی زندگی میں شامل کر لیں...... ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اظہار دین (ولو کرہ المشرکون) کو نبوت کے اصل اور مکمل مشن کا ترجمان نہیں قرار دیا جا سکتا۔

دوسرے ان آیات میں چند واضح قرینے ایسے موجود ہیں جو ہم کو یہ ماننے کی طرف لے جاتے ہیں کہ یہاں جس عمل کا ذکر ہے وہ حقیقۃً کوئی انسانی مشن نہیں ہے بلکہ وہ ایک الٰہی منصوبہ ہے، وہ اپنی اصل نوعیت کے اعتبار سے خدا کے ایک فیصلہ کا اظہار ہے نہ کہ کسی انسانی کوشش کا بیان۔ یہ صحیح ہے کہ اس عمل کو وقوع میں لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بطور وسیلہ استعمال کیا تھا اور اس اعتبار سے آخری نبی کی غایت بعثت میں یہ چیز شامل تھی کہ آپ کے ذریعہ سے عرب میں اس واقعہ کو رونما کیا جائے گا، مگر اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک خدائی منصوبہ تھا نہ کہ نبوت کی وہ عام اور مخصوص ذمہ داری جس کا ایک پیغمبر اپنی ذاتی حیثیت میں مکلف ہوتا ہے......

تیسری بات یہ کہ اس حکم سے مہبط وحی نے اس کا جو مطلب سمجھا اور جس کے مطابق اس پر عمل کیا وہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ایسا عمل تھا جس کو فیصلۂ الٰہی تو کہہ سکتے ہیں مگر اسے انسانی مشن نہیں کہا جا سکتا۔ یہ اظہار دین جو صاحب روح المعانی کے الفاظ میں تسلیط المؤمنین علیٰ

کے اس گمراہ کن عمل میں ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے:

"قرآن پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو بنیادی کام بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک تزکیہ بھی ہے۔ سورۂ جمعہ میں ارشاد ربانی ہے:

هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین ٥
(سورۂ جمعہ آیت - ۲)

وہی وہ ذات ہے جس نے امیوں میں انھیں میں کا ایک رسول مبعوث کیا جو ان کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے، انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا جس کا ظہور خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، اس دعا کے اندر بھی تزکیہ کا ذکر بڑی اہمیت کے ساتھ ہے:

ربنا وابعث فیهم رسولا منهم یتلوا علیهم آیاتك ویعلمهم الکتٰب والحکمة ویزکیهم۔
(سورۂ بقرہ آیت-۱۲۹)

اے ہمارے رب! ان میں ایک رسول بھیج جو ان کے سامنے تیری آیات کی تلاوت کرے، انھیں کتاب و حکمت سکھائے اور ان کا تزکیہ کرے۔

تزکیہ کے لغوی معنیٰ "پاک صاف کرنا" ہے۔ جمہور مفسرین نے ان آیتوں میں تزکیہ سے مراد شرک، کفر، عقائد فاسدہ، اخلاق رذیلہ وغیرہ سے پاک کرنا لیا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ جمہور مفسرین کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آیت مذکورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا فرض منصبی تزکیہ قرار دیا ہے، تزکیہ کے معنیٰ باطنی نجاسات اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے، یعنی شرک و کفر اور عقائد فاسدہ نیز برے اخلاق تکبر، حرص، طمع، بغض، حسد،

حُبِّ مال و جاہ وغیرہ سے پاک کرنا۔ تزکیہ کو تعلیم سے جُدا کر کے مستقل مقصد رسالت اور رسول کا فرض منصبی قرار دینے میں اس طرف اشارہ ہے کہ تعلیم کتنی ہی صحیح ہو محض تعلیم سے عادۃً اصلاحِ اخلاق نہیں ہوتی، جب تک کسی تربیت یافتہ مربی کے زیرِ نظر عملی تربیت حاصل نہ کرے۔

(معارف القرآن جلد اول ص ۲۸۱، ۲۸۲ طبع بیت الفکر دیوبند)

اب وحید الدین خاں صاحب کے قلم سے تزکیہ کی انوکھی تشریح پڑھیے اور جدت طرازی پر سر دُھنیے، لکھتے ہیں:

"قرآن میں پیغمبر کے دو خاص کام بتلائے گئے ہیں: تعلیم کتاب اور تزکیہ۔ تعلیم کتاب سے مراد قرآن کی تعلیم ہے یعنی خدائی متن کو فرشتہ سے لے کر انسانوں تک پہونچانا۔ دوسری چیز تزکیہ ہے۔ تزکیہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں ایجوکیٹ کرنا یا باشعور بنانا کہا جاتا ہے یعنی لوگوں کے فکر کو ربانی فکر بنانا۔ ان کی ذہنی تربیت کر کے انھیں اس قابل بنانا کہ وہ اس طرح سوچیں جس طرح خدا چاہتا ہے کہ سوچا جائے؛ اور اس طرح فیصلہ کریں جس طرح خدا چاہتا ہے کہ فیصلہ کیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں جو مصلحین اٹھے ان میں مشترک طور پر بنیادی خامی پائی جاتی ہے کہ انھوں نے "تزکیہ" سے اپنے کام کا آغاز نہیں کیا۔ تقریباً ہر ایک کا یہ حال ہوا کہ مسلمانوں کے کچھ احوال اس کے سامنے آئے اور ان کو دیکھ کر وہ پُرجوش طور پر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ذہن بنائے بغیر اس نے عملی اقدامات شروع کر دیے۔ کسی نے انگریزی استعمار سے بگڑ کر جہادِ آزادی کا نعرہ لگایا۔ کوئی مغربی تہذیب کے غلبہ کو دیکھ کر میدانِ عمل میں آ گیا۔ کسی کو شردھانند کے قتل کے بعد پیدا ہونے والے حالات نے مجاہدِ اسلام بنا دیا۔ کوئی شدھی سنگٹھن کی تحریک سے بے چین ہو کر سرگرمِ عمل ہو گیا۔ کسی کو مسلم خلافت کے زوال نے جان دینے پر آمادہ کر دیا وغیرہ۔ یہ سب کام کا غیر پیغمبرانہ طریقہ ہے۔ کام کا پیغمبرانہ طریقہ

یہ ہے کہ اس کو تزکیہ سے شروع کیا جائے مذکراقدام ہے۔

تزکیہ کا ایک مطلب یہ ہے کہ افراد کو دین کا صحیح علم حاصل ہو جائے وہ صحیح دینی انداز میں سوچنے لگیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ غیر اسلامی نقطۂ نظر کے مقابلے میں اسلامی نقطۂ نظر کو پہچان سکیں۔ وہ مختلف قسم کے حالات میں یہ فیصلہ کر سکیں کہ کس وقت انھیں کیا کرنا ہے، اور کس وقت انھیں کیا نہیں کرنا ہے۔

تزکیہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ افراد کے اندر زمانہ شناسی کی صلاحیت پیدا ہو جائے وہ جان لیں کہ دنیا کے حالات کیا ہیں اور ان حالات میں دین کو کس طرح منطبق کیا جائے۔"

(الرسالہ نومبر ۱۹۸۵ء، ص ۲۵)

مذکورہ بالا اقتباس میں اصل عیب کا بند درمیانی پیراگراف ہے جس میں وحید الدین خاں صاحب نے آخری دور کے مصلحین کو کھری کھری سنائی ہے۔ موصوف کو اقبال مرحوم کے نظریہ احتساب کائنات پر کتنا ہی اعتراض ہو لیکن احتساب کائنات — بلکہ "استخفاف کائنات" کو خاں صاحب اپنا پیدائشی حق تصور کرتے ہیں، اور یہ ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اپنا وظیفہ پورا کرنے کے لیے اگر موصوف زندوں اور مردوں پر تبرا بازی کرتے رہیں تو اس "دورِ حریت" میں ان پر کون قدغن لگا سکتا ہے لیکن ان کے لیے یہ بات قطعاً موزوں نہیں تھی کہ اپنے "شغل استخفاف" کو مستند اور باوزن بنانے کے لیے قرآنی الفاظ و اصطلاحات کے معانی تبدیل کرنے لگیں۔ تزکیہ قرآن وسنت کی ایک معروف اصطلاح ہے۔ اس اصطلاح کو نیا معنی پہناتے وقت خاں صاحب پر لازم تھا کہ احادیث و آثار، ذخیرہ تفسیر و لغت سے کوئی ایک سند تو پیش کرتے لیکن موصوف کی مجبوری یہ ہے کہ وہ طبع زاد تفسیر کے لیے سند کہاں سے مہیا کریں۔

قارئین کی ضیافت طبع کے لیے خاں صاحب کے قلم سے تزکیہ کی دو اور

تفسیریں بھی پیش کی جارہی ہیں تاکہ موصوف کے ذہن کی جولانی وسیلانی کا اندازہ ہوسکے:

"تزکیہ کا مطلب ہے کسی چیز کو غیر موافق عناصر سے پاک کردینا، وہ موافق فضا میں اپنے فطری کمال کو پہنچ سکے۔ نبی کی آخری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسے انسان تیار ہوں جن کے سینے اللہ کی عقیدت کے سوا ہر عقیدت سے خالی ہوں۔ ایسی روحیں وجود میں آئیں جو نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہوں، ایسے افراد پیدا ہوں جو کائنات سے وہ ربّانی رزق پاسکیں جو اللہ نے اپنے مومن بندوں کے لیے رکھ دیا ہے۔"

(تذکیر القرآن اول ص ۵۸۔ سورۂ بقرہ آیت۔ ۱۲۹)

"دوسرا کام تزکیہ ہے۔ یہ مقصد زبانی گفتگو اور صحبت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ عمومی تحریر اور تقریر میں بات زیادہ تر اصولی انداز کی ہوتی ہے جب کہ انفرادی گفتگوؤں میں بات زیادہ متعین اور زیادہ مفصل صورت میں ہوتی ہے۔ نیز داعی کا اپنا وجود بھی پوری طرح اس کی تقویت پر موجود رہتا ہے۔ عمومی کلام اگر دعوت ہوتا ہے تو انفرادی ملاقاتیں مدعو کے لیے تزکیہ کے ہم معنی بن جاتی ہیں۔"

(تذکیر القرآن اول ص ۱۹۲، سورۂ آل عمران آیت۔ ۱۶۴)

کچھ اور تفسیری نمونے:

۵۔ سورۂ آل عمران میں حضرت مریمؑ کے واقعہ میں ارشاد ربّانی ہے: "کلما دخل علیها زکریا المحراب وجد عندها رزقاً قال یا مریم انّی لکِ هٰذا، قالت هو من عند الله، إنّ الله یرزق من یشاء بغیر حساب۔"

(آل عمران۔ ۳۷)

اس آیت کا ترجمہ خود جناب وحیدالدین خاں صاحب نے اپنی تفسیر میں اس طرح کیا ہے:

قائم کر دیا۔ آج اسلام واحد دین ہے جس کے متن میں کوئی تبدیلی ممکن نہ ہو سکی
جب کہ دوسرے تمام ادیان انسانی تحریفات کا شکار ہو کر اپنی اصل تصویر
گم کر چکے ہیں۔

(تذکیر القرآن جلد دوم ص ۴۰۴، ۴۰۵، ۱۹۸۶ء)

جناب وحید الدین خاں صاحب نے اپنی تحریروں سے قرآنی آیات کے ساتھ بدترین کھلواڑ کیا ہے۔ ایک ہی آیت کا جہاں جو مفہوم چاہا بیان کر دیا یہ سب نتیجہ ہے اس بات کا کہ ایک طرف انھوں نے عربی زبان و ادب کی ماہر اساتذہ سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ دوسری طرف احادیث و آثار سے ناآشنا ہیں، اس پر طرفہ تماشا یہ ہے کہ اپنے کو دنیا کا واحد مفسر اور مفکر سمجھتے ہیں۔ اس خود رو تعلیم و مطالعہ اور دعوی ہمہ دانی نے مل کر قیامت ڈھائی ہے اور موصوف کے خیالات اور تحریروں کو متضاد افکار و نظریات کا جنگل بنا دیا ہے۔

قرآن سے استدلال کا ایک نادر نمونہ :

۲۔ قرآن پاک انبیاء کرام کی دعوت کا مستند ترین ریکارڈ ہے۔ قرآن کی سورتوں میں انبیاء کرام کی زندگی صاف و شفاف آئینے کی طرح نظر آتی ہے اور انبیاء کرام کی دعوت اور طریقۂ دعوت کی انتہائی کامیاب تصویر کشی ملتی ہے، ہر نبی نے اپنی قوم کے سامنے دعوت توحید پیش کرنے کے ساتھ یہ اعلان بھی پوری صفائی اور وضاحت کے ساتھ کر دیا :

"لا أسئلکم علیہ اجرا۔ (میں تم سے اس دعوت دین پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا)۔

انبیاء کرام کے اس اعلان کا مفہوم و مقصد بالکل واضح ہے کہ داعی کو مدعوین سے دعوت دین کے عمل پر کوئی اجرت نہیں مانگنی چاہیئے، دعوت دین کا عمل پورے اخلاص اور بے لوثی سے انجام دینا چاہیئے، اس اعلان کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ داعی کو مدعو سے کسی جائز بنیاد پر کوئی جائز مطالبہ ہرگز نہیں کرنا چاہیئے، نہ وہ مدعو سے اپنے حق کا مطالبہ کر سکتا ہے، نہ اس کے ظلم پر انسداد ظلم کا مطالبہ کر سکتا ہے، نہ کسی اور بنیاد پر اس سے

کوئی مطالبہ کرسکتا ہے۔ اگر امتِ اجابت کے کسی فرد نے نبی کی کوئی چیز خریدی تو ظاہر بات ہے کہ نبی اس فرد سے سامان کی قیمت کا مطالبہ کرسکتا ہے، اس کا یہ مطالبہ "لا أسئلکم علیہ أجرا" کی خلاف ورزی نہیں، اگر نبی نے اپنی کافر قوم کے کسی فرد کے یہاں اجرت پر کام کیا تو نبی کی طرف سے اس کام کی طے شدہ اجرت کا مطالبہ "لا أسئلکم علیہ أجرا" کے دائرے میں نہیں آتا ہے، انبیاء کرام کے مذکورہ بالا اعلان کو یہ معنی پہنانا کہ داعی کے لیے مدعو سے کسی نوع کا کوئی مطالبہ حتی کہ اپنے ثابت شدہ مالی حقوق کا مطالبہ درست نہیں ہے۔ قرآن کے معانی سے مکمل بے خبری ہے یا دانستہ تحریف۔

ہندوستانی مسلمانوں کو داعی توحید ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ ہندوستان کے شہری ہونے اور مذہبی، تہذیبی، لسانی اقلیت ہونے کی بنا پر بہت سے حقوق دستورِ ہند اور دوسرے ہندوستانی قوانین کی بنا پر حاصل ہیں۔ ہندوستانی مسلمان ملک کے شہری ہونے کی بنا پر ملک کی تمام ذمہ داریوں میں دوسرے باشندگانِ ملک کے ساتھ شریک ہیں، ہر طرح کے ٹیکس ادا کرتے ہیں، حکومت کے قانونی مطالبات کو پورا کرتے ہیں اس لیے انھیں ملک کے خزانے، پیداوار اور ذرائع آمدنی سے منتفع ہونے کا بھی ملک کے دوسرے باشندوں کی طرح پورا حق ہے۔ مسلمانوں کا اپنے جائز حقوق کا مطالبہ لا أسئلکم علیہ أجرا کے دائرے میں نہیں آتا، کیونکہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ داعی حق ہونے کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ہندوستان کا شہری ہونے کی بنا پر ہے۔ مسلمان یہ نہیں کہتے، اسے برادرانِ قوم، اسے حکومتِ ہند ہم لوگ توحید کے داعی اور مبلغ ہیں، دعوتِ دین کا کام کرتے ہیں، اس لیے اس کے معاوضہ کے طور پر ہمیں فلاں فلاں حقوق دو، یہ یہ چیزیں دے دو۔ حقوق طلبی کا طریقہ کیا ہو، اس کے لیے کیا طرز اختیار کیا جائے، اس میں دو رائے ہوسکتی ہے لیکن سرے سے ان حقوق کے مطالبہ کو باطل کہنا اور لا أسئلکم علیہ أجرا کی خلاف ورزی قرار دینا آیت کے معنی میں تحریف ہے۔

جناب وحید الدین خاں صاحب کو چونکہ مسلم قائدین پر جارحانہ تنقیدیں کرنے

کا چسکا ہے اور وہ اپنے سوا ہر ایک کے کام اور طریقۂ کار کو بالکل باطل اور خلافِ قرآن سمجھتے ہیں اس لیے انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے کی جانے والی تمام کوششوں کو بیک جنبشِ قلم مسترد کر دیا ہے، اور اس کے لیے مضحکہ خیز دلائل پیش کیے۔

ہندوستانی مسلمانوں کا ایک مسئلہ تعلیم اور ملازمت میں ریزرویشن کا ہے، دستورِ ہند میں دیے گئے حقوق کی بنا پر باشندگانِ ملک کے متعدد طبقات کو ملازمت اور تعلیم وغیرہ میں ریزرویشن دیا گیا ہے، آزادی کے بعد سے مسلمانانِ ہند نے ملک کی دوسری اقوام کی طرح تیز رفتار ترقی نہیں کی، مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی ترقی رکی ہوئی ہے یا بہت محدود ہے، مسلمانوں کی اس تعلیمی اور اقتصادی پس ماندگی کے مختلف اسباب ہیں بعض داخلی اور بعض خارجی، اونچی تعلیم اور اونچی ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب ان کی آبادی کے تناسب سے بہت کم ہے۔ ان حالات میں بہت سے ماہرینِ تعلیم اور رہنمایانِ قوم کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے لیے تعلیم اور ملازمت میں ریزرویشن کا مطالبہ کیا جائے تاکہ تعلیم و ملازمت میں مسلمانوں کا تناسب بڑھے اور ان کی تعلیمی و معاشی پس ماندگی کا کچھ مداوا ہو۔ بعض ماہرینِ تعلیم اور دانشور ریزرویشن کا مطالبہ کرنے کے حق میں نہیں ہیں، ان کا خیال ہے کہ ریزرویشن مل جانے سے مسلمانوں کی ہمت جوئی اور قوتِ مقابلہ میں کمی آجائے گی، ریزرویشن کا کچھ فوری فائدہ تو مسلمانوں کو ضرور پہنچ جائے گا لیکن مستقبل میں مسلمانوں کے مزاج و نفسیات پر اس کے برے اثرات پڑیں گے۔ بہر حال یہ ایک تعلیمی اور معاشی مسئلہ ہے جس کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن جناب وحید الدین خاں صاحب نے اس مسئلے پر جس طرح اظہارِ خیال کیا ہے وہ ان کی فکری کج روی اور عدمِ توازن کا ایک نمونہ ہے:

> "ایک مجلس میں ایک صاحب رعایت اور ریزرویشن کی بات کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس ملک میں مسلمان اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے کہ ان کو ریزرویشن دیا جائے اور ان سے رعایت والا معاملہ کیا جائے۔ میں نے کہا کہ

یہ معاملہ سادہ طور پر رعایت مانگنے کا نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ یہ خدا کی طرف سے مایوسی کا اظہار ہے۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ آپ کے پیدا کرنے والے نے آپ کو کچھ نہیں دیا۔ اب آپ انسانوں سے مانگ کر اپنی محرومی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔"

(الرسالہ ستمبر ۱۹۸۹ء ص ۳۸-۳۹)

ریزرویشن کے مطالبہ کو خدا کی طرف سے مایوسی کا اظہار قرار دینا ایک عوامی واہمہ تو ہوسکتا ہے لیکن ایک دانشمندانہ تجزیہ اسے نہیں کہا جاسکتا۔

تزکیہ کی نئی تشریح:

۴۔ ہر علم و فن کی کچھ اصطلاحات ہوتی ہیں، یہی اصطلاحات دراصل اس علم و فن کی کنجی ہیں، فن کی اصطلاحات سے ناواقف رہ کر یا ان اصطلاحات کا غلط معنی سمجھ کر آدمی اس فن سے واقف نہیں ہوسکتا، اسی طرح قرآن وسنت کی بھی مخصوص اصطلاحات ہیں جو دین فہمی کی کنجی ہیں، اگر کوئی شخص ان اصطلاحات کے معنی تبدیل کر رہا ہے تو گویا وہ پورے دین کو محرف کرنا چاہتا ہے، اور کتاب وسنت کے طے شدہ اجماعی معانی بدلنا چاہتا ہے۔ صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، جہاد، تزکیہ، تلاوت وغیرہ کتاب و سنت کے اصطلاحی الفاظ ہیں جن کے متعین معانی ہیں۔ ان الفاظ کا استعمال اگر کہیں مجرد لغوی معنی کے لیے ہوا تو اولاً موقع استعمال سے اس کا علم ہوجاتا ہے، ثانیاً مفسرین اور شارحین حدیث نے بھی اس کی وضاحت کردی ہے۔ جناب وحیدالدین خاں صاحب کی تحریروں کا ایک گمراہ کن خطرناک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے متعدد اسلامی اصطلاحات کے معانی تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے اور لغت یا روایت کی ادنیٰ سند کے بغیر قرآن وسنت کی اصطلاحات کو نئے معانی پہنائے ہیں۔

اصطلاحات کی نزاکت یہ ہے کہ صرف ایک اصطلاح کے تبدیل کردینے سے سیکڑوں آیات واحادیث کے مفہوم اور پیغام پر اثر پڑجاتا ہے۔ خاں صاحب

"جب کبھی زکریا ان کے پاس حجرہ میں آتا تو وہاں رزق پاتا۔ اس نے پوچھا اے مریم! یہ چیز تمھیں کہاں سے ملتی ہے۔ مریم نے کہا کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے۔ بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں وحیدالدین خاں صاحب یہ الفاظ لکھتے ہیں:

"اللہ نے حضرت زکریا کو بڑھاپے میں اولاد دی۔ حضرت مریم کو حجرہ میں رزق پہونچایا۔ حضرت مسیح کو بغیر باپ کے پیدا کیا۔"

(تذکیر القرآن جلد اول ص ۱۳۵)

مذکورہ بالا آیت میں تمام مفسرین نے رزق سے مادی محسوس رزق ہی مراد لیا ہے اور اس آیت کے الفاظ نیز حضرت زکریا کا اندازِ سوال قطعیت سے اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اس آیت میں رزق سے مراد اس کا ظاہری مفہوم ہی ہے، لیکن جناب وحیدالدین خاں صاحب اپنی مشہور کتاب "الاسلام" میں عبادت کی تشریح کے تحت لکھتے ہیں:

"بندگی کا رویہ اپنی ظاہری شکل میں حکم کی تعمیل ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ دراصل اپنے آپ کو اس مقام پر لیجانا ہے جہاں بندہ خدا سے ملاقات کر سکے، جہاں اپنے رب سے اس کی سرگوشیاں ہوں، جہاں وہ اس کے سامنے روئے اور گڑگڑائے، جہاں وہ بے تابانہ اس سے چمٹ جائے........ دین کی اس دولت کو پانے کی پہچان کیا ہے؟ اس کی ایک پہچان یہ ہے کہ آدمی کو رزق رب (طٰہٰ - ۱۳۱) پہونچنے لگے، خدا کے حکم کی تعمیل میں بظاہر آپ جو کچھ کرتے ہیں وہ آپ کے اپنے اختیار میں ہے، چاہیں تو کریں اور چاہیں تو نہ کریں مگر اس عمل کے دوران جو مخصوص اندرونی کیفیات آپ پر گزرتی ہیں وہ آپ کے اختیار میں نہیں، آپ خود سے انھیں پیدا نہیں کر سکتے پھر یہ کیفیات کہاں سے آتی ہیں وہ دراصل خدا کی طرف سے ہیں، یہ مومن کا رزق ہے جس کے بغیر اس کی ایمانی شخصیت زندہ

نہیں رہ سکتی، یہی علم و عمل کا وہ رزق ہے جس کو حضرت مریمؑ کی ذات میں
دیکھ کر وقت کے نبی نے پوچھا تھا یہ تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے؟
انھوں نے جواب دیا، ھو من عند اللّٰہ۔" (آل عمران۔ ۳۷)

(الاسلام، ص ۹)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں رزق سے مراد اطاعت خداوندی کے دوران حاصل ہونے والی مخصوص اندرونی کیفیات ہیں۔ اس آیت میں رزق سے ایمانی کیفیات مراد لینا آیت کی کھلی ہوئی تحریف ہے۔ خود وحیدالدین خاں صاحب نے اپنی تفسیر میں رزق سے کیفیات مراد نہیں لی ہیں۔ یہاں پر وحیدالدین خاں صاحب کی تفسیر کے ڈانڈے فرقہ باطنیہ سے مل جاتے ہیں۔ یہ فرقہ قرآنی الفاظ کے ظاہر اور متبادر معنی کے علاوہ کوئی دوسرا معنی مراد لیا کرتا تھا جس کے لیے ان لوگوں کے پاس کوئی سند نہیں ہوتی تھی۔ اس اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خاں صاحب کے نزدیک سورۂ طٰہٰ کی آیت (۱۳۱) میں بھی رزقِ ربّ سے یہی باطنی کیفیات مراد ہیں۔ سورۂ طٰہٰ والی آیت میں موصوف نے اپنی تفسیر میں بھی یہی مفہوم مراد لیا ہے۔ حالانکہ مفسرین نے عمومًا اس آیت میں رزقِ ربّ سے مراد جنت اور آخرت کی نعمتیں لی ہیں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ رزقِ ربّ سے مراد نبوت اور وحی ہے۔ لیکن خاں صاحب نے جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ کسی مفسر نے مراد نہیں لیا۔

۶۔ سورہ فاطر کی آیت ۱۰ ہے: مَن کان یرید العزّۃ فللّٰہ العزّۃ جمیعًا الیہ یصعد الکلم الطیّب والعمل الصالح یرفعہ والذین یمکرون السیئات لھم عذابٌ شدید ومکر اُولٰئک ھو یبورۃ

اس آیت کا ترجمہ تذکیر القرآن میں اس طرح کیا گیا ہے: "جو شخص عزت چاہتا ہو تو عزت تمام تر اللہ کے لیے ہے اس کی طرف پاکیزہ کلام چڑھتا ہے اور عمل صالح اس کو اوپر چڑھاتا ہے اور جو لوگ بری تدبیریں کر رہے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کی تدبیریں نابود ہو کر رہیں گی۔

اس آیت کی تفسیر میں وحید الدین خاں صاحب لکھتے ہیں :

"موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اس لیے یہاں عزت وقتی طور پر ایک غیر مستحق کو بھی مل جاتی ہے۔ مگر آخرت میں ساری عزت ان لوگوں کا حصہ ہوگی جو واقعی اس کا استحقاق رکھتے ہیں، اس استحقاق کا معیار کلمۂ طیب اور عمل صالح ہے یعنی اللہ کو اس طرح پانا کہ وہی اس کی یاد بن جائے جس میں وہ جیے۔"

(تذکیر القرآن جلد دوم، ص ۱۴۰۰، ۱۴۰۱)

اس آیت میں جمہور مفسرین نے الکلم الطیب سے کلمۂ طیبہ مراد لیا ہے۔ وحید الدین خاں صاحب نے بھی اپنی تفسیر میں جمہور ہی کے قول کو اختیار کیا۔ لیکن "الاسلام" میں انھوں نے الکلم الطیب سے دعا مراد لی ہے، اور عمل صالح سے دعا کے موافق عمل، مطلق اعمال صالحہ ان کے نزدیک مراد نہیں، موصوف لکھتے ہیں :

"اگر ایک شخص مقام اضطرار پر ہو تو صرف دعا ہی نصرت کو کھینچنے کے لیے کافی ہے، امّن یجیب المضطر إذا دعاہ ویکشف السّوء (النمل ۶۲) گویا جو شخص مضطر ہو اس کے مستحق نصرت ہونے کی شرط صرف کلمات دعا سے پوری ہو جاتی ہے، لیکن جو شخص اگر وہ مقام اضطرار پر نہ ہو اس کے لیے دعا کے علاوہ دو مزید شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دعا کے موافق عمل کرے الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہٗ اس کی طرف چڑھتے ہیں کلمات پاکیزہ اور عمل صالح اس کو بلند کرتا ہے۔ دعا کے لحاظ سے عمل صالح یا دوسرے لفظوں میں موافق عمل کیا ہے، یہ اس دعا سے متعین ہوتا ہے جو کسی معاملہ میں نصرت کو طلب کرنے کے لیے آدمی مانگ رہا ہو۔" (الاسلام ص ۶۱)

اس اقتباس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ موصوف کے نزدیک الکلم الطیب سے دعا مراد ہے۔ ان کی یہ تفسیر جمہور مفسرین کی تفسیر کے خلاف ہے

اور خود ان کی تذکیر القرآن میں بیان کردہ تفسیر کے بھی خلاف ہے۔

۷۔ سورۂ بقرہ کی آیت ہے: "وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ" (۱۹۳)

سورۂ انفال کی آیت ہے: "وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ فإن انتھوا فان اللہ بما یعملون بصیر" (آیت۔ ۳۹)

ان دونوں آیات کی جناب وحید الدین خاں صاحب نے جو متضاد تفسیریں اپنی مختلف تحریروں میں کی ہیں انھیں ذیل میں نقل کیا جاتا ہے کیونکہ یہ تحریریں تبصرہ کی محتاج نہیں۔

"تعبیر کی غلطی" میں موصوف نے لکھا ہے:

۱۔ "آیت کے الفاظ کے مطابق کفار جس فتنہ میں مبتلا ہیں اور جس کی بنا پر ان سے جنگ کا حکم دیا جارہا ہے اس سے اگر وہ باز آجائیں تو ان کی مغفرت کردی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ مغفرت محض سیاسی اقتدار چھوڑنے یا فساد دنیا سے باز آجانے کا صلہ نہیں ہے بلکہ وہ صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو کفر و شرک کو چھوڑ دیں۔

۲۔ ارشاد ہوا ہے، قل للذین کفروا ان ینتھوا ....
... الآیۃ ـــ فقرہ کی یہ ساخت بتاتی ہے کہ یہاں نحوی اعتبار سے ان ینتھوا عن الکفر ہی مراد لیا جاسکتا ہے یعنی اگر وہ کفر سے باز آجائیں تو ان کے لیے بخشش ہے ورنہ نہیں۔

۳۔ پھر اس حکم کا جو منشا صاحب وحی نے سمجھا اور جس کے مطابق آپ نے اپنے دشمنوں سے جنگ کی وہ صریح احادیث کے مطابق یہی تھا کہ ان لوگوں سے کلمۂ توحید کے اقرار تک جنگ کی جائے۔

چنانچہ مفسرین بعض شاذ رایوں کو چھوڑ کر تقریباً سب کے سب اس آیت کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں ایمان لانے تک جنگ

کرنے کا حکم دیا گیا ہے نہ کہ عام معنوں میں محض فتنہ و فساد سے روکنے کا۔ ان کے نزدیک یہاں فتنہ سے مراد شرک ہے اور انتہاء کا مطلب ہے شرک سے باز آجانا۔ اس حکم کا مطلب یہ ہے کہ ان سے جنگ کر کے یا تو انھیں قتل کردو، یا انھیں مجبور کر دو کہ وہ شرک چھوڑ کر اسلام قبول کریں' ابن عباسؓ، ابوالعالیہ، مجاہد، سعید بن جبیر، حسن، قتادہ، ضحاک، ربیع، مقاتل بن حیان، سدی، زید بن اسلم سب سے متفقہ طور پر یہی منقول ہے۔"

اس کے بعد جناب وحیدالدین خاں صاحب مختلف مفسرین کا حوالہ تحریر کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں:

"۔۔۔ اصل یہ ہے کہ اس آیت میں جس قتال کا حکم دیا گیا ہے وہ ایک مخصوص قتال ہے جس کا تعلق آخری رسول سے ہے۔ یہ آیت کے الفاظ میں "کافرین" کے اوپر "سنت الاولین" کا اجراء ہے۔ یہاں کافرین سے مراد آخری رسول کے وہ مخاطبین ہیں جو اتمام حجت کی حد تک آخری رسول کی دعوت جان لینے کے بعد بدستور کافر بنے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں خدا کی سنت جو قرآن میں بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ان کو آفات ارضی و سماوی کے ذریعہ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ آخری رسول کے مخاطبین کے سلسلہ میں یہ سزا مخصوص اسباب کی بنا پر اس شکل میں نازل ہوئی کہ اہل ایمان کو یہ اذن دے دیا گیا کہ ان سے جنگ کر کے انھیں ختم کردو۔ (قاتلوهم يعذبهم الله بأيديكم۔ توبہ۔ ۱۴)

(تعبیر کی غلطی، ص ۲۲۶۔۲۲۹، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۶ء)

سورۂ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر جناب وحیدالدین خاں صاحب نے 'الرسالہ' کے جولائی ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں لکھی ہے، انھوں نے آخری صدیوں کی اسلامی تحریکات پر تبصرہ کرتے ہوئے فتنہ کی واپسی کے عنوان سے لکھا ہے:

"اسلام کو سیاست بنانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ فتنہ

(آزمائش) جس کو رسول اور اصحاب رسول نے بے پناہ قربانیوں کے بعد ختم کیا تھا، وہ اسلامی تاریخ میں دوبارہ لوٹ آیا ___ قدیم زمانہ میں سیاست اور شرک دونوں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، شاہی خاندان لوگوں میں یہ عقیدہ بٹھا کر حکومت کیا کرتا تھا کہ وہ دیوتا کی اولاد ہے، وہ خدا کی خدائی میں شریک ہے، وہ آسمانی دیوتاؤں کا دنیوی ظہور ہے۔ اسی بنا پر جب توحید خالص کی دعوت اٹھتی تو مشرکانہ عقائد کی بنیاد پر حکومت کرنے والے لوگ سمجھتے کہ یہ دعوت ان کے حق حکومت کو بے اعتبار بنا رہی ہے وہ اس کو مٹانے کے لیے اپنی ساری طاقت اس کے خلاف لگا دیتے اس طرح توحید کی دعوت اپنے آغاز ہی میں حکمرانوں کی حریف بن کر سخت مشکلات کا شکار ہو جاتی۔ چنانچہ قرآن میں حکم دیا گیا کہ وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ (ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے) یعنی اہل شرک کی یہ حیثیت ختم ہو جائے کہ وہ خدا کے بندوں کے لیے آزمائش بنے ہوئے ہیں خدا کے عقیدہ کو بزور سیاسی ادارہ سے جدا کر دو تاکہ دین کا معاملہ تمام تر ایمانی معاملہ بن جائے، وہ سیاسی معاملہ نہ رہے، اقتدار کے معاملہ سے اس کا اعتقادی تعلق ختم ہو جائے، دین کا تمام تر اللہ کے لیے ہو جانا یہ ہے کہ فتنہ (آزمائش) کی حالت ختم ہو جائے دونوں کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ رہے۔" (الرسالہ ص ۲۱)

جب ہم جناب وحید الدین خاں صاحب کی تفسیر تذکیر القرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ انھوں نے خود اپنی تفسیر میں اس آیت کی دو مختلف مقامات پر دو متضاد تفسیریں کی ہیں، سورہ بقرہ (آیت ۱۹۳) میں انھوں نے وہی تفسیر کی ہے جو 'تعبیر کی غلطی' میں کی ہے۔ لیکن سورہ انفال (آیت ۳۹) کی تفسیر بالکل طبع زاد کی ہے جس طرح انھوں نے الرسالہ جولائی ۱۹۷۹ء میں کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"فتنہ کا مطلب ستانا (PERSOCUTION) ہے، قدیم زمانہ میں سرداری اور حکومت شرک کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی، آج حکومت کرنے والے عوام کا نمائندہ بن کر حکومت کرتے ہیں، ماضی میں خدا، یا خدا کے شریکوں کا نمائندہ بن کر لوگ حکومت کیا کرتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں شرک کو قدیم سماج میں با اقتدار حیثیت حاصل ہو گئی تھی، اہل شرک اہل توحید کو ستاتے رہتے تھے۔ اللہ نے اپنے رسول اور آپ کے ساتھیوں کو حکم دیا کہ شرک اور اقتدار کے باہمی تعلق کو توڑ دو تاکہ مشرکین اہل توحید کو ستانے کی طاقت سے محروم ہو جائیں۔ چنانچہ آپ کے ذریعہ جو عالمی انقلاب آیا اس نے ہمیشہ کے لیے شرک کا رشتہ سیاسی نظام سے ختم کر دیا، اب شرک ساری دنیا میں صرف ایک مذہبی عقیدہ ہے نہ کہ وہ سیاسی نظریہ جس کی بنیاد پر حکومتوں کا قیام عمل میں آتا ہے۔"

(تذکیر القرآن جلد اول ص ۹۴ ۴، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۶ء)

'تعبیر کی غلطی' میں جناب وحید الدین خاں صاحب نے مولانا مودودی کے نظریات اور تفسیری رجحانات کا جائزہ لیتے وقت بار بار یہ بات دُہرائی ہے کہ مولانا مودودی نے جو تفسیر کی ہے اور آیت کا جو مطلب نکالا ہے وہ کسی قدیم مفسّر سے منقول نہیں ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"بعد کی صدیوں میں لغت اور تفسیر کی جو کتابیں مدوّن ہوئیں، ان کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ وہ صرف بعد کے لوگوں کی ذہنی کوششیں ہیں بلکہ اسی کے ساتھ وہ دورِ اوّل کے خیالات کا ریکارڈ بھی ہیں۔ یہ ایک تسلسل ہے جس کے ذریعہ سے قرنِ اول قرونِ آخر کی طرف منتقل ہوا ہے، اب دورِ اوّل کے لوگوں نے اگر وہی سمجھا تھا جو آج ایک شخص ان کی طرف منسوب کر رہا ہے تو وہ دورِ اول کے بعد کی نسلیں جنھوں نے دورِ اوّل کے اقوال و افعال کو محفوظ کرنے کا نہایت شدید اہتمام کیا ہے وہ اس اہم ترین بات کو ضرور

محسوس کرنی جس کے بغیر" قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی تعلیم نگاہوں سے مستور ہو گئی ہے"

(تعبیر کی غلطی ص ۱۴۹)

جناب وحیدالدین خاں صاحب سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے الرسالہ کے جولائی ۱۹۷۶ء کے شمارہ میں اور تذکیر القرآن میں سورہ انفال۔ ۳۹ کے تحت فتنہ والی آیت کی جو تفسیر کی ہے اس کی تائید میں کسی مفسر کا کوئی شاذ قول ہی دکھا دیں پھر اس سے بڑھ کر ستم یہ ہے کہ آیت فتنہ کی دونوں تفسیریں خاں صاحب ایک ساتھ چلا رہے ہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی آیت کی تفسیر کے سلسلے میں کسی شخص کی جو رائے پہلے رہی ہو اس میں مطالعہ اور نظر ثانی کے بعد تبدیلی آجائے اور وہ پہلی تفسیر سے رجوع کرے لیکن اس کی نظیر بہت مشکل سے ملے گی کہ کوئی شخص ایک ہی آیت کی دو الگ تفسیریں ایک ساتھ کرتا چل رہا ہو۔ 'تعبیر کی غلطی' میں انھوں نے وہی تفسیر اختیار کی ہے جو اکثر مفسرین کے نزدیک راجح ہے اس کے بعد الرسالہ جولائی ۱۹۷۹ء میں موصوف ایک بالکل نئی اور انوکھی تفسیر کرتے ہیں۔ تذکیر القرآن میں اس آیت کی دونوں مقامات پر الگ الگ تفسیریں کرتے ہیں۔ اور 'تعبیر کی غلطی' کا جو دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۶ء میں شائع ہوتا ہے اس میں وہ اپنی پہلی ہی تفسیر پر قائم ہیں۔ یہ صورت حال بڑی عبرتناک ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ انسان کا دل قرآن کی عظمت سے خالی ہو چکا ہے اور وہ قرآن کی جس آیت کا جہاں اور جب جو معنی ذہن میں آتا ہے لکھ دیتا ہے۔ اگر تاریخی واقعہ کے طور پر یہ بات لکھی جائے کہ خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کی مسلسل دعوتی جدوجہد کے نتیجہ میں اور نظریہ توحید کے ہمہ گیر اثرات کی بنا پر حکومت سے شرک کا رشتہ ٹوٹ گیا تو یہ کوئی خلاف واقعہ بات نہیں ہوگی لیکن اس بات کو قرآن پاک سے ثابت کرنے کے لیے آیت فتنہ کی من مانی تعبیر اور اسے ایک نیا معنی پہنانے کی کوشش بلاشبہ تحریف اور گمراہی ہے۔

۸۔ سورہ مائدہ کی تیسری آیت ہے: "الیوم یئس الذین کفروا من دینکم

فلا تخشوهم واخشونِ، الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔"

اس کا ترجمہ جناب وحید الدین خاں صاحب نے یہ کیا ہے:

"آج کافر تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے، پس تم ان سے نہ ڈرو صرف مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو پورا کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔ (تذکیر القرآن جلد اول، ص ۲۸۱)

اس کے بعد اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قرآن کی یہ آیت ذی الحجہ ۱۰ھ میں اتری۔ اس کے اترنے کے تقریباً ڈھائی مہینہ بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ اس آیت میں الیوم (آج) کا لفظ بہت بامعنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن دو مذہبی دوروں کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ قرآن کے بعد مذہب کی دنیا میں ایک نیا دور شروع ہوا ہے پہلے اگر تخشوھم کا دور تھا تو اب اخشونِ کا دور ہے پہلے اگر غلبۂ کفر کا دور تھا تو اب غلبۂ دین کا دور ہے۔ قرآن کی تکمیل نے اب خدا کے دین کو آخری طور پر مستحکم کر دیا ہے۔ اس آیت سے مزید یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اب تشویش اور اندیشہ کی چیز یہ ہے کہ اہلِ ایمان کے اندر خشیتِ الٰہی (خدا کا خوف) باقی نہ رہے، خارجی دشمنوں کی طاقت خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو اہلِ ایمان کے لیے کوئی خطرہ پیدا نہیں کرتی"۔

(الرسالہ ستمبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۹)

اسی آیت کے ذیل میں وحید الدین خاں صاحب 'تذکیر القرآن' میں لکھتے ہیں:

"آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا" یعنی تم کو جو احکام دیے جانے تھے وہ سب دے دیے گئے، تمہارے لیے جو کچھ بھیجنا مقدر کیا گیا وہ سب بھیجا جا چکا۔ یہاں علی الاطلاق دین کے

کامل کیے جانے کا ذکر نہیں بلکہ امت محمدی پر جو قرآن نازل ہونا شروع ہوا تھا اس کے پورا ہونے کا اعلان ہے۔ یہ نزول کی تکمیل کا ذکر ہے نہ کہ دین کی تکمیل کا۔ اس لیے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ آج میں نے دین کو کامل کر دیا بلکہ یہ فرمایا کہ، "آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے کامل کر دیا"۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کا دین ہر زمانہ میں اپنی کامل صورت میں انسان کو دیا گیا ہے خدا نے کبھی ناقص دین انسان کے پاس نہیں بھیجا۔"

(تذکیر القرآن جلد اول، ص ۲۴۲)

مذکورہ بالا آیت کی جناب وحیدالدین خاں صاحب نے جو تفسیر کی ہے وہ چند وجوہ سے غلط ہے، انھوں نے فلا تخشوھم واخشون کو بالکل نیا معنی پہنایا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک دائمی حکم ہے جو تمام انبیاء اور ان کی امتوں کو دیا گیا کہ صرف اللہ سے ڈریں لوگوں سے نہ ڈریں۔ سورۂ احزاب میں انبیاء کرام کی مشترک صفت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ الذین یبلغون رسٰلٰت اللّٰہ ویخشونہ ولا یخشون اَحدًا الا اللّٰہ۔ (آیت ۳۹) یعنی جو لوگ اللہ کے پیغامات پہونچاتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے۔ اسی طریقہ سے سورۂ مائدہ کی آیت ۴۴ میں یہودی علماء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے فلا تخشوا الناس واخشون ولا تشتروا بآیاتی ثمنًا قلیلاً، یعنی لوگوں سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور میری آیتوں کے بدلے میں ثمن قلیل نہ لو۔ اس طرح متعدد آیات قرآن پاک میں موجود ہیں جن میں اللہ کے ایک دائمی حکم کا ذکر ہے لیکن جناب وحیدالدین خاں صاحب نے جدت طرازی کے شوق میں اس آیت کے مفہوم میں وہ باتیں شامل کرنی چاہی ہیں جو اس آیت کے مفہوم میں فی الواقع داخل نہیں ہیں، خواہ وہ باتیں فی نفسہٖ درست ہوں، یہ کہنا کہ "پہلے اگر تخشوھم کا دور تھا تو اب اخشون کا دور ہے" کج فہمی کی بات ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے بلاشبہ ایک نئے دور کا آغاز ہوا جسے غلبۂ دین کے نام سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن

فلا تخشوھم واخشون سے یہ ثابت کرنا آیت کے معنی میں تحریف ہے، اسی طرح فلا تخشوھم واخشون کو یہ معنی پہنانا کہ "خارجی دشمنوں کی طاقت خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو اہلِ ایمان کے لیے کوئی خطرہ نہیں پیدا کرتی" آیت سے بالکل غیر متعلق ہے۔

الیوم اکملت لکم دینکم کے سلسلہ میں خاں صاحب نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ بھی ایجادِ بندہ ہے، آیت میں تو تکمیلِ دین کی خبر ہے اور موصوف اسے نزولِ قرآن کی تکمیل کا معنی پہنا رہے ہیں، جن لوگوں کی تفسیر پر نظر ہے وہ اس بات سے واقف ہیں کہ یہ آیت نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری آیت نہیں بلکہ اس کے بعد بھی آیات کا نزول ہوا اگرچہ ان آیات میں احکام کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق ترغیب و ترہیب سے ہے، لہٰذا یہ کہنا قطعاً درست نہیں ہے کہ "یہ نزول کی تکمیل کا ذکر ہے نہ کہ دین کی تکمیل کا"۔ جمہور مفسرین نے اس آیت سے تکمیلِ دین ہی کا مفہوم لیا ہے اور قرآن کے ظاہری الفاظ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے جمہور مفسرین کی ترجمانی کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

> "یہ آیت جو اس خاص شان اور اہتمام سے نازل ہوئی اس کا مفہوم ملتِ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی خوشخبری اور بھاری انعام ہے اور اسلام کا طغرائے امتیاز ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دینِ حق اور نعمتِ الٰہی کا انتہائی معیار جو اس عالم میں بنی نوعِ انسان کو عطا ہونے والا تھا آج وہ مکمل کر دیا گیا، حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے جو دینِ حق اور نعمتِ الٰہیہ کا نزول اور ترویج شروع کی گئی تھی اور ہر زمانہ اور ہر خطہ کے مناسب حال اس نعمت کا ایک حصہ اولادِ آدم کو عطا ہوتا رہا آج وہ دین اور نعمت مکمل صورت میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو عطا کر دی گئی، اس میں تمام انبیاء و رسل کے زمرہ میں سید الانبیاء کی سیادت اور امتیازی شان کا

تو اظہار ہے ہی اس کے ساتھ تمام امتوں کے مقابلہ میں امت مرحومہ کی بھی ایک خاص امتیازی شان کا واضح ثبوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ چند علماء یہود حضرت فاروق اعظمؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ تمھارے قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جو اگر یہود پر نازل ہوتی تو وہ اس کے نزول کا ایک جشنِ عید مناتے۔ فاروق اعظمؓ نے سوال کیا کہ وہ کون سی آیت ہے، انھوں نے یہی آیت الیوم اکملت لکم دینکم پڑھ دی، حضرت فاروق اعظمؓ نے ان کے جواب میں فرمایا: ہاں ہم جانتے ہیں کہ یہ آیت کس جگہ اور کس دن نازل ہوئی۔ اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ وہ دن ہمارے لیے دوہرے عید کا دن تھا، ایک عرفہ دوسرے جمعہ۔"

آگے اس آیت کے دوسرے جملوں کی تشریح کرنے کے بعد مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں:

"اس تقریر سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ "اکمالِ دین" آج ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کا دین ناقص تھا۔ بلکہ جیسا تفسیر محیط میں بحوالہ قفال مروزی رحمۃ اللہ علیہ ۔۔۔۔۔ نقل کیا ہے کہ دین تو ہر نبی و رسول کا اس زمانہ کے اعتبار سے کامل و مکمل تھا، یعنی جس زمانہ میں جس پیغمبر پر کوئی شریعت و دین اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا اس زمانہ اور اس قوم کے لحاظ سے وہی کامل و مکمل تھا لیکن اللہ جل شانہ کے علم میں یہ تفصیل پہلے سے تھی کہ جو دین اس زمانہ اور اس قوم کے لیے مکمل ہے وہ اگلے زمانہ اور آنے والی قوموں کے لیے مکمل نہ ہوگا، بلکہ اس کو منسوخ کرکے دوسرا دین و شریعت نافذ کی جائے گی، بخلاف شریعت اسلام کے جو سب سے آخر میں نازل کی گئی کہ وہ ہر جہت اور ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہے، نہ وہ کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ کسی خاص خطہ،

ملک یا قوم کے ساتھ. بلکہ قیامت تک ہر زمانہ اور ہر خطہ اور ہر قوم کے لیے یہ شریعت کامل و مکمل ہے۔" (معارف القرآن، ج ۳، ص ۲۲ تا ۲۸)

مذکورہ بالا آیت میں مفسرین نے اتمام نعمت سے مسلمانوں کے غلبہ و عروج اور مخالفین کا مغلوب و مفتوح ہونا مراد لیا ہے۔ چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

"اور اتمام نعمت سے مراد مسلمانوں کا غلبہ اور عروج اور ان کے مخالفین کا مغلوب و مفتوح ہونا ہے جس کا ظہور مکہ مکرمہ کی فتح اور رسوم جاہلیت کے مٹانے سے اور اس سال حج میں کسی مشرک کے شریک نہ ہونے کے ذریعہ ہوا۔" (معارف القرآن جلد سوم ص ۳۷)

لیکن وحیدالدین خاں صاحب نے یہاں بھی جمہور مفسرین سے بالکل ہٹ کر لکھا ہے:

"دین کے غلبہ و استحکام سے مراد اس کا سیاسی غلبہ و استحکام نہیں، سیاسی غلبہ اس دنیا میں کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ وہ اگر ایک مقام پر پایا جاتا ہے تو دوسرے مقام پر نہیں پایا جاتا، اس لیے یہاں غلبہ سے وہ غلبہ مراد لینا ہوگا جو ہر وقت اور ہر جگہ پوری طرح حاصل رہے جس میں کبھی انقطاع ممکن نہ ہو۔ اس قسم کا جاری اور مستمر غلبہ صرف فکر اور نظریہ سے متعلق ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں غلبہ سے مراد فکری غلبہ ہے یہ قرآن اور دین کامل کی وہ خصوصیت ہے جو اس کو ہر حال میں حاصل رہے گی۔ حتیٰ کہ اگر کسی مقام پر کوئی ایک شخص حامل قرآن ہو تو وہ بھی اس سے خالی نہیں ہو سکتا۔" (الرسالہ ستمبر ۱۹۸۶ء ص ۱۹)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موصوف نے فکری غلبہ کا نظریہ اس آیت کے کس جملہ سے اخذ کیا اور ان کے پاس اس کی سند کیا ہے؟ اس آیت میں لفظ الیوم (آج) اس طرف صاف صاف اشارہ کر رہا ہے کہ جس اتمام نعمت کا ذکر ہو رہا ہے اس کا جاری اور مستمر ہونا لازم نہیں ہے، حجۃ الوداع کے موقع پر جو صورت حال تھی کہ سارا عرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر نگیں ہو چکا تھا اور جزیرۃ العرب میں اسلام

کو مکمل غلبہ حاصل ہو چکا تھا مشرکین مفتوح و مغلوب ہو چکے تھے اسی کا اظہار اتممت علیکم نعمتی کے الفاظ میں کیا گیا ہے یہ کہاں سے سمجھ لیا گیا کہ اتمام نعمت کے عنوان سے جس چیز کا ذکر کیا گیا ہے اس کا جاری اور مستمر رہنا اور کبھی منقطع نہ ہونا ضروری ہے۔

تفسیر قرآن کے سلسلہ میں جناب وحید الدین خاں صاحب کی غیر ذمہ دارانہ روش کے چند نمونے اوپر درج کیے گئے اگر ان کی تحریروں سے اس طرح کی مثالیں جمع کی جائیں تو پوری ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ یہاں ان کی تمام منحرف تفسیری آراء کا احاطہ مقصود نہیں، ان کی تفسیر 'تذکیر القرآن' اس طرح کے نمونوں سے بھری ہوئی ہے۔ قارئین نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ جس شخص کا فہم قرآن اتنا ناقص ہو اور جو شخص آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں اتنا غیر ذمہ دار اور غیر محتاط ہو کر ایک ہی آیت کی متعارض تفسیریں کرتا رہتا ہو اور آثار و روایات، لغت و ادب سب کو نظر انداز کر دے، قرآنی آیات کو نئے نئے معانی پہناتا رہتا ہو اس کا تصورِ دین کس درجہ صحیح ہوگا اور براہِ راست کتاب و سنت سے واقفیت نہ رکھنے والے کے لیے اس کا تیار کردہ لٹریچر کس قدر سمّ قاتل ہوگا۔

مقامِ محمود کی طبع زاد تفسیر

جناب وحید الدین خاں صاحب نے اپنی تفسیر میں جس بے باکی اور بے احتیاطی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی ایک مثال سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۹ کی تفسیر ہے۔ اس آیت کے آخری ٹکڑے میں ارشاد باری ہے:

عسیٰ ان یبعثک ربک مقاما محمودا۔ — امید ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود پر کھڑا کرے۔

اس آیت میں مقام محمود سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع روایات مستند ترین کتب حدیث بخاری، مسلم وغیرہ میں موجود ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ "مقامِ محمود" سے مراد شفاعت کبریٰ کا مقام جو تنہا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو میدانِ حشر میں حاصل ہوگا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قرآن کے کسی لفظ یا آیت کی تفسیر ثابت ہونے کے بعد کسی انسان کے لیے جائز نہیں کہ کوئی دوسری تفسیر کرے یا اس میں کوئی اضافہ کرے۔ لیکن جناب خاں صاحب نے پوری بے باکی کے ساتھ "مقامِ محمود" کی تفسیر میں نقد دینے کی جرأت کی ہے۔ موصوف نے آیت بالا کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مقام محمود کے لفظی معنی ہیں تعریف کیا ہوا مقام۔ اس محمودیت کا ایک دنیوی پہلو ہے اور ایک اس کا اخروی پہلو۔ اخروی پہلو وہ ہے جس کو مفسرین شفاعت کبریٰ کہتے ہیں، جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے قیامت کے دن تمام

انبیاء اپنے مومنین کی شفاعت کریں گے۔ یہ شفاعت گویا ان کے مومن ہونے کی تصدیق ہوگی، جس کے بعد ان لوگوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا جن کو خدا جنت میں داخل کرنا چاہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سب سے بڑی ہوگی، کیونکہ اپنے امتیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہونے کی وجہ سے آپ سب سے بڑی تعداد کی شفاعت فرمائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محمودیت کا دنیوی پہلو یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ایسی تاریخ جمع ہو جائے کہ آپ تمام اقوام عالم کی نظر میں مسلم طور پر قابل ستائش اور لائق اعتراف بن جائیں، خدا کا یہ منصوبہ آپ کے حق میں مکمل طور پر پورا ہوا۔ آج دنیا کے تمام لوگ آپ کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ آپ کی نبوت ایک مسلم نبوت بن چکی ہے نہ کہ نزاعی نبوت جیسا کہ وہ آپ کے ظہور کے ابتدائی سالوں میں تھی۔"

(تذکیر القرآن ج ۱، ص ۶۸۹)

وحیدالدین خاں صاحب نے مذکورہ بالا اقتباس میں "مقام محمود" کی تفسیر میں بہ قلم خود اضافہ کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن اپنی بعض دوسری تحریروں میں انھوں نے یہ تکلف بھی ختم کر دیا اور "مقام محمود" کی صرف وہی تفسیر درج کی ہے جو خالص ان کے ذہن کی اختراع ہے۔ اپنی کتاب "عظمت قرآن" میں لکھتے ہیں:

"قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں جتنے پیغمبر آئے سب کی پیغمبری پر ان کے ہم عصر مخاطبین نے شک کیا (ہود ۶۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ابتداءً یہی صورت پیش آئی کہ آپ کے مخاطبین اول آپ کی نبوت پر شک کرتے رہے (ص ۸) تاہم اسی کے ساتھ قرآن میں اعلان کیا گیا کہ آپ کو مقام محمود پر کھڑا کیا جائے گا "عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا"۔ اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ آپ کی نبوت شک کے مرحلہ سے گزر کر ایک ایسے مرحلہ میں پہنچے گی جب وہ مکمل طور پر

تسلیم شدہ نبوت بن جائے۔ محمود (قابلِ تعریف) ہونا تسلیم و اعتراف کا آخری درجہ ہے۔" (صفحہ ۱۰۲)

احادیث صحیحہ کے ذریعہ "مقام محمود" کی واضح تفسیر معلوم ہونے کے بعد ایک سچا مسلمان اس کی قطعاً جرأت نہیں کر سکتا کہ اپنی جانب سے "مقام محمود" کی کوئی نئی تفسیر کرے یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تفسیر میں کوئی اضافہ کرے۔

وحیدالدین خاں صاحب نے "مقام محمود" کے دو پہلو نکال کر دنیوی پہلو کے عنوان سے جو تفسیر لکھی ہے وہ قرآن کے معنی میں کھلی ہوئی تحریف ہے، اس کا مطلب یا تو یہ ہوگا کہ نعوذ باللہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مقام محمود کے دنیوی پہلو سے بے خبر تھے اس لیے انھوں نے صحابۂ کرام کے بار بار دریافت کرنے پر ہمیشہ مقام محمود کی تفسیر شفاعت سے کی، یا نعوذ باللہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام محمود کا آدھا معنی بیان کیا اور آدھا چھپایا۔ امت مسلمہ کے تمام مفسرین بھی مقام محمود کے اس معنی سے نا آشنا رہے۔ چودھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں پہلی بار جناب وحیدالدین خاں صاحب پر مقام محمود کا یہ نیا معنی منکشف ہوا۔ قرآن پاک کے بارے میں اگر ان جدت طرازیوں کو تسلیم کیا جانے لگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر زمانہ میں لوگ قرآنی آیات کو نئے نئے معانی پہنانے لگیں گے اور قرآنی ہدایات و تعلیمات ہر دور میں بلکہ ہر مفسر کے اعتبار سے تبدیل ہوتی رہیں گی۔

وحیدالدین خاں صاحب نے مقام محمود کی جو تفسیر بیان کی ہے وہ فی نفسہٖ بھی درست نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت مسلمہ نبوت کہاں بن چکی ہے۔ دنیا میں اس وقت بھی کروڑوں انسان ہیں جو نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی تسلیم نہیں کرتے۔ مسلمانوں کے سوا دنیا کی تمام قومیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرتی ہیں۔ جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو تاریخ انسانی کی عظیم شخصیت یا عظیم مصلح تسلیم کرنا بالکل الگ بات ہے اور آپ کو نبی تسلیم کرنا بالکل دوسری

بات ہے۔

وحیدالدین خاں صاحب کا یہ لکھنا کہ "آپ کی نبوت ایک مسلم نبوت بن چکی ہے نہ کہ نزاعی نبوت جیسا کہ وہ آپ کے ظہور کے ابتدائی سالوں میں تھی" صورت حال کی غلط ترجمانی ہے، جو ہوش و حواس کو پوری طرح کھونے کے بعد ہی انسان کی زبان وقلم سے صادر ہو سکتی ہے۔ ایسی بے بنیاد بات کو قرآنی آیت کی تفسیر قرار دینا بڑی بددیانتی اور خدا سے بے خوفی کی بات ہے۔

وحید الدین خاں صاحب کا فہم حدیث

جناب وحید الدین خاں صاحب کے فہم قرآن کے کچھ نمونے اوپر درج کیے گئے ___ وحید الدین خاں صاحب کے بقول انھوں نے قرآن کے مطالعہ میں عمر کا ایک بڑا حصہ خرچ کیا ہے اس کے باوجود آپ نے دیکھا کہ انھوں نے قرآنی آیات کو تختۂ مشق بنایا ہے، ایک ہی آیت کی متعارض اور متضاد تفسیریں کی ہیں۔ بہت سی آیات کو بالکل نئے معانی پہنانے کی کوشش کی ہے جب عمر کا ایک طویل عرصہ مطالعہ قرآن میں گزارنے کے باوجود ان کے فہم قرآن کا یہ حال ہے تو احادیث نبویہ کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی قدر و قیمت خود واضح ہو گئی، وحید الدین خاں صاحب نے اپنی تحریروں میں اس کا اظہار و اعلان نہیں کیا کہ انھوں نے احادیث نبویہ کے وسیع اور عظیم ذخیرہ کے مطالعہ میں بھی عمر کا کوئی معتدبہ حصہ گزارا ہو۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں احادیث کے جو حوالے دیے ہیں وہ انتہائی ناقص اور ثانوی درجہ کے ہیں۔ اکثر و بیشتر انھوں نے تفسیر ابن کثیر اور دوسری تفسیروں سے احادیث لی ہیں، بعض جگہ حدیث کی اصل کتابوں کے حوالے بھی ملتے ہیں، لیکن وہ بھی نام کی حد تک مکمل حوالہ درج نہیں کرتے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اصل کتب حدیث سے حدیث لینے کے بجائے کسی ثانوی ماخذ سے اسے نقل کیا ہے لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن یہ جائزہ نامکمل رہے گا اگر ہم شرح احادیث کے سلسلے میں موصوف کی بعض جدت طرازیوں اور اجتہادات کو نمونے کے طور پر پیش نہ

نہ کردیں۔ اس لیے ذیل میں موصوف کے فہم حدیث کے چند نمونے درج کیے جاتے ہیں۔
مئی ۱۹۸۶ء کے 'الرسالہ' میں وحیدالدین خاں نے مسلم شریف کی ایک روایت نقل کی ہے جو ملاحم کے باب سے تعلق رکھتی ہے یعنی اس میں قیامت سے پہلے پیش آنے والے بعض واقعات کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔

حدیث کا ترجمہ خود وحیدالدین خاں صاحب کے الفاظ میں یہ ہے:

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم نے ایک شہر کے بارے میں سنا ہے جس کا ایک رخ خشکی کی طرف ہے، اور دوسرا رخ سمندر کی طرف۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسول! آپ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک بنو اسحاق کے ستر ہزار افراد اس سے جنگ نہ کریں گے، جب وہ لوگ اس شہر تک آئیں گے تو وہاں اتریں گے، وہ کسی ہتھیار سے نہ لڑیں گے اور نہ کوئی تیر ماریں گے وہ کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے پس اس کے دو رخوں میں سے ایک رخ گر جائے گا۔ ثور بن زید (راوی حدیث) نے کہا کہ میں اس کے سوا نہیں جانتا کہ آپ نے فرمایا کہ وہ جو سمندر کی جانب ہے پھر وہ لوگ دوبارہ کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، پس اس کا دوسرا رخ گر جائے گا، پھر وہ لوگ تیسری بار کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، پس وہ ان کے لیے کھل جائے گا وہ اس میں داخل ہو جائیں گے اور غنیمت حاصل کریں گے، پس جب وہ غنیمت تقسیم کر رہے ہوں گے، اسی اثناء میں پکار سنائی دے گی کہنے والا کہے گا کہ دجال نکل آیا پس وہ ہر چیز چھوڑ دیں گے اور لوٹ آئیں گے"

حدیث کا ترجمہ لکھنے کے بعد جناب وحیدالدین خاں صاحب لکھتے ہیں:

" اس روایت کی ذیلی تفصیلات سے ہٹ کر اس کے اصل مدعا کو دیکھئے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آئندہ ایسا زمانہ آئے گا جب لا الٰہ الا اللہ

اللہ اکبر کہہ دینے سے فتح حاصل ہو گی، بالفاظ دیگر ہتھیار کو استعمال کرنے کی ضرورت نہ ہو گی بلکہ اسلام کی فکری اور نظریاتی طاقت ہی قوموں کو مسخر کرنے کے لیے کافی ہو جائے گی۔"

مذکورہ حدیث میں آخری زمانہ کے ایک واقعہ کا ذکر ہے جس کے لیے حدیث میں "غزوہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ کی تشریح فرمائی تو کہا کہ، نہ وہ ہتھیار سے لڑیں گے اور نہ کوئی تیر چلائیں گے وہ صرف لا الہ الا اللہ کہیں گے اور ان کے لیے فتح کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غزوہ کا مطلب لازمی طور پر جنگ و قتال نہیں، فکری اور نظریاتی مہم بھی اسلام کے نزدیک غزوہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق غزوہ کی یہی قسم مسلمانوں کے لیے غلبہ اور کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہو گی۔" (الرسالہ مئی ۱۹۸۸ء ص ۱۲-۱۳)

وحیدالدین خاں صاحب نے ایک جگہ اس حدیث کے ترجمہ میں غلطی کی ہے اور اس کے بعد حدیث کی من مانی تشریح کی ہے۔ حدیث کے الفاظ کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

" فاذا جاءوھا نزلوا فلم یقاتلوا بسلاح ولم یرموا بسھم قالوا لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر، فیسقط أحد جانبیھا " جس کا ترجمہ موصوف نے یہ کیا ہے: "جب وہ لوگ اس شہر تک آئیں گے تو وہ وہاں اتریں گے، وہ کسی ہتھیار سے نہ لڑیں گے اور نہ کوئی تیر ماریں گے، وہ کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ پس اس کے دو رخوں میں سے ایک رخ گر جائے گا۔" اس ترجمہ میں تلبیس اور مغالطہ انگیزی سے کام لیا گیا ہے، حدیث کے مذکورہ بالا ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ ہتھیار وغیرہ سے قتال کرنے سے پہلے ہی لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر کے نعرے خرقِ عادت کے طور پر شہر کا ایک رخ گر جائے گا۔" یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مجاہدین جنگی تیاری اور اسلحہ کے بغیر اس شہر پر حملہ آور ہو جائیں گے، ایسے

کرنا تو قرآن و سنت کے نصوص کی خلاف ورزی اور غیر عاقلانہ اقدام ہوگا۔ حدیث کا یہ ٹکڑا کہ "وہ اس میں داخل ہوں گے اور غنیمت حاصل کریں گے، پس جب وہ غنیمت تقسیم کر رہے ہوں گے اسی اثنا میں پکار سنائی دے گی، کہنے والا کہے گا کہ دجال نکل آیا" اس حقیقت کو روشن کر دیتا ہے کہ اس حدیث میں فکری اور نظریاتی طاقت سے فتح ہونا مراد نہیں ہے ورنہ مالِ غنیمت حاصل ہونے اور اسے باہم تقسیم کرنے کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا؟ کیا جناب وحیدالدین خاں کے نزدیک فکری اور نظریاتی طور پر مفتوحہ علاقوں سے بھی مالِ غنیمت حاصل کر کے باہم "فکری مجاہدین" میں اسے تقسیم کیا جاتا ہے۔؟

حدیث کے مذکورہ بالا ٹکڑے کا غلط مطلب سمجھ کر وحیدالدین خاں صاحب نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ خالص ان کے ذہن کی پیداوار ہیں، کتاب و سنت میں ان کے لیے کوئی سند موجود نہیں ہے۔ اسلام کی فکری اور نظریاتی طاقت سے شہروں کا فتح ہونا کوئی ایسی نادر بات نہیں جس کا خاص طریقہ سے حدیث پاک میں قیامت سے پہلے پیش آنے والے اہم واقعات کے ذیل میں ذکر آتا، اسلام کی فکری اور نظریاتی طاقت سے تو بے شمار شہر اور علاقے فتح ہوتے رہے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ اکثر شراح حدیث نے یہی لکھا ہے کہ اس حدیث میں جس شہر کا ذکر ہے اس سے مراد قسطنطنیہ ہے، متعدد روایات میں قسطنطنیہ کے نام کی صراحت بھی ہے، فتح قسطنطنیہ کو قیامت سے پہلے پیش آنے والے اہم ترین واقعات میں شمار کیا گیا ہے۔ حدیث کے الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ فتح قسطنطنیہ کی نادر بات یہی ہوگی کہ ہتھیاروں کے استعمال کے بغیر لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر کی تکبیروں کی گونج سے خرقِ عادت کے طور پر یہ شہر فتح ہو جائے گا۔ اس سے وحیدالدین خاں صاحب کا یہ نتیجہ نکالنا کہ "ہتھیار کو استعمال کرنے کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ اسلام کی فکری اور نظریاتی طاقت ہی قوموں کو مسخر کرنے کے لیے کافی ہو جائے گی" انتہائی افسوسناک تلبیس ہے۔ جس شخص کو کتب احادیث کے براہ راست مطالعہ کی سعادت حاصل ہو وہ اچھی طرح جانتا

ہوگا کہ قیامت سے پہلے پیش آنے والی ایسی جنگوں کا ذخیرۂ احادیث میں بار بار ذکر ہے جن میں بھرپور قتال ہوگا اور اسلحہ کا استعمال ہوگا۔

مسلم شریف کی ایک روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

لاتقوم الساعة حتیٰ یقاتل المسلمون الیهود فیقتلهم المسلمون حتیٰ یختبأ الیهودی من وراء الحجر والشجر فیقول الحجر والشجر یا مسلم یا عبد الله هٰذا یهودی خلفی فتعال فاقتله۔

(کتاب الفتن باب الملاحم فصل اول مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسلم)

(قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ مسلمان یہودیوں سے قتال کریں گے اور مسلمان یہودیوں کو قتل کریں گے، حتیٰ کہ یہودی پتھر اور درخت کی اوٹ میں چھپے گا تو پتھر اور درخت آواز دیں گے اے مسلمان! اے اللہ کے بندے! یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے آ کے اسے قتل کر دے۔)

معلوم نہیں کہ وحید الدین خاں صاحب کے ذہن میں یہ بات کہاں سے راسخ ہوگئی کہ آخری دور میں اسلام کی فکری اور نظریاتی طاقت ہی قوموں کو مسخر کرنے کے لیے کافی ہو جائے گی۔ موصوف پوری صفائی کے ساتھ تو یہ نہیں لکھ پا رہے ہیں کہ جہاد کا حکم اب باقی نہیں رہا لیکن اپنی تحریروں سے بار بار قارئین کے دماغوں میں اسی قسم کا نظریہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس سلسلے میں انھیں آیات و احادیث کو غلط معانی پہنانے سے بھی باک نہیں۔ موصوف اپنی کتاب احیاء اسلام میں لکھتے ہیں:

"موجودہ زمانہ میں کرنے کا اصل کام یہی ہے کہ ملحدانہ طرز فکر کو مغلوب کیا جائے تاکہ توحید اپنا غلبہ کا مقام دوبارہ حاصل کر سکے، اللہ تعالیٰ کو یقیناً معلوم تھا کہ آئندہ دورِ الحاد آنے والا ہے اس لیے اس کی نصرت دوبارہ متحرک ہوئی۔ پچھلے ہزار سالہ عمل کے دوران اس نے دوبارہ ایسے

حالات پیدا کرنا شروع کیے جو بالآخر دعوتِ توحید کے معاون بن سکیں۔ یہ عمل اب اپنی تکمیل کے مرحلہ میں پہونچ گیا ہے آج اگرچہ بظاہر الحاد کا فکری غلبہ ہے مگر وہ حالات پوری طرح پیدا ہو چکے ہیں جن کو استعمال کرکے دوبارہ توحید کو فکری غلبہ کا مقام دیا جا سکے۔ پہلے مرحلہ میں غلبۂ توحید کا کام دعوت کے بعد طاقت کے ذریعہ انجام پایا۔ قاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ (البقرہ۔۱۹۳)۔ بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق (الانبیاء۔ ۱۸)۔ مگر دوسرے مرحلہ میں یہ کام تبیین وتبلیغ کے ذریعہ انجام پاتا ہے، جیسا کہ قرآن کے اشارہ سے معلوم ہوتا ہے، سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتیٰ یتبیّن لھم انہ الحق، أولم یکف بربّک انہ علی کل شیئ شھید۔ "ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے دنیا میں بھی اور ان کے اندر بھی یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ قرآن بالکل حق ہے۔ کیا تیرے رب کا ہر بات پر شاہد ہونا کافی نہیں۔"

(احیاء اسلام، ص ۱۰۲، سنہ اشاعت ۱۹۸۲ء)

جناب وحید الدین خاں صاحب نے اسلامی تاریخ کی جو فرضی تقسیم کی ہے اسے قرآن سے ثابت کرنے کے لیے انھوں نے مذکورہ بالا آیت کا تعلق بعثتِ محمدی سے ایک ہزار سال کے بعد پیش آنے والے احوال سے جوڑنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کیا حالانکہ آیت میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ ہم اسے دوسرے ہزار سالہ مدت کے لیے مخصوص کریں۔ آفاق وانفس میں ربّانی آیات کا ظہور اور اس کے مطالعہ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اس میں اور تیزی آگئی، اسی کی پیشین گوئی مذکورہ بالا آیت میں ہے۔

متعدد احادیث میں صراحتاً اس طرح کی پیشین گوئیاں موجود ہیں کہ اللہ کی راہ میں جہاد وقتال کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا، مثلاً مسلم شریف کی روایت ہے:

عن جابر بن سمرة قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰہ علیه
وسلم لن يبرح هذا الدين قائما يقاتل عليه عصابة
من المسلمين حتى تقوم الساعة۔

(کتاب الجہاد، فصل اول، مشکوٰۃ شریف بحوالہ مسلم شریف)

(حضرت جابر بن سمرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے ارشاد فرمایا، یہ دین برابر قائم رہے گا اس کے لیے مسلمانوں کا ایک گروہ
قتال کرتا رہے گا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے۔)

سنن ابو داؤد میں حضرت عمران بن حصین کی روایت ہے:

قال رسول اللّٰه صلی اللّٰہ علیه وسلم لاتزال طائفة
من أمتي يقاتلون على الحق ظاهرين على من ناوأهم حتی
يقاتل آخرهم المسيح الدجال۔

(کتاب الجہاد، فصل ثانی، مشکوٰۃ شریف بحوالہ ابو داؤد)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ میری امت کا ایک
گروہ برابر راہ حق میں قتال کرتا رہے گا، اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا حتیٰ کہ
ان کا آخری گروہ دجال سے قتال کرے گا۔)

جناب وحیدالدین خاں صاحب کی تحریروں سے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ جہاد
وقتال سے چڑھنے کی حد تک بیزار ہیں، انھوں نے فریضۂ جہاد کو اپنے ذہن کے خانوں
سے بھی نکال باہر کیا ہے اور بار بار جہاد کو کاغذی اور قلمی جہاد میں داخل کرنے کی کوشش
کرتے ہیں۔ بے اختیار علامہ اقبال کے چند اشعار جہاد کے موضوع پر یاد آ رہے ہیں جو وحیدالدین
خاں صاحب کی نذر ہیں۔ اگرچہ وحیدالدین خاں صاحب سے یہ توقع نہیں کہ وہ اقبال
کی طرف سے کوئی نذرانہ قبول کریں گے:

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے — دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں — مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر

تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں | ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل | کہتا ہے کون اسے کہ مسلماں کی موت مر

(بالِ جبریل)

زیر بحث حدیث کے سلسلے میں اوپر جو وضاحتیں کی جا چکی ہیں ان سے یہ بات بخوبی معلوم ہو گئی کہ بنو اسحاق کے ستر ہزار غازیوں کے سلسلے میں جو بات حدیث میں کہی گئی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ جنگ و قتال کی تیاری کے بغیر اور اسلحہ کے بغیر چڑھائی کریں گے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ انھیں ہتھیاروں کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئے گی بلکہ خرقِ عادت کے طور پر ان کی تکبیروں سے شہر کی دیواریں مسمار ہو جائیں گی اور وہ فتحیاب ہو جائیں گے۔ ربا خاں صاحب کا یہ نکتہ "اس سے معلوم ہوا کہ غزوہ کا مطلب لازمی طور پر جنگ و قتال نہیں فکری اور نظریاتی مہم بھی اسلام کے نزدیک غزوہ ہے"۔ اس کی حیثیت ایک مغالطہ سے زیادہ نہیں۔ ذخیرۂ احادیث پر جن لوگوں کی سرسری نظر بھی ہے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ غزوہ شرعی اصطلاح کے اعتبار سے اسی حملہ اور چڑھائی کو کہتے ہیں جس میں دشمن سے جنگ کی تیاریاں ہوں لیکن غزوہ میں جنگ کا پیش آنا لازمی نہیں۔ حضورؐ کے بہت سارے غزوات میں سے چند ہی میں قتال کی نوبت آئی تھی۔

صلوٰۃ التسبیح کی روایت

نقد حدیث کے خود ساختہ اصول

علم حدیث سے جناب وحید الدین خاں کو کس حد تک مناسبت ہے اس کا اندازہ ایک مثال سے کیا جا سکتا ہے۔ موصوف نے ماہنامہ الرسالہ کے مئی ۱۹۷۶ء کے شمارہ میں صلوٰۃ التسبیح کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جو چار صفحات پر مشتمل ہے۔ صلوٰۃ التسبیح کی روایت حدیث کی متعدد مستند کتابوں میں پائی جاتی ہے، مثلاً ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ، اکثر محدثین نے صلوٰۃ التسبیح کی حدیث کو تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ اس حدیث کے بعض طرق اور اسانید میں محدثین کو کلام بھی ہے۔ جناب وحید الدین خاں صاحب نے صلوٰۃ التسبیح کے موضوع پر چار صفحات میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان سب پر بحث یہاں مقصود نہیں۔ لیکن ناظرین کے لیے یہ مشورہ ضرور ہے کہ اگر ممکن ہو تو جناب وحید الدین خاں صاحب کی علمی سطح اور طریقہ استدلال کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے اس مضمون کا مطالعہ کر لیں۔ فی الحال اس مضمون کے بعض مشتملات کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کیا جاتا ہے۔ جناب وحید الدین خاں صاحب صلاۃ التسبیح والی حدیث کا ترجمہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ :

"صلوٰۃ التسبیح کے سلسلہ میں سب سے پہلی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ بخاری اور مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا ہے جو حدیث کی سب سے زیادہ مستند کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ اگر صحابہ کے زمانہ میں اس کا رواج ہوتا تو ضرور اس کو صحیحین کے اندر جگہ پانا چاہیے تھا۔ اس وجہ سے بعض علماء کا

یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ صلاۃ التسبیح ان نئے طریقوں میں سے ہے جو تبع تابعین کے دور میں رائج ہوئے حتیٰ کہ ذہبی اور ابن جوزی نے صلاۃ التسبیح کی روایتوں کو موضوع قرار دیا ہے۔ اس کے رواۃ میں احمد ابن داؤد کا نام ہے جن پر کذب کا الزام ہے۔ اسی طرح ابن سمعان کا نام ہے جس کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

۲۔ علماء کی ایک تعداد نے صلاۃ التسبیح کی حدیث کا اس بنا پر انکار کیا ہے کہ اتنا زیادہ ثواب چار رکعت پر نا قابل فہم ہے۔

۳۔ اس حدیث کے جو الفاظ نقل کیے گئے ہیں اس میں کلام نبوت کی شان نظر نہیں آتی۔ کوئی بھی شخص جس کی نظر احادیث رسول پر ہو اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ آپ کا کلام عام طور پر اس انداز کا نہیں ہوتا جیسا کہ صلاۃ التسبیح والی روایتوں میں دکھائی دیتا ہے۔"

(ماہنامہ الرسالہ مئی ۱۹۷۷، ص ۲۹-۲۸)

یہاں پر صلاۃ التسبیح والی روایات کے سلسلہ میں ائمۂ حدیث کے نقطہائے نظر اور اختلافات کی وضاحت مقصود نہیں بلکہ جناب وحید الدین خاں صاحب نے صلاۃ التسبیح کی روایات کو نا قابل اعتبار قرار دینے کے سلسلہ میں جن دلائل کا سہارا لیا ہے ان کی روشنی میں موصوف کی حدیث دانی کی طرف ناظرین کو متوجہ کرنا ہے۔ موصوف نے صلاۃ التسبیح والی حدیث کو رد کرنے کے لیے جو پہلی وجہ لکھی ہے وہ حدیث میں موصوف کی تہی دامنی کا منھ بولتا ثبوت ہے، کسی روایت کے بخاری اور مسلم میں مذکور نہ ہونے کی وجہ سے اس کے غیر معتبر ہونے پر وہی شخص استدلال کر سکتا ہے جس کو علم حدیث کی بنیادی معلومات بھی نہ ہوں۔ امام بخاری و مسلم نے خود اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں تمام صحیح احادیث کا احاطہ کیا ہے، اصحاب نظر اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ بخاری و مسلم میں احادیث صحیحہ کا جتنا بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ اس سے کچھ زیادہ ہی صحیح احادیث بخاری و مسلم کے علاوہ دوسری کتب احادیث میں پائی جاتی ہیں۔ مشہور

محدث حاکم ابو عبداللہ نے المستدرک علی الصحیحین کے نام سے اس موضوع پر ضخیم کتاب مرتب کی ہے۔ ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، موطا امام مالک، مسند احمد بن حنبل، صحیح ابن خزیمہ وغیرہ، کتب احادیث میں ایسی بے شمار احادیث پائی جاتی ہیں جو صحیحین میں مذکور نہیں ہیں، لیکن مستند محدثین اور ناقدین حدیث نے انھیں صحیح اور قابل استدلال قرار دیا ہے۔

جہاں تک جناب وحیدالدین خاں صاحب کی ذکر کردہ دوسری وجہ کا تعلق ہے اس میں بھی کوئی قوت نہیں۔ صلاۃ التسبیح والی روایت میں چار رکعت نماز پر جس قدر ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے وہ خاں صاحب کو خواہ اپنے فہم کے اعتبار سے ناقابل فہم محسوس ہو لیکن جس شخص کی نظر احادیث کے پورے ذخیرہ پر ہو اس کے لیے اس میں کوئی ناقابل فہم بات نہیں ہے۔ بخاری اور مسلم کی بہت سی احادیث میں چھوٹے چھوٹے نیک اعمال پر بے پایاں اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ انسان اگر دنیادی عقل سے سوچے تو چھوٹے چھوٹے اعمال صالحہ پر ان عظیم انعامات اور بے حد و حساب اجر و ثواب کا وعدہ ایک افسانہ ہی محسوس ہوگا، لیکن جو شخص خدا وند تعالیٰ کی شان جود و عطاء اور غفاری و کریمی پر نظر رکھتے ہوئے اس طرح کی احادیث کو پڑھتا ہے اسے ان عظیم انعامات و ثوابات پر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ احادیث پرکھنے کے لیے اگر جناب وحیدالدین خاں صاحب کے اس پیمانہ کو بنیاد بنا لیا جائے جسے انھوں نے نمبر ۲ کے تحت لکھا ہے تو احادیث صحیحہ کا ایک بڑا ذخیرہ اس کی زد میں آجائے گا۔ جہاں تک نمبر ۳ کے تحت ذکر شدہ وجہ طعن کی بات ہے اس سلسلہ میں عرض ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیثیں صحیح سندوں کے ساتھ ثابت ہیں اگر انھیں اس بنیاد پر رد کیا جانے لگے کہ وحیدالدین خاں صاحب جیسے لوگوں کو ان میں کلام نبوت کی شان نظر نہیں آتی تو بہت بڑا فتنہ وجود میں آئے گا، اور ہر وہ شخص جسے عربی زبان کی معمولی شد بد ہوگی وہ مستند سے مستند احادیث کے بارے میں محض اس بنیاد پر شک و شبہ کا اظہار کرنے لگے گا کہ ان احادیث میں کلام نبوت کی شان نظر نہیں آتی۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ صلوٰۃ التسبیح والی حدیث کے بارے میں وحید الدین خاں صاحب نے جو تبصرے کیے ہیں ان سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ موصوف کو علم حدیث سے ادنیٰ مناسبت نہیں اور علم حدیث کی وہ بنیادی باتیں جو علوم حدیث کے متوسط طلباء کو بھی مستحضر ہوتی ہیں ان سے بھی جناب وحید الدین خاں صاحب مکمل طور پر ناآشنا ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مشہور محدث اور ناقد حدیث حافظ ابن حجرؒ عسقلانی نے صلوٰۃ التسبیح والی حدیث پر تفصیلی بحث کر کے اسے حدیث حسن ثابت کیا ہے۔ عصر حاضر کے مشہور محدث شیخ ناصر الدین البانی جو نقد حدیث میں کافی متشدد ہیں انھوں نے صلوٰۃ التسبیح والی حدیث کو موضوع اور بے اصل قرار دینے پر شدید نکیر کی ہے۔ (ملاحظہ ہو مشکوٰۃ المصابیح تحقیق الالبانی حدیث نمبر ۱۳۲۸، اجوبۃ الحافظ ابن حجر عن احادیث المصابیح مشکوٰۃ المصابیح جلد ۳، ص ۱۷۸۰-۱۷۷۹)

حدیث فہمی کا ایک اور نمونہ:

صحیح مسلم کی روایت ہے:

> عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يزال الناس يتساءلون حتى يقال هذا خلق الله الخلق فمن خلق الله، فمن وجد فی نفسه شیئا من ذلك فليقل: آمنت بالله۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان)

اس حدیث کا ترجمہ جناب وحید الدین خاں صاحب کے الفاظ میں یہ ہے:

> "حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لوگ سوال کرتے رہیں گے یہاں تک کہ کہا جائے گا " خدا نے مخلوقات کو بنایا، تو خدا کو کس نے بنایا ؟" جو شخص اس قسم کی بات اپنے اندر پائے تو وہ کہے کہ میں ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر۔"

اس کے بعد موصوف لکھتے ہیں:

"یہ اس آنے والے دور کی پیشین گوئی تھی جب کہ خالق کا مسئلہ

ٹوٹ جائے گا اور دنیا کی گمراہی خدا کو ماں کر اس کا شریک ٹھہرانے کی بجائے یہ ہوگی کہ وہ خود خدا ہی کو ماننے سے انکار کر دے، اس وقت اہل ایمان کا کام یہ ہوگا کہ وہ خالق کے عقیدہ کو از سرِ نو علمی مسلہ بنانے کی کوشش کریں اور الحاد کی فکری بنیاد کو ڈھانے پر سارا زور صرف کر دیں جس طرح قرن اول میں شرک کی بنیاد کو منہدم کیا گیا تھا۔"

(الاسلام تیسرا ایڈیشن صفحہ ۱۱۷)

مذکورہ بالا حدیث کو وحید الدین خاں صاحب نے پیشین گوئی قرار دیا ہے جس کا ظہور ان کے بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزار سال بعد جدید سائنسی انقلاب کے دور میں ہوا، میری معلومات کی حد تک حدیث کے شارحین نے اس حدیث کو پیشین گوئی نہیں سمجھا ہے، اسی لیے محدثین مذکورہ بالا حدیث کو "فتن و ملاحم" کے باب میں ذکر نہیں کرتے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیثیں جمع کی جاتی ہیں جن کا تعلق پیشین گوئی اور آخری زمانہ میں پیدا ہونے والے فتنوں سے ہوتا ہے، اس کے بجائے محدثین نے عموماً اس حدیث کو وسوسہ کے باب کے تحت درج کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہی روایت الفاظ کی تھوڑی تبدیلی کے ساتھ بخاری و مسلم میں مذکور ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس حدیث کا تعلق پیشین گوئی سے نہیں بلکہ انسان کے دل میں شیطان کی طرف سے پیدا کیے جانے والے وساوس سے ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يأتي الشيطان أحدكم فيقول من خلق كذا، من خلق كذا، حتى يقول من خلق ربك، فإذا بلغه فليستعذ باللّٰه ولينته" (بخاری و مسلم)

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ شیطان تم میں سے کسی کے پاس آکر کہتا ہے، یعنی دل میں یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ فلاں چیز کس نے پیدا کی، فلاں چیز کس نے پیدا کی؟ یہاں تک کہ وہ یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ تمھارے رب کو کس نے پیدا کیا جب شیطان کا وسوسہ یہاں تک پہنچ جائے تو وہ شخص اللہ کی پناہ چاہے اور مزید غور و فکر سے

باز آجائے۔

ابوداؤد میں یہ حدیث اس طرح ہے:

"عن ابی ھریرۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لایزال الناس یتساءلون حتی یقال ھذا خلق اللہ الخلق فمن خلق اللہ، فاذا قالوا ذٰلک فقولوا اللہ أحد، اللہ الصمد، لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا أحد، ثم لیتفل عن یسارہ ثلاثاً ولیستعذ باللہ من الشیطان الرجیم۔"

اس حدیث کے مختلف الفاظ کا انصاف پسندی کے ساتھ مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حدیث پیشین گوئی کے قبیل سے نہیں ہے جس کا ظہور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزار سال بعد ہوا۔ بلکہ اس میں انسان کے دل میں شیطان کے پیدا کیے ہوئے ایک وسوسہ اور اس کے علاج کا ذکر ہے، یہ وسوسہ کبھی دل تک محدود رہ جاتا ہے اور کبھی الفاظ کے پیکر میں آ کر انسانی مجلسوں میں بحث و گفتگو کا موضوع بن جاتا ہے، یہ وسوسہ پیدا ہونے کے لیے اور اس طرح کا سوال اُبھارنے کے لیے جدید سائنسی دور کی علمی ترقیات اور مطالعۂ کائنات کی ضرورت ہرگز نہیں، کوئی بھی انسان جب عالم کی تخلیق پر غور کرتا ہے اس کے ذہن میں سوالات اُبھرتے ہیں کہ یہ زمین کس نے پیدا کی؟ آسمان کس نے پیدا کیا؟ چاند و سورج کس نے پیدا کیے؟ ہر سوال کا جواب وہ دے لیتا ہے کہ اللہ نے پوری کائنات پیدا کی، اس کے بعد ذہن انسانی میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ سارے جہاں کے پیدا کرنے والے اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ اس مرحلہ پر انسانی ذہن جواب دینے سے قاصر رہتا ہے، شیطان اس کے اس وسوسہ کو قوت پہنچاتا ہے اور چاہتا ہے کہ انسان اس وسوسہ میں مبتلا رہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شیطانی وسوسہ کا علاج مذکورہ بالا حدیث میں تجویز فرمایا، خواہ یہ وسوسہ خود اپنے ذہن میں کائنات پر غور و فکر کرتے ہوئے پیدا ہو یا کسی مسلمان کی موجودگی میں دوسروں نے یہ

شیطانی سوال مجلس میں اٹھایا ہوا اور اسے بحث و گفتگو کا موضوع بنایا ہو، حدیث میں بیان کردہ علاج کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی شیطانی اثرات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے، تعوذ کے کلمات پڑھے، اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفات کے بارے میں جو قرآنی آیات ہیں خصوصاً سورۂ اخلاص ان کا استحضار اور ورد کرے، اگر وحیدالدین خاں صاحب یہ کہتے کہ دور الحاد میں مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ خالق کے عقیدہ کو از سرِ نو علمی مسلمہ بنانے کی کوشش کریں اور الحاد کی فکری بنیادوں کو ڈھانے پر زور صرف کریں تو اس سے کوئی اختلاف نہیں کرتا لیکن ان کی یہ کوشش کہ مذکورہ بالا حدیث میں نیا مفہوم پیدا کر کے اپنی اوپر والی بات ثابت کریں، حدیث کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہے، حدیث میں سینکڑوں سال بعد مسلمانوں پر عائد ہونے والی کسی ذمہ داری کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایک شیطانی وسوسہ اور سوال کا ذکر ہے ـــ جو تاریخ انسانیت کے ہر دور میں انسانی ذہنوں اور مجلسوں میں موجود رہا ہے اور قیامت تک موجود رہے گا۔

کوئی بات فی نفسہٖ کتنی ہی اہم اور حق ہو، اُسے ثابت کرنے کے لیے قرآن کی کسی آیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کے مفہوم میں تبدیلی پیدا کرنے کا جواز نہیں ہے، ایسا کرنا قرآن و سنت کی بے حرمتی اور دین کے ساتھ مذاق ہے۔

صحابۂ کرامؓ پر ناروا تنقید

حضرت اسماءؓ پر تنقید:

جہاد سے جناب وحیدالدین خاں صاحب کو جو ذہنی بُعد ہے اس نے ان کے قلم سے بھیانک ترین تحریریں لکھوائی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ موصوف کو اسی لیے پسند نہیں کہ انھوں نے وحیدالدین خاں صاحب کے بہ قول حاکم سے محاذ آرائی کا راستہ اختیار کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بڑی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے مرتبہ و مقام سے کون ناواقف ہوگا۔ یہ وہی خاتونِ اسلام ہیں جو ہجرت کے موقع پر چھپ چھپا کر غارِ ثور میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے کھانا پہنچاتیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ذات النطاقین کے لقب سے نوازا۔ حواریِ رسول حضرت زبیر بن العوام کے نکاح میں انھوں نے عمر گزاری۔ جناب وحیدالدین خاں صاحب نے اپنی ماں کے فضائل لکھنے کے بعد طنزیہ اور ہتک آمیز انداز میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا۔

> "عبداللہ بن زبیر کی ماں (اسماء) نے ان کو مسلم حکمراں سے لڑنے پر اکسایا، چنانچہ ایک شخص جو لڑائی کا ارادہ چھوڑ چکا تھا وہ دوبارہ لڑائی لڑنے پر آمادہ ہوگیا۔ شہنشاہ اکبر کی ماں (مریم مکانی) نے اکبر کو ملا عبدالنبی

کے خلاف کارروائی سے روکا۔ چنانچہ اکبر ان کے خلاف سخت کارروائی
کرنے سے باز رہا وغیرہ وغیرہ۔ راقم الحروف اگر بچپن میں ماں سے محروم ہو جاتا، یا
اگر مجھ کو ایسی ماں ملتی جو مجھے اپنے "دشمنوں" کے خلاف لڑنے جھگڑنے پر
اکساتی رہتی تو یقینی طور پر میری زندگی کا رخ بالکل دوسرا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ
کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسے انجام سے بچایا اور مجھ کو اپنی ایک صداقت
کے اظہار کا ذریعہ بنایا، تاہم اس عالم اسباب میں جو ہستی اس واقعہ کا
ابتدائی سبب بنی وہ یقیناً ایک خاتون تھی اور وہ بھی اسلامی اصولوں کے
مطابق ایک خانہ نشین خاتون"۔

(خاتون اسلام ص ۲۰۴ طبع ۱۹۹۸ء)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر تنقید:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے فضائل میں متعدد احادیث وارد ہیں، اس
لیے ان کے مرتبہ و مقام سے کون ناواقف ہوگا۔ ان کے ساتھ میدان کربلا میں جو
جاں گداز حادثہ پیش آیا اس کے بارے میں ہمیشہ دو رائیں رہی ہیں۔ اگر اس کو مان
بھی لیا جائے کہ کوفہ کی طرف سفر کرنے میں وہ حق بہ جانب نہیں تھے تو بھی یہ ان کی اجتہادی
غلطی کہی جائے گی، انھوں نے سمجھا تھا کہ یزید کی خلافت منعقد نہیں ہوئی ہے اور یزید
خلیفۃ المسلمین بننے کے لائق نہیں ہے اس لیے انھوں نے اہل عراق کی دعوت پر کوفہ
کی طرف سفر شروع کیا۔ جناب وحید الدین خاں صاحب نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے
کردار کو اپنی تحریروں میں مستقل نشانہ بنایا اور احادیث نبویہ کی غلط تشریح کرتے
ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ مسلمان حکمراں کے خلاف کبھی اور کسی حال میں خروج جائز نہیں۔

"میں نے کہا حسین اور حسن کا معاملہ امت کے لیے ایک آزمائش ہے
اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں دو رول ماڈل
(ROLE MODELS) رکھ دیے تھے۔ ایک رول ماڈل حسین کا جس سے امت کو

باہمی خوں ریزی کے سوا کوئی بھی مثبت فائدہ نہیں ملا۔ دوسرا رول ماڈل حسن کا ہے جس سے اسلام اور امت اسلام کو زبردست فائدے حاصل ہوئے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ظہور اسلام) اب اللہ تعالیٰ امتحان لے رہا ہے کہ آپ دونوں میں سے اپنے لیے کس رول ماڈل کو اختیار کرتے ہیں۔ حسین کے رول ماڈل میں چونکہ جاہ طلب اور سیاست پسند لوگوں کے لیے گنجائش نکلتی ہے، اس لیے لوگ اس کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ مگر واقعات ثابت کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس رول ماڈل کو اپنایا انھوں نے دوبارہ اسلام کی تاریخ میں بربادی کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کیا جب کہ حسن کا رول ماڈل اپنانے والوں نے ہمیشہ تاریخ میں مثبت اضافے کیے ہیں۔"

(الرسالہ اگست ۱۹۹۰ء ص ۴۴)

"حقیقت یہ ہے کہ امام حسین کا سیاسی اقدام بڑی حد تک ذاتی حوصلہ کے تحت وجود میں آنے والا اقدام تھا۔ اس وقت جو صحابۂ کرام زندہ تھے، وہ سب اس معاملہ میں آپ کے خلاف تھے۔ مکہ اور مدینہ کے بزرگ ان کو اس اقدام سے روک رہے تھے حتیٰ کہ خود آپ کے اعزہ بھی آپ سے اتفاق نہیں کر رہے تھے۔ اس کے باوجود ان کی حوصلہ مند طبیعت کے لیے کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکی ....

امام حسین نے مقابلہ کے آخری دن (۱۰ محرم ۶۱ھ) کربلا کے میدان میں یزید کی فوج کے سامنے جو تقریر کی وہ فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے، دیگر باتوں کے علاوہ آپ نے فرمایا: "عیسیٰ کا گدھا بھی اگر باقی ہوتا تو تمام عیسائی قیامت تک اس کی پرورش کرتے تم کیسے مسلمان اور کیسے امتی ہو کہ اپنے رسول کے نواسے کو قتل کرنا چاہتے ہو"۔ دراصل "رسول کے گدھے" کا معاملہ ہوتا تو مسلمان بھی اس کو پوجتے۔ رسول کے نواسے کا احترام کرنے کے لیے وہ دل و جان سے تیار تھے۔ مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ رسول کا نواسہ (امام حسین) ان کا سیاسی حریف بن کر کھڑا ہو گیا تھا، اور سیاسی حریف کو کوئی نہیں بخشتا، خواہ وہ عیسائی ہو یا مسلمان۔"

(الرسالہ فروری ۱۹۷۶ء، ص ۲۱)

فقہ اسلامی اور فقہاء مجتہدین

وحید الدین خاں کی نظر میں

فقہ اسلامی کی بنیادیں:

اسلامی شریعت کے چار اہم ترین مآخذ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس ہیں۔ قرآن وسنت جن کی حیثیت اسلامی شریعت میں بنیاد و اساس کی ہے ان میں اگرچہ اصولی طور پر قیامت تک پیش آنے والے نت نئے مسائل کا شرعی حل موجود ہے لیکن تمام مسائل وجزئیات کے احکام صراحتاً کتاب وسنت میں موجود نہیں ہیں۔ جزئیات وحوادث کی تعداد لامحدود ہے، اور آیات و احادیث کی تعداد محدود ہے، اس لیے تفصیل وصراحت کے ساتھ قیامت تک پیش آنے والے نت نئے مسائل کا جواب کتاب وسنت میں پایا جانا ممکن نہیں، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نئے مسائل کا شرعی حل دریافت کرنے کے لیے امت کو قیاس واجتہاد کی تعلیم دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ اجتہاد کی تلقین فرمائی بلکہ اجتہاد میں غلطی ہونے پر بھی اجر کی بشارت سنائی، آپ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے اجتہاد کیا اور اجتہاد کے نتیجہ میں صحیح جواب تک پہونچ گیا اس کو دو اجر ملیں گے، اور اگر اس سے اجتہاد میں غلطی ہوئی تو اسے بھی ایک اجر ملے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی تعلیم وتربیت کی وجہ سے حضور کی وفات کے بعد فقہاء صحابہ نے پوری دیانت داری، اخلاص اور جد وجہد کے ساتھ اجتہادی عمل جاری

رکھا، ان حضرات کے سامنے جب کوئی نیا معاملہ پیش کیا جاتا تو پہلے وہ لوگ قرآن میں اس کا حکم تلاش کرتے، جب قرآن میں کوئی حکم نہ ملتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں اس کا حکم تلاش کرتے۔ تلاش وجستجو کے باوجود جب ان حضرات کو کوئی حدیث بھی اس مسئلہ کے بارے میں نہ ملتی تو اجتہاد کرتے۔ نئے مسائل میں اجتہاد کا یہ عمل صحابۂ کرام سے تابعین نے سیکھا، اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے کے ساتھ نئے مسائل کی تعداد بھی بڑھتی جارہی تھی اس لیے تابعین کی ایک بڑی جماعت جو علم وعمل کے زیور سے آراستہ تھی اور جن کے تقویٰ و دیانت، فہم وتفقہ پر امت کو اعتماد تھا، نئے مسائل کا حکم دریافت کرنے کے لیے کارِ اجتہاد میں مصروف ہوگئی، عالم اسلامی کے تمام بڑے شہروں مکہ و مدینہ، کوفہ و بصرہ، مصر وشام وغیرہ میں بلند نظر فقہاء و مجتہدین کی جماعتیں اجتہاد کی عظیم ذمہ داری انجام دینے میں لگ گئیں۔ عراق چونکہ قدیم ترین دور سے مختلف تہذیبوں اور سلطنتوں کا مرکز رہا اس لیے وہاں کے مسائل کی نوعیت حجاز کے مسائل سے مختلف تھی، اور وہاں ابھرنے والے نئے مسائل کی تعداد عالم اسلامی کے دوسرے ممالک کے مسائل سے کئی گنا زیادہ تھی، اس لیے فقہاء عراق کو وسیع پیمانہ پر قیاس واجتہاد کو بروئے کار لانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے فرار اور گریز کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے پوری حقیقت پسندی اور بلند نگاہی سے نئے حالات و مسائل کا مطالعہ کیا، مقاصد شریعت، اصول دین اور کتاب وسنت کی تصریحات کی روشنی میں نئے مسائل کا شرعی حل دریافت کیا، یہ ہمارے فقہاء کا اتنا غیر معمولی کارنامہ ہے جس پر انھیں جتنی دعا دی جائے کم ہے۔

فقہ کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابۂ کرام، تابعین اور تبع تابعین نے اجتہاد کی راہ سے امت کے لیے علم و آگہی کا جو ذخیرہ چھوڑا اسی کا نام "فقہ" ہے۔ ائمہ مجتہدین امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ وغیرہم کے عہد میں اور ان کے تلامذہ کے ہاتھوں اسلامی اجتہادات کا یہ بے مثال سرمایہ کتابوں کی شکل میں مرتب ہوا اور

اسے مدون علم و فن کا مقام حاصل ہوا۔ بعد کے مجتہدین و فقہاء نے اس سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کیا، اس فقہی سرمایہ کو بڑھایا اور سنوارا، امت مسلمہ اس فقہی سرمایہ کے ذریعہ اسلام کے احکام سے واقف ہوتی رہی اور اپنی زندگی اسلامی ڈھانچہ میں ڈھالتی رہی۔

فقہ اسلامی کتاب و سنت سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ کتاب و سنت کا عطر اور مقاصد شریعت، اصول اسلام کی روشنی میں تیار شدہ علمی گلدستہ ہے، جو انسانی تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا اور اقوام عالم مسلمانوں کے اس علمی کارنامے پر رشک کرتی ہیں۔

فقہاء کا اختلاف:

تمام فقہاء و مجتہدین مخلص اور حق پرست تھے، انھوں نے پورے اخلاص، دیانت داری اور جاں فشانی کے ساتھ استنباطِ مسائل اور اجتہاد و قیاس کا کام انجام دیا۔ بلاشبہ وہ لوگ انسان تھے بھول چوک سے محفوظ نہیں تھے، لیکن ان کی دیانت اور اہلیت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا، انھیں کے ذریعہ اسلامی احکام کا تابناک ذخیرہ ہم تک پہونچا اور امت مسلمہ نے ہر دور میں ان کے اجتہادات پر اعتماد کیا۔ مجتہدین امت کے درمیان بہت سے مسائل میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی بنیاد خود غرضی، انانیت نہیں ہے بلکہ احادیث و روایات کا اختلاف بڑی حد تک اس کا سبب بنا ہے، ان میں سے ہر ایک کا مقصد کتاب و سنت سے اللہ کے حکم کی دریافت تھی نعوذ باللہ کسی بھی مجتہد کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں کی جا سکتی کہ اس نے دانستہ کتاب و سنت کی مخالفت کی ہو یا کتاب و سنت کے دلائل سے آنکھیں بند کر کے محض اپنی ذاتی غرض کے لیے کوئی رائے قائم کرلی ہو، جن مسائل میں مجتہدین میں اختلاف ہوا ان میں سے بیشتر مسائل عہد صحابہ ہی سے مختلف فیہ چلے آرہے تھے، مختلف دلائل اور روایات کی بنیاد پر ان کے بارے میں مختلف رائیں پائی جا رہی تھیں، لیکن مسائل میں اختلاف کبھی بھی عداوت، نفرت اور فرقہ بندی کا سبب نہیں بنا، ان جزوی مسائل میں اختلاف کے باوجود ان سب کا دل ایک تھا، باہم اعتماد و محبت کی فضا تھی، بے اعتمادی، بدگمانی اور بدخواہی کا ان حضرات کے یہاں دور دور گزر نہیں تھا۔

امت نے فقہاء مجتہدین اور فقہ اسلامی کو بجا طور پر جو مقام دیا اس کے بالکل برعکس اس دور فتن میں آوازیں لگائی جا رہی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہو رہی ہے کہ قیامت سے پہلے ایسا وقت آئے گا جب اس امت کے بعد میں آنے والے لوگ اپنے اسلاف کو بُرا بھلا کہیں گے، آج ایسے لوگ زبان و قلم سے اپنے خیالات کی اشاعت کر رہے ہیں جو "فقہ" ہی کو نہیں بلکہ تمام اسلامی علوم کو اسلام پر "اضافہ" قرار دے رہے ہیں اور امت کو مشورہ دے رہے ہیں کہ ان تمام علوم کو دریا برد کیے بغیر مسلمانوں میں صحیح دینی شعور اور ایمانی جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

بے دلیل جارحانہ تبصرے:

ان تمہیدی سطروں کے بعد فقہ اسلامی اور فقہاء مجتہدین کے بارے میں وحید الدین خاں صاحب کے بے دلیل جارحانہ تبصرے دل پر جبر کر کے پڑھ لیجیے:

"حج کے مسائل جو قرآن و حدیث میں ہیں وہ اتنے کم ہیں کہ چند صفحات میں لکھے جا سکتے ہیں، مگر فقہاء نے دوسری عبادات کی طرح حج کے بے شمار مسائل وضع کر کے رکھے ہیں جن کا احاطہ عام آدمی کے لیے ممکن نہیں۔ اس "اضافہ" کے حق میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ حجاج کی سہولت کے لیے کیا گیا ہے۔ مگر اس استدلال میں کوئی وزن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محض فقہی مسائل پڑھ کر کوئی شخص نہ نماز پڑھ سکتا ہے نہ حج کر سکتا ہے، یہ کام ایسا ہے جو دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے مفصل احکام بتانے کے بجائے یہ فرمایا: صلّوا کما رأیتمونی أصلی۔ یہی اصل طریقہ ہے۔ رسول اللہ کو دیکھ کر صحابہ نے نماز پڑھی، صحابہ کو دیکھ کر تابعین نے، تابعین کو دیکھ کر تبع تابعین نے۔ اس طرح یہ سلسلہ آج تک چلا جا رہا ہے۔ اگر لوگوں کے پاس صرف فقہ کے نام نہاد تفصیلی مسائل ہوتے تو لوگ کبھی صحیح نماز نہ پڑھ سکتے۔ امام ابو حنیفہ اس فن

کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں مگر دیکھ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے ان سے کہا کہ میں نے مناسک کی ادائیگی میں پانچ غلطیاں کیں۔ پھر ایک حجام نے مجھے بتایا۔"

(الرسالہ جولائی ۱۹۸۳ء ص ۳۶، ۳۷)

تجدید دین :

"تجدید کے معنی ہیں نیا کرنا۔ تجدید دین کا مطلب یہ ہے کہ دین کے اوپر جب گرد و غبار پڑ جائے تو اس کو صاف کرکے دوبارہ دین کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کر دیا جائے۔ دین کے اوپر "گرد و غبار" کی وجہ ہمیشہ ایک رہی ہے اور وہ ہے آسمانی متن میں انسانی اضافہ۔ یہ اضافہ ابتداءً وقتی محرکات کے تحت وجود میں آتا ہے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ مقدس بن کر اصل خدائی مذہب کا جزء بن جاتا ہے، اس کو لوگ اسی طرح ماننے لگتے ہیں جس طرح خدائی وحی کو ماننا چاہیے۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ اپنے احبار و رہبان کو خدا کے سوا اپنا رب بنا لیتے ہیں (توبہ ۳۱)۔

اس اضافہ کے محرکات عام طور پر دو قسم کے ہوتے ہیں :

۱۔ مذہب کی حقیقت کو خارجی طور پر متعین کرنے کی کوشش۔

۲۔ مذہب کی تعلیمات کو عقلی اصطلاحوں میں بیان کرنا۔

پہلی غلطی کی ایک مثال بائبل (پرانا عہد نامہ) کے ابتدائی ابواب ہیں جو قربانی کی انتہائی جزئی تفصیلات سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ بے شمار آداب و طریقے یا قرآن کے الفاظ میں اصر و اغلال (اعراف ۔ ۱۵۷) جو موجودہ بائبل میں درج ہیں ان کا حقیقی موسوی شریعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ بعد کے یہودی علماء کی پیدا کردہ فقہ تھی جس کو کتاب مقدس میں شامل کر دیا گیا۔ . . . .

دوسرے بگاڑ کی مثال موجودہ مسیحیت کے عقائد ۔ تثلیث، کفارہ، ابنیت مسیح وغیرہ ہیں۔ یہ عقائد نہ صرف یہ کہ حضرت مسیح نے کبھی تلقین نہیں کیے بلکہ

آج بھی وہ مستی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی انجیلوں میں نہیں پائے جاتے، کفارہ کا عقیدہ سینٹ پال نے ایجاد کیا، تاہم تثلیث اس کے یہاں بھی نہیں۔ یہ سب مسیحی متکلمین کی باتیں تھیں جو بعد کے دور میں وجود میں آئیں، مسیحیت جب شام سے باہر نکلی تو دوسری قوموں، خاص طور پر مصریوں اور یونانیوں کو مسیحی بنانے کی خاطر مسیحی علماء نے یہ کیا کہ اپنی تعلیمات کو ان کی مانوس زبان میں بیان کرنا شروع کر دیا، جس کو قرآن میں مضاہاۃ (توبہ ۳۱) کہا گیا ہے۔ مسیحی بزرگوں کی یہ باتیں دھیرے دھیرے مقدس ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ رومی شہنشاہ قسطنطین اول کے زمانہ میں جب ان کو سیاسی حمایت بھی حاصل ہو گئی تو نیقیا کونسل (۳۲۵) کے ذریعہ اس خود ساختہ مسیحیت کو انھوں نے حقیقی مسیحیت کی حیثیت سے بزور رائج کر دیا۔ گویا وہ چیز جس کو آج مسیحی عقائد کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت کسی زمانہ کا مسیحی علم کلام تھا جو بالآخر مسیحیت کا جزء نہیں بلکہ اصل مسیحیت بن گیا۔

آج اسلام پر یہ سارے "گرد و غبار" اسی طرح پڑ چکے ہیں جس طرح وہ پچھلی امتوں کے دین پر پڑے، اسلام کی تجدید کا کام سب سے پہلے ان آمیزشوں کو اس سے الگ کرنا ہے۔ خدا کے دین کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی ہے جب تک اسے انسانی گرد و غبار سے پاک نہ کر دیا جائے۔ پیغمبر اسلام نے مختلف انداز سے اپنی امت کو واضح تنبیہ کر دی تھی کہ اس فتنہ سے بچیں۔ دنیا سے جاتے ہوئے آپ نے جو آخری نصیحت کی وہ یہ تھی:

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بہما کتاب اللہ وسنۃ رسولہ۔ (موطا امام مالک)	میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں، جب تک ان کو پکڑے رہو گے تم گمراہ نہ ہو گے۔ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔

مگر بعد کے دور میں، جیسا کہ خود پیغمبر اسلام نے پیشین گوئی فرما دی تھی، اس وراثت نبوی پر اضافے شروع ہو گئے، حتی کہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ اسلام کی

فہرست میں بھی نہایت معصومانہ طور پر وہ ساری چیزیں شامل کر دی گئیں جنھوں نے دوسرے مذاہب کو بگاڑ ڈالا تھا۔ تاہم دونوں مثالوں میں ایک زبردست فرق ہے۔ دیگر مذاہب میں فقہ و تصوف یا علم کلام کے اضافے ان کے اصل آسمانی متن کا حصہ بن گئے۔۔۔ اس کے برعکس اسلام ہر قسم کے اضافوں کا شکار ہونے کے باوجود اصل خدائی متن (قرآن) کو آج بھی مکمل طور پر محفوظ کیے ہوئے ہے اور کسی بھی شخص کے لیے ممکن ہے کہ وہ انسانی اضافوں کو الگ کر کے اصل خدائی دین کو دریافت کر سکے۔" (تجدید دین، ص ۳۰۴)

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں باہمی اختلاف کی واحد سب سے بڑی وجہ وہ عباداتی اختلاف ہے جس کو الگ الگ فقہ کی شکل میں مرتب کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ اختلاف جو حقیقۃً انتہائی ضمنی تھا باعتبار حقیقت کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ چیز جس کو فقہاء "متعارض روایتوں" میں ترجیح یا افضلیت تلاش کرنا کہتے ہیں عباداتی امور میں اکثر غیر ضروری ہوتا ہے، کیونکہ یہ تعارض حقیقۃً عبادت کی ضمنی شکلوں میں تنوع کی تصدیق کرتا ہے نہ کہ اختلاف کو بتاتا ہے جس کو ختم کرنے کے لیے کسی علمی مشقت کی ضرورت ہو۔۔۔۔

اہلِ حدیث گروہ:

۱ "موجودہ عباداتی فقہ نے اس طرح بیک وقت مسلمانوں کو دو تحفے دیے ہیں۔ ایک اختلاف دوسرا مذہبی جمود۔ اہلِ حدیث کا گروہ اسی فقہی خرابی کو ختم کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا، مگر وہ خود ایک شدید تر قسم کا فقہی گروہ پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے بھی وہی غلطی کی جو ان کے پیش روؤں نے کی تھی "آمین" آہستہ کہی جائے یا بلند آواز سے، امام کے پیچھے فاتحہ پڑھی جائے یا نہ پڑھی جائے، اس قسم کے ضمنی فروق جو عباداتی

افعال کے بارے میں روایات میں ملتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو تسلیم کرنے کے بجائے وہ دوبارہ اس کوشش میں لگ گئے کہ ایک کو راجح قرار دے کر بقیہ کو مرجوح ثابت کریں اور اس طرح دوسروں کے بالمقابل خود اپنا ایک "صحیح تر" نظامِ عبادت مقرر کریں، اس قسم کی کوشش صرف ایک نیا فقہی فرقہ وجود میں لاسکتی تھی اور اس نے وہی انجام دیا۔" (تجدید دین ص ۱۲،۱۴)

"یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فقہ اور تصوف اور علم کلام کی شکل میں جو اضافے اسلام میں ہوئے ان کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ قرآن کا سرا اُمت کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ان اضافوں نے دین کو ایک قسم کا فن بنا دیا۔ کتاب الٰہی میں جو چیز سادہ اور فطری انداز میں بتائی گئی تھی، اس میں اپنی طرف سے موشگافیاں کرکے نئے نئے مسئلے پیدا کیے اور بطور خود بے شمار اصطلاحات وضع کیں تاکہ ان کو فنی انداز میں بیان کیا جاسکے۔ اس طرح دین خداوندی ایسے احکام و مسائل کا مجموعہ بن گیا، جو صرف فنی کتابوں کے مطالعہ سے جانا جاسکتا ہو۔ کتاب الٰہی کے ذریعہ اس کو معلوم کرنا ممکن نہ ہو۔ آج کسی کو نماز کے "مسائل" جاننا ہوں تو اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ وہ اس مقصد کے لیے قرآن کا مطالعہ کرے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ نماز کے مسائل تو فقہ کی کتابوں میں ملیں گے۔" (تجدید دین ص ۲۵)

"ایک خالی الذہن شخص ہمارے اسلامی کتب خانہ کو دیکھے تو وہ حیرت انگیز طور پر ایک اختلاف کا مشاہدہ کرے گا۔ یہ دین منزل اور دین مدون کا اختلاف ہے جو بہت بڑے پیمانے پر اسلام کے اندر پایا جاتا ہے، خدا کا دین قرآن و حدیث میں ایک سادہ اور فطری چیز نظر آتا ہے، وہ دلوں کو گرماتا ہے اور عقل میں جلا پیدا کرتا ہے۔ مگر یہی الٰہی علوم جب انسانی کتابوں میں مدون ہوکر ہمارے سامنے آتے ہیں تو اچانک وہ ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس میں خشک بحثوں کے سوا اور کچھ نہیں

ہوتا، ان میں نہ دلوں کے لیے گرمی ہے نہ عقل کے لیے روشنی۔" (تجدید دین ص ۱۴)

"آج پیغمبر آخر الزماں کی امت خود انھیں "اصر و اغلال" کے نیچے دب چکی ہے، ان کے فقہاء اور مشائخ اسلام میں وہ سارے اضافے کر ڈالے ہیں جو یہودی فقیہوں اور فریسیوں نے شریعت موسوی میں کیے تھے۔ آج اسلام کی تجدید کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اسلام کو ان تمام اضافوں سے پاک کر دیا جائے۔ جب تک یہ کام نہ ہوا اسلام کو زندہ نہیں کیا جا سکتا۔" (تجدید دین ص ۳۷، ۳۸)

"اگر آغاز ہی میں معتبر احادیث کا ایک مجموعہ تیار کر کے باقی تمام احادیث کو نذر آتش کر دیا جاتا تو امت بے شمار فتنوں سے بچ جاتی۔ فقہ کی تدوین کے سلسلے میں بھی صحیح طریقہ اسی اسوۂ صدیقی پر عمل کرنا تھا۔ بجائے اس کے کہ مختلف فقہاء الگ الگ اپنا مدرسۂ فکر لے کر بیٹھ جائیں اور ایک خداوندی مذہب کو دس الگ الگ مذاہب میں تبدیل کر ڈالیں۔" (تجدید دین ص ۳۹)

کیا فقہ دین میں اضافہ ہے؟

اوپر کے اقتباسات میں خاں صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اسے "دل کا بخار" یا "دیوانے کی بڑ" ہی کہا جا سکتا ہے۔ خاں صاحب کے نزدیک اسلام اسی طرح "تحریف اور اضافوں" کا شکار ہو چکا ہے جس طرح کی تحریفات اور اضافے یہودیت اور نصرانیت میں کر دیے گئے تھے، یہ اضافے ہیں فقہ اسلامی، علم کلام اور تصوف۔ فقہاء مجتہدین کی بعض آراء اور اجتہادات سے اختلاف الگ بات ہے، امت مسلمہ نے کسی دور میں فقہاء اسلام کو معصوم اور ہر طرح کی لغزش سے محفوظ نہیں مانا، لیکن وحید الدین خاں صاحب غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے فقہ اسلامی کو اسلام پر "اضافہ" قرار دیا ہے۔ اگر فقہ اسلامی اسلام پر "اضافہ" ہوتی تو وحید الدین خاں سے پہلے بہت سے مجددین اسلام کو اس اضافہ اور آمیزش سے پاک کرنے کے لیے ظاہر ہو چکے

ہوتے، کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی ہے کہ ہر صدی میں تجدید کرنے والے اور دین کو "اضافہ" و "آمیزش" سے پاک کرنے والے نمودار ہوتے رہیں گے۔

فنی شکل میں فقہ اسلامی کا سلسلہ دوسری صدی ہجری سے جاری ہے بارہ صدیوں تک امت مسلمہ اس "اضافے" کو سینے سے لگائے رہی اور اس پر عمل پیرا رہی، بارہ سو سال کی اس طویل مدت میں فقہ کے "اضافہ" سے اسلام کو پاک کرنے کے لیے کوئی مجدد ظاہر نہیں ہوا کیونکہ فقہ و کلام کے "اضافوں" سے اسلام کو پاک کرنے کا "تجدیدی کارنامہ" وحید الدین خاں صاحب کے لیے مقدر ہو چکا تھا اور موصوف کا منصب تجدید قیامت تک کے لیے ہے۔ چنانچہ اپنی تفسیر "تذکیر القرآن" کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "آج جب میں نے "تذکیر القرآن" کو مکمل کیا تو میرے دل نے کہا جو کام مجھے کرنا تھا وہ کام آج پورا ہو گیا۔ اب انشاء اللہ خدا کے دین پر کوئی شخص پردہ نہ ڈال سکے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔"
>
> (الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۶ء)

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ وحید الدین خاں صاحب کی "تجدیدی کوششوں" نے صرف یہی نہیں کیا کہ دین سے پردہ اٹھایا بلکہ خدا کے دین کو اس خطرے سے قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا کہ کوئی شخص اس پر پردہ ڈال سکے۔ اتنے عظیم کارنامے کے بعد بھی اگر انھیں خاتم المجددین نہ کہا جائے تو بڑی زیادتی کی بات ہوگی۔

فقہی اختلاف کی حقیقت:

اجتہادی مسائل (خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے) کے بارے میں فقہاء اسلام کے اختلافات کو خاں صاحب نے بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا ہے، ہوش و خرد کی سرحدوں کو پار کرتے ہوئے یہاں تک لکھ گئے کہ "فقہاء نے ایک خداوندی مذہب کو دسیوں الگ الگ مذاہب میں تبدیل کر ڈالا" حالانکہ ائمہ مجتہدین کے یہ اختلافات ہمیشہ امت کے لیے رحمت ہی ثابت ہوئے۔ یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے

کہ رابطہ عالم اسلامی کی مجلس مجمع الفقہ الاسلامی نے اپنے دسویں اجلاس منعقدہ مکہ مکرمہ (۲۴ صفر تا ۲۸ صفر ۱۴۰۸ھ) میں فقہی اختلاف کے بارے میں جو فیصلہ فرمایا اس کے چند اقتباسات نقل کر دیے جائیں۔ رابطہ عالم اسلامی کی اس مجلس میں عالم اسلام کے چیدہ و برگزیدہ علماء شامل ہیں:

"اسلامی ملکوں میں پائے جانے والے مکاتب فکر کے درمیان دو قسم کا اختلاف پایا جاتا ہے: ایک اعتقادی اختلاف، دوسرا فقہی اختلاف۔ جہاں تک اختلافِ عقائد کی بات ہے تو وہ واقعی ایک ایسی خطرناک مصیبت اور ایسا سنگین فتنہ ہے، جسے عالم اسلام پر آنے والے تمام آفات و حوادث کا واحد سبب قرار دیا جا سکتا ہے.......

دوسرا اختلاف وہ ہے جو فقہی مسلکوں کے درمیان بعض فروعی اور اجتہادی مسائل میں پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف قبیح اور ناپسندیدہ نہیں ہے، بلکہ علم و عقل کا تقاضا ہے کہ اس نوعیت کا اختلاف پایا جائے۔ یہ علمی اسباب کے تحت واقع ہوا ہے اور اس میں اللہ رب العزت کی بالغ حکمت کام کر رہی ہے، ایک طرف یہ اختلاف بندوں کے لیے رحمت ہے تو دوسری طرف نصوص شرعیہ سے احکام اسلامی کے استنباط و استخراج کا وسیع میدان ہاتھ آتا ہے اور ان سب کے علاوہ یہ کہ یہ ایک نعمت عظمیٰ ہے جو امت اسلامیہ کے لیے ایک عظیم الشان علمی فقہی اور قانونی پونجی اور سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دین و شریعت کے معاملے میں اس اختلاف کی وجہ سے بڑی سہولت، توسیع اور گنجائش نکل آتی ہے.......

یہ دوسرا اختلاف جو مسلک و مشرب کا ہے، یہ زیادہ تر فقہی، فروعی، اجتہادی اور ظنی مسائل میں ہے (نہ کہ اصولی و عقائد میں) یہ اختلاف نہ کوئی عیب ہے، اور نہ اسے "دین میں تضاد و تناقض" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کا امکان ہے کہ سرے سے اس کا وجود ہی نہ ہو۔ ایسی امت میں جس کے

پاس جامع اور مکمل قانونی نظام ہو اور نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے، فقہ واجتہاد کا دروازہ کھلا ہو لیے فقہی اختلاف کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ . . . .

یہ اختلاف فقہی ملامت کے لیے ایک عظیم قانونی اور علمی سرمایہ فراہم کرتا ہے جس پر امت مسلمہ بجاطور پر فخر کرسکتی ہے، لیکن وہ اغیار واشرار جنھوں نے اس امت بالخصوص نئی نسل کو گمراہ کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے وہ عام عقل مسلم نوجوانوں کی کمزوری اور دینی علوم اور اسلامی تہذیب وثقافت سے ان کی ناواقفیت یا قلتِ واقفیت کو غنیمت سمجھ کر ان کی کمزوریوں سے ناجائز فائدے اٹھاتے ہیں اور ان کے دلوں میں اپنے مذہب اور عقیدے سے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں . . . . . مخصوص فقہی مذاہب کے اختلاف کی ایسی بھیانک تصویر پیش کرتے ہیں کہ گویا یہ کوئی دین اور عقیدے کا اختلاف ہو اور یہ لازمی طور پر دین میں تضاد اور تعارض کی نشاندہی کرتا ہے۔ حالانکہ دونوں نوعیتوں کے اختلاف کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے۔

(مجلہ 'بحث ونظر' پھلواری شریف پٹنہ شمارہ ۱۴-۸۵ء)

وحیدالدین خاں صاحب نے عبادتی فقہ کے اختلافات کو خاص طور پر نشانہ بنایا ہے حالانکہ عبادتی فقہ کے اختلافات تمام تر صحابہ کرام کے عہد سے پائے جاتے ہیں اور ان اختلافات کی نوعیت جائز وناجائز حق وباطل کی نہیں ہے بلکہ تقریباً ۹۵ فی صد اختلافات کی نوعیت افضل ومفضول، راجح ومرجوح کی ہے۔ فقہی مذاہب کے یہ جزوی اختلافات کبھی بھی امت میں انتشار وافتراق کا سبب نہیں بنے۔ بلکہ چاروں ائمہ فقہ کی تقلید کرنے والے باہم شیر وشکر رہے۔ ان کے درمیان ہر طرح کے معاشرتی، علمی، سیاسی تعلقات رہے۔ مسلمانوں کی صدیوں پر پھیلی ہوئی طویل تاریخ میں آپ کو کوئی مثال ایسی نہیں ملے گی کہ حنفیوں کی فوج شافعیوں کے مقابلے میں یا مالکیوں کا رسالہ حنبلیوں کے مقابلے میں فقہی اختلاف کی وجہ سے صف آرا ہوا ہو۔ مسلمانوں کو جو کچھ نقصان پہنچا اعتقادی اختلافات اور سیاسی محاذ آرائیوں کی وجہ سے پہنچا۔

فقہاء مجتہدین کے اختلافات سے امت کو ہمیشہ فائدہ ہی پہنچا، ہاں ! حمید الدین خان صاحب کی تحریریں نوجوانوں میں فکری انتشار پیدا کرنے اور علوم اسلامیہ نیز اسلاف امت سے بے اعتمادی پیدا کرنے کا "خوش گوار فریضہ" ضرور انجام دے رہی ہیں۔

سفیان ثوریؒ کا ارشاد

قال سفیان الثوری لا تقولوا اختلف العلماء فی کذا و قولوا قد وسع العلماء علی الامۃ بکذا۔

(المیزان الکبریٰ ص ۲۱)

(سفیان ثوری کہتے تھے کہ علماء نے فلاں مسئلہ میں اختلاف کیا، یہ نہ کہا کرو بلکہ یوں اس کو ادا کرو کہ امت کے لیے علماء نے یہ گنجائش پیدا کی۔)

کاش! الثوری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ پاکیزہ اصلاحی مشورہ مان لیا جاتا اور بجائے اختلفوا کے توسعوا، یا اس کے ہم معنی الفاظ کے استعمال کا امت میں رواج ہو جاتا، تو اختلاف کے لفظ اور صرف لفظ سے دنیا اور دنیا کیا، حد یہ ہے کہ خود مسلمان جن مغالطوں میں آج مبتلا ہیں یا مبتلا کر دیے گئے ہیں وہ شاید پیدا ہی نہ ہوتا۔

(تدوین فقہ، ص ۱۳۱۔ مولانا مناظر احسن گیلانی)

اختیار کرے گا، اور اس سے کیا کیا نتائج برآمد ہوں گے، ممکن ہے کہ اس دور میں جب کہ مولانا وحیدالدین خاں صاحب اسلامی شخصیات اور تحریکات کا محاسبہ کرنے میں مصروف ہیں دنیا کے کسی گوشہ میں کوئی ایسا واقعہ نمودار ہو رہا ہو جو مستقبل کے نتائج اور اثرات کے اعتبار سے بہت غیر معمولی ہو اور جناب وحیدالدین خانصاحب اس سے بے خبر ہوں یا خاموش ہوں۔ پرتگالیوں نے کتنا زور باندھا لیکن بالآخر وہ بحر ہند سے بے دخل ہوئے اور برطانوی تسلط قائم ہو گیا حالانکہ ابتداءً اس کے آثار بالکل نہیں تھے کہ برطانیہ بحر ہند پر حاوی ہو جائے، جناب وحیدالدین خانصاحب کا اکبری فتنوں کے مقابلہ میں پرتگالی فتنے کو زیادہ شدید سمجھنا بے بصیرتی کی بات ہے، اکبری فتنہ سر پر کھڑا تھا اور براہ راست دین و عقیدہ کو چیلنج کر رہا تھا، اور پرتگالی خطرہ ایک موہوم اور متوقع خطرہ تھا اور اس خطرے کا براہ راست نشانہ مذہب و عقیدہ نہیں تھا، پرتگالی خطرہ تجارت کو درپیش تھا یا پھر سیاست کو، اگر مجدد صاحب نے حکمت و دانائی کے ساتھ اکبری فتنہ کا قلع قمع نہ کیا ہوتا تو بظاہر حالات ہندوستان کی تاریخ بہت تاریک ہوتی، اور شاید جناب وحیدالدین خانصاحب اس حال میں نہ ہوتے کہ مجدد الف ثانی کی خدمات پر ناقدانہ نظر ڈالنے کا خیال ان کے دل میں پیدا ہوا، مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر مجدد صاحب نے پرتگالی فتنہ کا مقابلہ کسی طرح کیا ہوتا اور ہندوستان پر مغربی طاقتوں کا قبضہ نہ ہونے دیا ہوتا تو جناب وحیدالدین خانصاحب مجدد صاحب پر یوں نقد کرتے کہ انھوں نے ہندوستان پر مغربی ممالک کا قبضہ روک کر علم و تہذیب کا قافلہ روک دیا اور ہندوستان کو پسماندہ رہنے دیا، جس طرح کا تبصرہ جناب وحیدالدین خانصاحب نے افغانستان کے بارے میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"انگریز جب ہندوستان پر قابض ہوئے تو وہ مسلسل یہ کوشش کرتے رہے کہ اپنی نوآبادیاتی سلطنت کو افغانستان تک وسیع کریں، اس کا مقصد افغانستان پر قبضہ سے زیادہ روسی خطرہ کا دفاع تھا مگر افغانیوں کی شدید مزاحمت کی وجہ سے انگریز اپنے اس منصوبہ میں کامیاب نہ ہو سکے،

ہمارے پُرجوش رہنما عام طور پر اس واقعہ کو اپنے اور افغانیوں کے فخر کے خانہ میں لکھے ہوئے ہیں، مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھیے تو وہ صرف ایک پُرجوش نادانی نظر آئے گی، انگریز کا معاملہ معروف معنوں میں صرف ایک "بیرونی سامراج" کا معاملہ نہ تھا، زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ جدید تعلیم اور سائنٹفک انقلاب کے ہراول بن کر ایشیا میں داخل ہوئے تھے، نیز یہ کہ خود سائنسی انقلاب کی اپنی داخلی منطق کے تحت یہ بھی مقدر تھا کہ نوآبادیاتی اقتدار بالآخر ختم ہو، اور قومی اقتدار اس کی جگہ لے لے، افغانی لوگوں کا جوش اگر ہوش کے تابع ہوتا اور وہ وقتی طور پر برطانیہ کی سرپرستی قبول کر لیتے تو اس کا زبردست فائدہ ملتا، برطانی اقتدار تو یقیناً اپنے وقت پر ختم ہو جاتا۔ مگر افغانستان کو اس "صبر" کی یہ قیمت ملتی کہ آج افغانستان ایک ترقی یافتہ ملک ہوتا نہ کہ ایک برباد شدہ ملک جیسا کہ آج وہ نظر آتا ہے۔"

(الرسالہ فروری ۱۹۸۹ء، ص ۴۴)

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خانوادے پر تنقید

تاریخ ہند میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے فرزندان و تلامذہ کے تجدیدی و اصلاحی کارنامے روز روشن کی طرح عیاں ہیں، شاہ صاحب کے ان زریں کارناموں کی تفصیل "الفرقان" شاہ ولی اللہ نمبر، اور "تاریخ دعوت و عزیمت" جلد پنجم میں دیکھی جا سکتی ہے، لیکن جناب وحید الدین خانصاحب نے اس خانوادہ کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ لکھتے ہیں:

"اسلامی نقطۂ نظر سے سب سے اہم اور دور رس واقعہ وہ ہے جس کو جدید سائنس کہتے ہیں۔ سائنس کے ظہور کے ابتدائی عناصر اگرچہ تاریخ میں بہت پہلے سے کام کر رہے تھے، تاہم وہ نمایاں وقت جب کہ انسانی تاریخ

[illegible] ان کی تحصیل کی خدمات آج برصغیر میں [illegible] کو "سراج الہند" کے خطاب سے [illegible]
[illegible] نوازا گیا مگر ان کے بیٹے بھی [illegible] ہو سکا کہ مسلمانوں کو [illegible]
[illegible] کے مطابق وہ [illegible] اپنی اجتماعی تحریک کی [illegible] منظم کر سکیں [illegible]
[illegible] سے الاسلام [illegible]
[illegible] مذکورہ بالا [illegible] کا [illegible] ہے جناب وحید الدین خانصاحب کی یہ
[illegible] کے نزدیک شاہ صاحب نے [illegible] مگر
[illegible] اصلاح و تجدید اور تعلیم کے میدان میں [illegible] نظر [illegible] ان سے
[illegible] زیادہ اہم کام یہ تھا کہ [illegible] کے میدانوں میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتے [illegible]
[illegible] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی [illegible] عالم اسلام کے [illegible] ہونا چاہیے۔
لیکن شاہ صاحب کی خدمات کو موصوف نے بہت گھٹا کر بیان کیا ہے ان کی نظر میں شاہ صاحب
نے صرف اتنا کیا ہے کہ مروجہ تصوف کی نئی تشریح کر دی اسرار دین کو قدیم روایتی انداز
میں بیان کر دیا، بس اللہ اللہ خیر سلا، شاہ صاحب پر یہ تبصرہ کر کے وحید الدین خانصاحب
نے شاہ صاحبؒ کا تو کچھ نقصان نہیں کیا، ہاں اپنی بے خبری یا علمی بددیانتی کا ثبوت
ضرور مہیا کر دیا، جس شخص نے شاہ صاحب کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا منصفانہ مطالعہ
کیا ہوگا وہ اس بات کا اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پائے گا کہ شاہ صاحب نے
اس کتاب میں اسرار دین کو قدیم روایتی انداز میں بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تمام
اسلامی تعلیمات کو نئے قالب میں ڈھالا ہے، خصوصاً سیاسیات اور معاشیات کے موضوعات
پر شاہ صاحب نے اسلامی تعلیمات کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔
واقعہ یہ ہے کہ نظام مملکت اور اقتصادیات کے موضوع پر شاہ صاحب کے نظریات بڑے
فکر انگیز اور انقلابی ہیں، ان کی بنیاد پر اسلامی مملکت کی عمارت بڑی کامیابی کے ساتھ
تعمیر کی جا سکتی ہے۔ خدا جانے روایتی ڈھانچے سے وحید الدین خانصاحب کی مراد کیا
ہے جس کا انھوں نے شاہ صاحبؒ کو طعنہ دیا ہے، کاش موصوف "روایتی ڈھانچے"
اور "روایتی انداز" کی تشریح کر دیتے، شاہ صاحبؒ نے دین اور تعلیمات دین کی جو

تعبیر بھی پیش کی قرآن وسنت اور فہم سلف کے دائرے میں رہ کر کی، اگر اسی کا نام روایتی انداز اور روایتی ڈھانچہ ہے تو شاہ صاحب اس "جرم" کے بلاشبہ "مجرم" ہیں، شاہ صاحب نے قطعًا یہ جرأت نہیں کی کہ وحید الدین خانصاحب کی طرح آیات و روایات کی من مانی تشریح کریں اور اپنے ذہنی "اختراعات" پر آیات واحادیث کی قبا فٹ کریں۔

مغرب میں سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ سے کیا قیامت آگئی، یہی تو ہوا کہ مغربی ممالک مسلم ممالک پر چھاگئے، جناب وحید الدین خانصاحب تو افغانستان والوں کو اس پر لعنت ملامت کر رہے ہیں کہ انھوں نے برطانوی سامراج کی سرپرستی قبول کیوں نہیں کی، اور اپنے روایتی اسلحہ سے انگریزوں کو کیوں پسپا کر دیا، پھر موصوف کے نزدیک بلاد اسلامیہ پر مغربی ملکوں کا تسلط "تاتاریوں کی غارت گری سے بڑا سانحہ" کیسے بن گیا جناب وحید الدین خاں صاحب کی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عالم اسلام نے "صبر" کیا اور "جدید تعلیم اور سائنٹفک انقلاب کے ہراول دستوں" کو عالم اسلام میں در آنے دیا تاکہ عالم اسلامی "ترقی یافتہ" ہو جائے۔

حضرت سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد پر تنقید

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ اصلاح و جہاد تاریخ اسلام میں نمایاں اور ممتاز مقام رکھتی ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں اصلاح عقیدہ و معاشرت' احیاء سنت' ازالۂ بدعات و منکرات' جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت بیدار کرنے میں اس تحریک کی خدمات بڑی دیرپا اور ناقابلِ فراموش ہیں۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک نے حالات کا رُخ موڑ دیا' پورے برصغیر میں مسلمانوں کی زندگی میں انقلابِ عظیم برپا ہوگیا' ایمان و یقین کی بادِ بہاری چلنے لگی' لاکھوں مسلمان غیر اسلامی زندگی سے تائب ہو کر سچے پکے مسلمان بن گئے' بے شمار غیر مسلموں کو اسلام کی سعادت حاصل ہوئی' جہاد و شہادت کے زمزموں سے برصغیر کی فضا معمور ہوگئی' سید احمد شہیدؒ کی اصلاحی و تجدیدی خدمات اور تحریک جہاد کے غیر معمولی اثرات و نتائج کی تفصیل غلام رسول مہر مرحوم کی "سید احمد شہید"' "جماعت مجاہدین"' "سرگزشت مجاہدین" ——— اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی "سیرت سید احمد شہید" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمان اب تک حضرت مجدّد الف ثانیؒ' حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ' حضرت سید احمد شہیدؒ' حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تجدید دین کے سایہ میں زندگی گزار رہے ہیں۔ برصغیر ہند و پاک میں ایمان و عزیمت کی جو بھی سرگرمیاں نظر آرہی ہیں' انہی بزرگوں کی تجدیدی' اصلاحی اور مجاہدانہ کوششوں کا

سید احمد شہید بریلوی کا اقدام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف ناقابل فہم

حد تک غیر دانشمندانہ تھا۔ ان کی سلطنت تبت سے لے کر درۂ خیبر تک پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں کی فوجی طاقت میں ناقابل عبور حد تک فرق پایا جا رہا تھا۔ سید صاحب کے پاس غیر تربیت یافتہ مریدین کی ایک بھیڑ تھی جو کہ صرف روایتی ہتھیاروں سے مسلح تھی۔ دوسری طرف مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج نہ صرف تعداد میں بہت زیادہ تھی بلکہ وہ زیادہ جدید ہتھیاروں سے مسلح تھی، حتیٰ کہ اس کے پاس توپیں بھی موجود تھیں۔"

(الرسالہ ستمبر ۱۹۸۹ء ص ۲۰)

وحید الدین خاں صاحب نے پہلے اقتباس میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے بارے میں جو بات لکھی ہے وہ ان کی عبرت ناک بے خبری پر دلالت کرتی ہے یا بدنیتی اور خدا سے بے خوفی پر۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح وجہاد پر اردو زبان میں الحمدللہ متعدد مستند کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ غلام رسول مہر مرحوم کی کتاب "سید احمد شہید" اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" سید صاحب کے حالات اور کارناموں پر دستاویزی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کتابوں میں سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کے مقاصد، محرکات اور صوبہ سرحد کے انتخاب کے بارے میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کے بیانات، تحریروں اور اس دور کے تاریخی مراجع کی بنا پر مفصل اور اطمینان بخش بحثیں کی گئی ہیں۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد سے مکمل واقفیت کے لیے مذکورہ بالا دونوں کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

ہجرت اور جہاد کے محرکات

حضرت سید احمد شہیدؒ نے جہاد کے لیے سرحد کی طرف ہجرت کیوں کی؟ اور رنجیت سنگھ کے مظالم کی خبریں کس طرح ملیں؟ اس کے بارے میں خود حضرت سید احمد شہیدؒ کا بیان پڑھیے۔ موصوف نے ایک بار بہت سارے علماء و خوانین کے سامنے خطاب

فرماتے ہوئے فرمایا:

"میں نے ہندوستان میں خیال کیا کہ کوئی جگہ ایسی مامون ہو کہ وہاں مسلمانوں کو لے کر جاؤں اور جہاد کی تدبیر کروں، باوجود اس وسعت کے کہ صدہا کروہ (کوس) میں ملک ہند واقع ہوا ہے، کوئی جگہ ہجرت کے لائق خیال میں نہ آئی۔ کتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اس ملک میں جہاد کرو، جو کچھ مال خزانہ، سلاح وغیرہ درکار ہو ہم دیں گے، مگر مجھ کو منظور نہ ہوا، اس لیے کہ جہاد سنت کے موافق چاہیے، بلوہ کرنا منظور نہیں، تمھارے ملک کے ولایتی بھائی حاضر تھے، انھوں نے کہا کہ ہمارا ملک اس کے لیے بہت خوب ہے، اگر وہاں چل کر کسی ملک میں قیام اختیار کریں تو وہاں کے لاکھوں مسلمان جان و مال سے آپ کے شریک ہوں گے، خصوصاً اس سبب سے کہ رنجیت سنگھ والی لاہور نے وہاں کے مسلمانوں کو نہایت تنگ کر رکھا ہے، طرح طرح کی ایذا پہنچاتا ہے اور مسلمانوں کی بے آبروئی کرتا ہے، جب اس کی فوج کے لوگ اس ملک میں آتے ہیں مسجدوں کو جلا دیتے ہیں، کھیتیاں تباہ کر دیتے ہیں، مال و اسباب لوٹ لیتے ہیں، بلکہ عورتوں اور بچوں کو پکڑ لے جاتے ہیں اور اپنے ملک پنجاب میں لے جا کر بیچ ڈالتے ہیں، پنجاب میں وہ مسلمانوں کو اذان بھی نہیں کہنے دیتے، مسجدوں میں گھوڑے باندھتے ہیں، گاؤکشی کا تو ذکر کیا، جہاں سنتے ہیں کہ کسی مسلمان نے گائے ذبح کی، اس کو جان سے مار ڈالتے ہیں، یہ سن کر میرے خیال میں آیا کہ یہ سچ کہتے ہیں اور یہی مناسب ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں چل کر ٹھہریں اور سب مسلمانوں کو متفق کر کے کفار سے جہاد کریں اور ان کے ظلم سے مسلمانوں کو چھڑائیں۔"

(سیرت سید احمد شہید جلد اول، ص ۲۲۶، ۲۲۷ طبع ہفتم)

حضرت سید احمد شہیدؒ کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ انھوں نے سرحد پنجاب کے دیندار مسلمانوں سے رنجیت سنگھ اور اس کی افواج کے لرزہ خیز مظالم کی تفصیل

سُن کر ہجرت کر کے سرحد جانے اور اسے مرکزِ جہاد بنانے کا فیصلہ فرمایا۔ کسی خبر کی تصدیق کا شرعی طریقہ اس کے سوا کیا ہے کہ دیندار اور معتمد مسلمانوں سے سُن کر اس کی تصدیق کی جائے۔ سرحد پہنچ کر سید احمد شہیدؒ نے رنجیت سنگھ کے مظالم کے اثرات اور اس کی ظالمانہ کارروائیاں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ رنجیت سنگھ کے مظالم کے بارے میں جو اجمالی اشارات حضرت سید احمد شہیدؒ نے کیے ان کی تفصیل رنجیت سنگھ کے معاصر غیر مسلم مورخین، سیاحوں اور برطانوی افسروں کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ غلام رسول مہر مرحوم نے اس سلسلے میں بہت سی شہادتیں اپنی دستاویزی کتاب میں جمع کر دی ہیں۔

رائے بہادر کنھیا لال نے اپنی کتاب "تاریخ لاہور" میں لاہور کی اہم ترین مساجد کے بارے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے شرمناک اقدامات کا تذکرہ کیا ہے۔ شاہی مسجد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "بادشاہی عہد میں اس مسجد کی آرائش کا سامان فرش، جھاڑ فانوس وغیرہ لاکھوں روپے کا تھا، جب زمانہ نے پلٹا کھایا اور سکھی سلطنت ہوئی تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت کبھی اس میں توپ خانہ، کبھی پلٹن اور سواری کی فوج کی چھاؤنی رہا کرتی تھی، حجروں میں میگزین بھرا رہتا تھا، سکھ لوگ پتھروں کی سلیں اکھاڑ کرنے لگے"
>
> (تاریخ لاہور، ص ۱۲۳)

مستی دروازے کی مسجد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت ہوئی تو اس مسجد پر سرکاری تسلط ہو گیا اور بارود بھری گئی، سالہا سال اس میں بارود بنتی رہی، یہاں تک کہ بارود خانے والی مسجد مشہور ہو گئی"
>
> (تاریخ لاہور، ص ۱۲۶)

یہی مصنف سنہری مسجد کے بارے میں بھی اسی طرح کا واقعہ لکھتے ہیں۔ ایک

یہ ان حالات کی ہلکی سی جھلک ہے جن کی بنا پر حضرت سید احمد شہیدؒ نے سرحد کو مرکز جہاد بنانے کا فیصلہ فرمایا اور پنجاب، سرحد اور افغانستان کے مظلوم مسلمانوں کو رنجیت سنگھ کے پنجۂ ظلم و استبداد سے رہائی دلا کر وہاں خالص اسلامی بنیادوں پر اسلامی مملکت قائم کرنے کی جدوجہد شروع کی۔ ان روشن تاریخی حقائق سے آنکھ بند کر کے یہ لکھ دینا کہ "۱۸۲۶ء میں سید احمد شہید بریلویؒ کو زبانی طور پر یہ خبر ملی کہ رنجیت سنگھ نے پنجاب کی کچھ مسجدوں کو اصطبل بنا دیا ہے، وہاں اس کے گھوڑے بندھے ہوئے ہیں۔ اس خبر کے بعد انہوں نے کسی تحقیق کی ضرورت نہ سمجھی، وہ بہت سے مسلمانوں کو لے کر پنجاب پہنچے اور رنجیت سنگھ کی فوج سے لڑنے لگے" بڑی ناخدا ترسی اور بے حسی کی بات ہے۔

جہاد کے لیے قوت و شوکت کی شرط کا جائزہ:

وحید الدین خاں صاحب نے دوسرے اقتباس میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور رنجیت سنگھ کی فوجی طاقت میں پائے جانے والے عظیم فرق کا حوالہ دے کر جو کچھ لکھا ہے اس کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کی زندگی میں بھی ان کے مخالفین نے چند دوسرے اعتراضات کے ساتھ مذکورہ بالا اعتراض ان کی تحریک جہاد پر کیا تھا۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ نے ان اعتراضات کا مدلل جواب اپنے ایک مکتوب میں دیا۔ یہاں غلام رسول مہر مرحوم کی کتاب "سید احمد شہیدؒ" سے اس مکتوب کے بعض اقتباسات کا ترجمہ و تلخیص پیش کی جا رہی ہے:

"دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مخالفوں کی قوت اپنی قوت سے بڑھی ہوئی ہے۔

یہ کچھ لوگ کہتے ہوئے خیال کرتے ہیں کہ بقدر استطاعت سامان فراہم کرنا بلا شبہ ضروری ہے، جیسے مخالفوں کے برابر قوت ہو جانا، مگر قرآن پاک میں "اعدوا لهم ما استطعتم" فرمایا گیا ہے، یعنی جس قدر طاقت تمہارے بس میں ہو فراہم کرو، یہ نہیں کہا گیا کہ "اعدوا لهم مثل ما اعدوا"

لکم" (یعنی جتنی قوت تمھارے مقابلے پر لائیں اتنی ہی قوت تم بھی لاؤ) امام کے لیے "وجود شوکت" ضروری ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امام کے جسم میں ایسی قوت پیدا ہو جائے کہ وہ ایک لمحے میں مخالفوں کی سلطنتیں درہم برہم کر ڈالے اور یکہ و تنہا ان کے جنود وعساکر کو کلیر کر رکھ دے۔ مطلب یہ ہے کہ امام کے پاس ساتھیوں کی ایسی جماعتیں فراہم ہو جائیں جن کے بل پر وہ بظاہر عقل کے اعتبار سے مخالفوں کی روک تھام کر سکے ...... شریعت کے نزدیک اسی امام کو صاحب شوکت سمجھا جائے گا جس کے ہاتھ پر مسلمانوں کا کثیر گروہ بیعت امامت کر چکا ہو اور شریعت میں بیعت کا رشتہ قرابت و ملازمت کے رشتوں سے زیادہ قوی ہے ...... پھر فرماتے ہیں کہ مان لیجیے قوت والوں کے خلاف جہاد کے لیے زبردست قوت لازم ہے اور سید صاحب کو فی الحال یہ قوت حاصل نہیں لیکن اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟

آیا کوئی امام ماں کے پیٹ سے بھی عساکر و جنود لے کر آیا ہے؟ آیا یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اقامت جہاد کی تیاری کرتا ہے تو فی الفور غیب سے اس کے لیے لاؤ لشکر اور اسباب حرب مہیا ہو جاتے ہیں؟ یہ نہ کبھی ہوا نہ ہوگا۔ طریقہ یہی ہے کہ امام مقرر ہو۔ یہ کام تمام مسلمانوں کے ذمے فرض ہے اور اس میں سستی یا اس سے پہلو تہی معصیت ہے پھر امام وقت کے لیے قوت بہم پہنچانا مسلمانوں ہی کا فرض ہے....

آخر میں شاہ صاحب کس دلسوزی کے ساتھ لکھتے ہیں:

"سبحان اللہ! کیا اسلام کا حق یہی ہے کہ اس کے رکن عظیم کو جڑ سے اکھاڑا جا رہا ہو اور جس شخص کے سینے میں ضعف و ناتوانی کے باوجود اسلامی حمیت نے جوش مارا ہے طعن و ملامت کا ہدف بنایا جائے؟ آیا یہ لوگ نصرانی یا یہودی یا مجوس یا ہنود ہیں کہ ملت محمدیہ کے ساتھ

دشمنی کر رہے ہیں؟ محمدیت کا مقتضا یہ تھا کہ اگر کوئی شخص ہنسی مذاق میں بھی جہاد کا نام لیتا تھا تو مسلمانوں کے دل پھول کی طرح کھل جاتے تھے، اور سنبل کی طرح تروتازہ ہو جاتے تھے۔ اگر دور دراز مقامات سے بھی جہاد کا آوازہ غیرت مندانِ اسلام کے کانوں میں پہنچتا تھا تو وہ دیوانہ وار دشت و کہسار میں دوڑ پڑتے بلکہ شہباز کی طرح اڑنے لگتے تھے، کیا جہاد کے معاملے کو عظمت و شوکت کے باوجود حیض و نفاس کے مسائل پڑھنے پڑھانے سے بھی کم تر سمجھ لیا گیا؟"

(سید احمد شہید جلد اول ص ۲۷۲ تا ۲۷۵)

غیر تربیت یافتگی کا طعنہ:

وحیدالدین خاں صاحب نے سید احمد شہیدؒ کے شریک کار مجاہدین کو "غیر تربیت یافتہ مریدین کی بھیڑ" قرار دے کر حقیقت واقعہ کی غلط ترجمانی کی ہے۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کی تاریخ جن لوگوں نے پڑھی ہے وہ شہادت دیں گے کہ سید احمد شہیدؒ کے رفقا شجاعت و سپہ گری کے جواہر سے مالا مال تھے۔ ان حضرات نے بڑی محنت اور دلچسپی سے فوجی ٹریننگ حاصل کی اور بہت سے معرکوں میں دشمنوں پر فتح حاصل کی، فتح و شکست کے فیصلے تو دربارِ الٰہی سے ہوتے ہیں، بندہ کوشش کا مکلف ہے نہ کہ نتائج کا۔ اسلام نے جہاد کی فرضیت یا جواز کے لیے نہ تو دشمنانِ اسلام کی طاقت کے برابر طاقت ہونے کی شرط لگائی ہے نہ یہ شرط لگائی ہے کہ پہلے سے دربارِ الٰہی سے فتح و کامرانی کا پروانہ مل چکا ہو اس لیے ان بنیادوں پر سید احمد شہیدؒ کی تحریک پر ناروا تنقید کا کوئی جواز نہیں ہے، دنیا کی تاریخ میں ہزاروں بار ایسے واقعات پیش آچکے ہیں کہ چھوٹے گروہ نے بڑے گروہ پر غلبہ پایا، کمزور طاقت نے مضبوط ترین طاقت پر فتح پائی۔ ناقابلِ عبور حد تک فوجی طاقت میں فرق ہونے کے باوجود امریکہ کو ویتنام سے پسپا ہونا پڑا، روس کو افغانستان میں پسپائی اختیار کرنی پڑی، اس لیے فوجی طاقت میں

برابری نہ ہونے کا حوالہ دے کر سید احمد شہید کی تحریک کو تنقید کا نشانہ بنانا نہ شرعاً درست ہے، نہ عقلاً۔

خلاصۂ بحث :

حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے جلیل القدر رفقاء نے جن حالات میں ہجرت اور جہاد کا فیصلہ کیا وہ حالات ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس سے ان حالات کا ایک دھندلا سا تصور ذہن میں آتا ہے۔ ان حالات میں ان حضرات نے پوری دیانت اور بصیرت کے ساتھ جہاد کو فریضہ تصور کرتے ہوئے اپنا سب کچھ راہِ خدا میں قربان کر دیا۔ سیکڑوں سال بعد دہلی کی ایک "عالی شان بلڈنگ" میں بیٹھ کر نہ پنجاب و سرحد کے اُن حالات کا تصور کیا جا سکتا ہے، نہ مجاہدین کے اقدامات کے محرکات و عواقب کے بارے میں صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ جہاد سید صاحب کی شہادت کے بعد بھی کم و بیش سو سال تک جاری رہی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کو اگرچہ جہاد میں مکمل فتح حاصل نہ ہو سکی، لیکن ان کی مجاہدانہ سرفروشیوں سے سکھوں کا زور ٹوٹا۔ پنجاب و سرحد اور افغانستان کے مسلمانوں کے دلوں سے رنجیت سنگھ کا خوف و ہراس نکلا، جہاد و سرفروشی کا جذبہ و شوق از سرِ نو بیدار ہو گیا، ذلت و محکومی کی زندگی سے عام نفرت پیدا ہو گئی۔ انشاء اللہ تعالیٰ شہداء اور مجاہدین کو آخرت میں جو اعزاز اور سرفرازی حاصل ہو گی اس کا تصور ہم نہیں کر سکتے۔ ایسی صورت میں سید صاحبؒ کے اقدامِ جہاد کو "ناقابلِ فہم حد تک غیر دانشمندانہ" قرار دینا اور یہ کہنا کہ "اس جنگ کا مطلق کوئی فائدہ مسلمانوں کو نہ ملا" حد درجہ بے بصیرتی اور ظاہر بینی ہے۔

اس مضمون کو ہم "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے ایک اقتباس پر ختم کرتے ہیں :

> "وہ خلعتِ شہادت پہن کر جس کریم کی بارگاہ میں پہنچے وہاں نہ مقاصد کی کامیابی کا سوال ہے، نہ کوششوں کے نتائج کا مطالبہ، نہ شکست و ناکامی

پر عتاب ہے اور کسی سلطنت کے عدم قیام پر محاسبہ، وہاں صرف دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں؛ صدق و اخلاص اور اپنی مساعی و وسائل کا پورا استعمال۔ اس لحاظ سے شہدائے بالاکوٹ اس دنیا میں بھی سرخرو ہیں اور ان شاء اللہ دربار الٰہی میں بھی باآبرو کہ انھوں نے اخلاص کے ساتھ اپنے مالک کی رضا کے لیے اپنی مساعی اور وسائل کے استعمال میں ذرہ برابر کمی نہیں کی، ان کا وہ خونِ شہادت جو ہماری مادی نگاہوں کے سامنے بالاکوٹ کی مٹی میں جذب ہو گیا اور اس کے جو چھینٹے پتھروں پر باقی تھے وہ روز دو القعدہ کی بارش نے ان کو بھی دھو دیا۔ وہ خون جس کے نتیجے میں کوئی سلطنت قائم نہیں ہوئی، کسی قوم کا مادی و سیاسی عروج نہیں ہوا اور کوئی نخلِ آرزو اس سے سرسبز ہو کر بارآور نہیں ہوا۔ اس خون کے چند قطرے اللہ کی میزانِ عدل میں پوری سلطنتوں سے زیادہ وزنی ہیں۔ . . . .

بے شک شہدائے بالاکوٹ کے خون نے دنیا کے سیاسی و جغرافیائی نقشے میں کوئی فوری تغیر نہیں پیدا کیا، خونِ شہادت کی ایک مختصر سی لکیر ابھری تھی۔ اس کی جگہ نہ جغرافیہ نویس کے طبعی نقشے میں تھی، نہ مؤرخ کے سیاسی مرقع میں۔ لیکن کسے خبر کہ خونِ شہادت دفترِ قضا و قدر میں کس اہمیت و اثر کا مستحق نہ سمجھا گیا۔ اس نے مسلمانوں کے نوشتۂ تقدیر کے کتنے دھبے دھوئے۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے یہاں جس کے یہاں محو و اثبات کا عمل جاری رہتا ہے "یمحوا اللّٰہ ما یشاء و یثبت وعندہ اُمّ الکتٰب" (الرعد: ۳۹) کون سے فیصلے کروائے، اس نے کسی مستحکم سلطنت کے لیے خاتمہ و زوال اور کسی پس ماندہ قوم کے لیے عروج و اقبال کا فیصلہ کروایا، اس سے کس قوم کا بخت بیدار ہوا اور کس سرزمین کی قسمت جاگی، اس نے کتنی بظاہر ناممکن الوقوع باتوں کو ممکن بنا دیا اور کتنی بعید از قیاس چیزوں کو واقعہ اور مشاہدہ بنا کے دکھا دیا۔"

(سیرت سید احمد شہیدؒ، ص ۴۲۶۔۴۲۱، ج ۲)

اکبر اور عالم گیر

وحیدالدین خاں کی نظر میں

وحیدالدین خاں صاحب کو ہر مسئلہ میں اپنی الگ رائے قائم کرنے اور سوادِ اعظم کی رائے سے اختلاف کرنے کا حد درجہ شوق ہے، قرآن و سنت کی تشریح کا مسئلہ ہو یا سیرت و تاریخ کی تعبیر کا، انھوں نے ہر میدان میں اپنا انوکھا شیش محل تعمیر کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ "الرسالہ" کا تازہ شمارہ (جولائی سنہ ۱۹۹۰ء) ہمارے پیش نظر ہے، اس شمارہ میں جناب وحیدالدین خاں صاحب نے "ایک جائزہ" کے عنوان سے تین صفحات کا ایک مضمون لکھا ہے، جس میں انھوں نے اکبر اور عالم گیر وغیرہ کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے، یہ جائزہ تاریخی حوالوں سے خالی ہے اور جناب وحیدالدین خاں صاحب کی "تاریخ سازی" کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ اس مضمون کا کچھ حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> "ظہیرالدین محمد بابر (۱۵۳۰-۱۴۸۳) نے ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ وہ پندرہ سو اکیس میں برصغیر میں داخل ہوا، مختلف لڑائیوں کے بعد آخر کار سنہ ۱۵۲۶ء میں اس نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر کے مغل سلطنت کا آغاز کیا، بابر کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت پر بیٹھا۔
>
> جلال الدین محمد اکبر (۱۶۰۵-۱۵۴۲) ہمایوں کا بیٹا تھا، ہمایوں کی وفات کے بعد سنہ ۱۵۵۶ء میں وہ مغل تخت پر بیٹھا، اس وقت مغل سلطنت ایک غیر مستحکم سلطنت کی حیثیت رکھتی تھی، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مغلوں کی حیثیت

بیرونی حملہ آوروں کی تھی، اس بنا پر یہاں کے قدیم باشندوں میں ان کے خلاف ناراضگی پائی جاتی تھی۔ اس ناراضگی کو ختم کرنے کے لیے اکبر نے وہ تدبیر کی جو عام طور پر دین الٰہی کے نام سے مشہور ہے۔ دین الٰہی حقیقتاً کوئی دین نہ تھا وہ ملک میں مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کو ختم کرنے کی ایک تدبیر تھی، اپنے ظاہری بھونڈے پن کے باوجود یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ اکبر اس میں کامیاب ہو گیا کہ وہ اپنی سیاسی استحکام کے لیے ملک کی اکثریت کا تعاون حاصل کر سکے۔

اکبر نے یہ کام اگرچہ اپنے سیاسی مفاد کے لیے کیا تھا۔ مگر جب ملک میں ہندو مسلم نفرت ختم ہوئی تو اس کا فائدہ اسلام کو بھی پہنچنے لگا، لوگ کثیر تعداد میں اسلام قبول کرنے لگے۔ اکبر سے لے کر شاہجہاں تک لاکھوں کی تعداد میں مقامی باشندے اسلام میں داخل ہوئے اس میں سب سے بڑا دخل اس معتدل فضا کا تھا جو اکبر کی پالیسی کے ذریعہ پیدا ہوئی۔ اکبر کی نیت کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں تاہم اگر بالفرض وہ اتنا ہی برا ہو جتنا کہ کچھ لوگ اس کو سمجھتے ہیں، تب بھی ہمارے مذکورہ تجزیہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ اکبر کی میل ملاپ کی پالیسی کے نتیجہ میں ہندوستان میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ یہ کی حد تک یہ واقعہ بدستور مسلم ہے البتہ اگر وہ بالفرض ایک غلط آدمی رہا ہو تو اس کا معاملہ اس حدیث کے تحت شمار کیا جائے گا جس میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خبر دی ہے کہ ان اللہ لیؤید هذا الدین برجل فاجر (بے شک اللہ اس دین کی مدد فاجر آدمی کے ذریعہ بھی کرے گا۔

آخری مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر (۱۷۰۷ - ۱۶۱۸) کے زمانہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات دوبارہ خراب ہو گئے۔ اورنگ زیب نے اپنی ناعاقبت اندیشانہ پالیسیوں سے راجپوت، مراٹھا اور سکھ ہر ایک کو

اپنا مخالف بنا لیا، حتیٰ کہ عام ہندو بھی اس کو ناپسند کرنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں ازسرِ نو کشیدگی کا ماحول قائم ہو گیا۔ اسلام کے پھیلنے کا جو عمل اپنے آپ جاری ہوا تھا وہ رُک گیا۔ ہندو مسلم منافرت کی بنا پر وہ معتدل ماحول ختم ہو گیا جو اسلام کی اشاعت کے لیے ضروری ہے۔ اورنگ زیب کے بعد مغل سلطنت زوال کا شکار ہو گئی، تاہم اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد صوفیاء کو کھڑا کیا۔ سارے ملک میں صوفیاء اپنی خانقاہیں بنا کر بیٹھ گئے، ان کا خاص مقصد لوگوں کو محبت کا پیغام دینا تھا۔ صوفیاء کو اپنے اس مشن میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی، ہندو اور مسلمان دونوں بہت بڑی تعداد میں ان کے حلقہ میں شریک ہو گئے۔ یہاں تک کہ صوفیاء ہی سماج کا وہ عنصر بن گئے جو سماج کے اوپر سب سے زیادہ اثر رکھتا تھا اور لوگوں کے مزاج کی تشکیل کرتا تھا۔

بابر کی پیدا کی ہوئی نفرت کو اکبر نے ختم کیا تھا، اورنگ زیب کی پیدا کی ہوئی نفرت کو صوفیاء نے ختم کیا، اس کے بعد دوبارہ وہ معتدل فضا پیدا ہو گئی جو اسلام کی اشاعت کے لیے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کے بعد اگرچہ مغل سلطنت پر زوال آ گیا مگر اسلام کی اشاعت تیزی سے جاری ہو گئی، اس دور میں دوبارہ لاکھوں لوگ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گئے۔"

(الرسالہ جولائی ۱۹۹۰ء، ص ۴-۵)

وحید الدین خاں صاحب کا یہ پورا جائزہ "علم سینہ" کی حیثیت رکھتا ہے، موصوف نے اس جائزہ میں کسی بات کے لیے کوئی حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ حالانکہ اس جائزہ میں جو باتیں چھیڑی ہیں، انھیں ثابت کرنے کے لیے بے پناہ تاریخی شواہد اور حوالوں کی ضرورت تھی۔

اس جائزہ میں وحید الدین خاں صاحب نے جس اکبر نوازی اور عالمگیر دشمنی کا ثبوت دیا ہے اس کے پیچھے تاریخی شواہد کا فقدان ہے۔ شہنشاہ اکبر کا ایک نیا دین ایجاد کرنا ان تاریخی حقائق میں سے ہے، جسے ایک دو صفحے کے بے حوالہ مضمون سے

چھپایا نہیں جاسکتا۔ اکبر کے ایجاد کردہ دین الٰہی اور اس کے دینی عقائد و رجحانات کے بارے میں متعدد تصنیفات اور مقالات شائع ہو چکے ہیں، جو تاریخی حوالوں سے آراستہ اور اکبر کے معاصر مراجع کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں، عہد اکبری کے محتاط اور حقیقت نگار مؤرخ ملّا بدایونی کی "منتخب التواریخ" میں اکبر کے ایجاد کردہ دین الٰہی اور اس کے دینی عقائد و رجحانات کے بارہ میں جو بھرپور معلومات موجود ہیں اسے ہم اگر نظر انداز بھی کر دیں تو بھی ابو الفضل کی کتاب "آئین اکبری" اور امام ربّانی مجدد الف ثانیؒ کی مکتوبات میں اس سلسلہ میں جو مواد ہے، وہ اکبر کے دین الہی اور اس کے مذہبی عقائد و رجحانات سے پردہ اٹھانے کے لیے کافی ہے۔

پروفیسر محمد اسلم صاحب نے "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" کے نام سے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے، جس میں انھوں نے انتہائی مستند مراجع سے استفادہ کرکے اکبر کے دین الٰہی اور اس کے ملحدانہ اور مشرکانہ عقائد و رجحانات کو یکجا کیا ہے۔ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے بھی اپنی مشہور کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" کی جلد چہارم میں "دین الٰہی" اور اس کے پس منظر کے بارے میں بڑا بیش قیمت مواد اکٹھا کر دیا ہے۔ موصوف نے ملّا عبد القادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" کے بجائے ابو الفضل کی آئین اکبری سے دین الٰہی اور اکبر کے باطل عقائد کے بارے میں معلومات لی ہیں۔ ابو الفضل علّامی اکبر کا معتمد ترین وزیر اور اس کا نفس ناطقہ تھا۔ ابو الفضل کے بارے میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اکبر کو بدنام کرنے کے لیے اس کی طرف غلط عقائد و خیالات منسوب کیے ہوں گے، اس لیے کہ وہ اکبر کا انتہائی معتمد رہا، اور اکبر کے دل و دماغ پر آخر وقت تک حاوی رہا۔ "آئین اکبری" میں ابو الفضل نے مختلف جگہوں پر اکبر کی آتش پرستی و آفتاب پرستی، تاریخ ہجری سے تنفر، زکوٰۃ کی منسوخی، شراب نوشی، ہندوانہ رسموں کی ادائیگی، سنین الٰہی کے اجراء اور اکبر کے دوسرے ملحدانہ افکار و خیالات اور اسلام دشمن رجحانات کا ذکر کیا ہے، اس کی تفصیل "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" اور "تاریخ دعوت و عزیمت" جلد چہارم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد الف ثانیؒ) کے تجدیدی کارنامے کا مرکزی حصہ ہی یہ ہے کہ انھوں نے اکبر کے ایجاد کردہ دین الٰہی اور اس کے پیدا کردہ اسلام دشمن افکار و خیالات کا ازالہ فرمایا اور دربارِ سلطانی نیز عوام میں اسلام کا کلمہ بلند کیا، نبوت محمدی پر اعتماد بحال کیا۔ مکتوبات امام ربانی میں مختلف مکاتیب کے اندر ان اسلام دشمن حالات کا بڑے درد کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے جو اسلام اور مسلمانوں پر عہد اکبری میں گزرے۔ مجدد الف ثانیؒ کا عہد جہانگیر کا دورِ سلطنت ہے، اسی سے متصلاً پہلے اکبر کا اسلام دشمن عہد گزرا تھا، اس لیے مجدد الف ثانیؒ نے امراء سلطنت کو جو مکاتیب لکھے ان میں اس دورِ ظلمت کا بار بار ذکر ہے۔ نواب سید فرید بخاری کے نام مجدد صاحب کا ایک مکتوب جو جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد لکھا گیا، اس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

"بادشاہ کو عالم سے وہی نسبت ہے جو دل کو بدن سے ہے۔ اگر دل صحیح و صالح ہے تو بدن بھی صحیح اور صالح ہوگا، اور اگر وہ فاسد ہے تو بدن بھی فاسد ہوگا۔ بادشاہ کا صلاح عالم کا صلاح، اور اس کا فساد عالم کا فساد ہے۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ قرن ماضی (عہد اکبری) میں اہلِ اسلام کے سر پر سے کیا مصیبت گزر گئی، اس سے پہلے کی صدیوں میں غربت اسلام کے باوجود اہلِ اسلام کی ذلت و خواری اس سے زیادہ نہ ہوئی تھی۔ اُس زمانہ میں زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے دین پر رہیں اور اہلِ کفر اپنے طریق پر، لکم دینکم ولی دین ــــ لیکن قرن ماضی میں اہلِ کفر غالب آ کر برملا احکام کفر کا اجراء کرتے تھے، اور مسلمان اسلام کے احکام کے اظہار سے بھی مجبور تھے۔ اگر کوئی ہمت بھی کرتا تھا تو موت کی سزا پاتا تھا۔ واویلاہ وامصیبتاہ واحزناہ، واحسرتاہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ماننے والے ذلیل و خوار تھے، اور آپ کی نبوت کا انکار کرنے والے باعزت و با اعتبار، مسلمان اپنے زخمی دلوں کے ساتھ اسلام کی نوحہ خوانی میں مصروف تھے اور

معاندین تمسخر و استہزاء کے ساتھ ان کے زخموں پر نمک پاشی کر رہے تھے، آفتاب ہدایت گمراہی کے پردہ میں مستور اور نور حق، باطل کے حجابات میں مخفی اور روپوش تھا۔

آج جب کہ اسلام کے غلبہ و اقبال سے جو چیز مانع تھی اس کے دور ہو جانے اور بادشاہِ اسلام کے سریر آرائے سلطنت ہونے کا مژدہ خاص و عام کے کانوں تک پہنچا ہے۔ اہلِ اسلام نے اپنے ذمہ ضروری سمجھا کہ وہ بادشاہ کے مدد و معاون بنیں اور شریعت کی ترویج اور ملت کی تقویت کا راستہ دکھائیں۔ یہ امداد و تقویت خواہ زبان سے میسر آئے خواہ ہاتھ سے۔" (مکتوب نمبر ۴۷، دفتر اول)

مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کا مطالعہ کرنے سے اکبر کے دینِ الٰہی اور اس کے دورِ سلطنت میں اسلام کی غربت و بے کسی اور مسلمانوں کی زبوں حالی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مجدد الف ثانیؒ کا اصل کارنامہ یہی ہے کہ دورِ اکبری میں ہندوستان میں اسلام کے لیے جو سنگین خطرات پیدا ہوئے تھے، آپ نے اپنی تجدیدی کوششوں سے ان کا ازالہ فرمایا۔ سیرت نگارِ نبوی اور مورخ اسلام مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس بلیغ عبارت میں عہد اکبری کا نقشہ کھینچا ہے۔ "ہندوستان کے عزت کدہ میں مسافرِ اسلام" کی داستانِ سفر اس طرح بیان کرتے ہیں:

"اس غفلت کی نیند پر چار سو برس گزر گئے اور مسافر کے آغازِ سفر پر ہزار داں برس گزر رہا تھا، یہ اکبر کا دور تھا۔ جب عجم کے ایک جادوگر نے آکر بادشاہ کے کان میں یہ منتر پھونکا کہ دینِ عربی کی ہزار سالہ عمر پوری ہو گئی۔ اب وقت ہے کہ ایک شہنشاہ امی کے ذریعہ نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دین منسوخ ہو کر دینِ الٰہی کا ظہور ہو۔ مجوسیوں نے آتش کدے گرمائے، عیسائیوں نے ناقوس بجائے اور برہمنوں نے بُت آراستہ کیے اور جوگ اور تصوف نے مل کر کعبہ اور بُت خانہ کو ایک ہی چراغ سے روشن

کرنے پر اصرار کیا۔ اس چیچ میل تحریک کا جو اثر ہوا اس کی تصویر کوئی اگر
دیکھنا چاہے تو "دبستانِ مذاہب" کا مطالعہ کرے، کتنے زنّار داروں کے
ہاتھوں میں تسبیح اور کتنے تسبیح خوانوں کے گلوں میں زنّار نظر آئیں گے۔
بادشاہی آستانہ پر کتنے امیروں کے سر سجدہ میں پڑے، اور شہنشاہ کے
دربار میں کتنے دستار بند کھڑے دکھائی دیں گے اور مسجدوں کے منبر سے
یہ صدا سنائی دے گی :

"تعالیٰ شانہ۔ اللہ اکبر"

یہ ہو ہی رہا تھا کہ سرہند کے سمت سے ایک پکارنے والے کی
آواز آئی "راستہ صاف کرو کہ راستہ کا چلنے والا آتا ہے"۔ ایک فاروقی
مجدّد فاروقی شان سے ظاہر ہوا، یہ احمد سرہندی تھے۔"

(مقدمہ سیرت سید احمد شہید ص ۳۰-۳۱)

اکبر کی اسلام دشمن پالیسیاں اور ملحدانہ رجحانات اس کی معاصر تاریخوں کی
روشنی میں بدیہی حقیقت بن چکے ہیں۔ اس کے تمام معاصر مؤرخین اس بات پر متفق
ہیں کہ اس نے اسلام کے بالمقابل ایک نیا مذہب ایجاد کیا جو آفتاب پرستی،
آتش پرستی، ہندوانہ عقائد و رسوم، اور تصوف کے بگڑے ہوئے نظریات کا
ملغوبہ تھا۔ ملّا عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ"، ابوالفضل علّامی کی
"آئینِ اکبری"، مجدّد الف ثانیؒ کے مکتوبات، خواجہ عبید اللہ ابن خواجہ باقی باللہ
دہلوی کی "مبلغ الرجال" اور دوسری معاصر کتابوں سے عہد اکبری کی وہی تصویر
سامنے آتی ہے جو اوپر رقم کی گئی، اکبر نے اپنے دور میں جو اسلام دشمن
اقدامات کیے، انھیں یہ کہہ کر سندِ جواز نہیں دی جاسکتی کہ اس نے ہندوؤں کو قریب
کرنے کے لیے اور ان کے دلوں سے نفرت ختم کرنے کے لیے یہ اقدامات کیے
تھے۔ ان اقدامات سے اکبر کی نیت خواہ کچھ بھی رہی ہو، لیکن ان اقدامات کا
مخالفِ اسلام ہونا اتنا بدیہی اور روشن ہے کہ ان کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔

وحیدالدین خاں صاحب کی خالص طبع زاد بات ہے کہ اکبر کی مذہبی پالیسی کی وجہ سے
ہندو مسلم منافرت ختم ہوئی اور لوگ کثیر تعداد میں اسلام قبول کرنے لگے۔ وحیدالدین
خاں صاحب نے اپنے دوسرے دعووں کی طرح اس دعوے کو بھی تاریخی دلائل سے
ثابت نہیں کیا۔ اکبر کے مذہبی رجحانات اور اسلام دشمن اقدامات کی وجہ سے ہندوستان
میں اسلام کا مستقبل سنگین خطرات سے دوچار تھا اور اس دور کے تمام مسلمان اس
صورت حال سے انتہائی نالاں تھے، دَورِ اکبری میں ہندو مذہب اور ہندوانہ عقائد
و رسوم کو جو فروغ حاصل ہوا اس کی وجہ سے ہندوؤں کا اکبر کی پالیسیوں سے خوش
ہونا ایک فطری بات تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا محض ہندوؤں کے خوش ہو جانے
سے اکبر کے ان اسلام دشمن اقدامات کی تحسین کی جا سکتی ہے، اس کی اجازت تو
کسی حال میں نہیں دی جا سکتی ہے کہ غیر مسلموں کو قریب لانے اور ان کے دلوں سے
نفرت نکالنے کی خاطر اسلام کے عقائد و تعلیمات میں تبدیلی کر دی جائے اور مشرکانہ
عقائد و رسوم کو اسلام کے اندر سمو دیا جائے، جناب وحیدالدین خاں صاحب
کا یہ لکھنا کہ "دین الٰہی حقیقتاً کوئی دین نہ تھا وہ ملک میں مسلمانوں اور غیر مسلموں
کے درمیان نفرت کو ختم کرنے کی ایک تدبیر تھی" تاریخی حقائق پر مبنی نہیں ہے
بلکہ من مانی تاریخ سازی ہے۔ اکبر کی معاصر تاریخوں میں دین الٰہی اور اس کے
عقائد کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے، اس لیے آج کسی "مفکر" کا بڑی آسانی کے ساتھ
یہ لکھ دینا کہ دین الٰہی حقیقتاً کوئی دین نہ تھا، تاریخی حقائق کو چھپا نہیں سکتا۔

اورنگ زیب عالمگیر کو آخری مغل شہنشاہ قرار دے کر جناب وحیدالدین
خاں صاحب نے اپنی تاریخ دانی کا بھرم کھول دیا ہے۔ اورنگ زیب کے بارے
میں موصوف کا دل آزار اور بے بنیاد تبصرہ خود ان کی حیثیت کو مجروح کرتا ہے۔
اورنگ زیب کا سیاسی تدبّر، بے داغ کردار، اقبال مندی اور فتوحات نیز اس
کی مذہبی رواداری، تاریخی مسلّمات میں سے ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر بڑا
بے مثال حکمراں تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ صحیح العقیدہ باعزیمت مسلمان تھا،

اس نے ہندوستان میں دوبارہ اسلام کے اقتدار اور وقار کو بحال کیا۔ اکبر کی اسلام دشمن پالیسیوں کی وجہ سے ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کو جو خطرات درپیش تھے، ان کا ازالہ کیا، اور تاریخ ہند میں اسلام کا حامی و پاسبان بن کر اٹھا۔ عالمگیر نے سلطنت مغلیہ کا رخ صحیح سمت کی طرف موڑا، اور اسلام کی کسمپرسی کو دور کر کے اس کی عزت و شان میں اضافہ کیا؛ اسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس نے غیر مسلموں کے ساتھ ہر طرح کا عدل و انصاف اور رواداری کا برتاؤ کیا؛ جہاں تک ہندو راجاؤں سے جنگوں کا تعلق ہے تو یہ جنگیں کس مغل شہنشاہ کے دور میں برپا نہیں ہوئیں۔ کیا اکبر کا دور ایسی جنگوں سے خالی ہے؟ عالمگیر چونکہ پکا مسلمان تھا اور اس نے تخت نشین ہونے کے بعد اکبر کے اسلام دشمن اقدامات کو ختم کیا، اس لیے ہندو مؤرخین کا اس سے نالاں ہونا بالکل فطری بات ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادہ اور خلیفہ حضرت خواجہ محمد معصومؒ سے بیعت و ارادت کا تعلق رکھتے تھے، جیسا کہ مکتوبات سیفیہ کے مکتوب ۲۳ سے معلوم ہوتا ہے۔ عالمگیر محض ایک دیندار فرمانروا ہی نہیں تھا۔ بلکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس نے مجدد الف ثانیؒ کے تجدیدی اور اصلاحی منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا اور سیکڑوں سال کے لیے ہندوستان کا مضبوط رشتہ اسلام کے سرچشمہ سے قائم کر دیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے تاریخی حوالوں سے اورنگ زیب عالمگیر کے اسلامی کارنامے اور خاندان مجددی سے تعلقِ بیعت و ارادت کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے:

"عالمگیر کے متعلق جو مستند تاریخی مواد موجود ہے اس کی بنا پر پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہ حضرت مجدد صاحب کی اصلاحی و تجدیدی تحریک سلطنت کو "حادم اسلام" کے بجائے "خادم اسلام" بنانے کی انقلاب انگیز، مگر خاموش کوششوں اور ان کے فرزندوں اور خاندان کی گہری و بے لوث روحانیت، اور دل آویز شخصیتوں

سے پورے طور پر متاثر تھا، اور اس نے حضرت مجدد کی دعوت مقاصد سے ہم آہنگی پیدا کر لی تھی، وہ نظام سلطنت اور معاشرہ میں جرأتمندانہ اور دوررس تبدیلیاں لانا چاہتا تھا۔"

(تاریخ دعوت و عزیمت جلد چہارم ص ۲۲۹، ۲۳۰)

قرآن پاک نے بڑی وضاحت سے غیر مسلموں کی نفسیات بیان کرتے ہوئے بتایا، ولن ترضیٰ عنک الیہود ولا النصاریٰ حتیٰ تتبع ملتہم۔ یعنی یہود و نصاریٰ اس وقت تک آپؐ سے راضی و خوش نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ ان کی پیروی نہ کرنے لگیں۔" اس لیے عالمگیر نے جب سلطنت کو اسلامی اصولوں پر استوار کیا اور اکبر کی ہندو نواز اسلام دشمن پالیسیوں کی بیخ کنی کی تو غیر مسلم مورخین اس سے کس طرح خوش ہو سکتے تھے۔ غیر مسلم مورخین نے عالمگیر کی ہندو کشی اور مذہبی تنگ نظری کے خوب خوب افسانے تراشے، اور اورنگ زیب کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، لیکن تاریخی حقائق پر زیادہ عرصہ پردہ ڈالنا مشکل ہوتا ہے اس لیے جب غیر جانبداری سے خالص علمی بنیادوں پر عالمگیر کا مطالعہ کیا گیا تو پروپیگنڈہ کا غبار چھٹ گیا اور تاریخ کے سمندر سے عالمگیر کا جگمگاتا ہوا چہرہ دنیا کے سامنے آیا۔ اس کی تنگ نظری کے افسانے ہوا میں اڑ گئے۔ عالمگیر نے احیاء اسلام کے لیے جو گرانقدر کوششیں کیں انھیں کی بنا پر ہندوستان کے دینی حلقوں میں انھیں محی الدین کا لقب دیا گیا۔ علامہ شبلیؒ نے اورنگ زیب کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈہ کے جواب میں پوری کتاب لکھی۔ اقبالؒ نے اپنے اشعار میں عالمگیر کو خراج عقیدت پیش کیا، اورنگ زیب کے کارناموں اور ان کے تدبر نیز سیاسی بصیرت پر نظر رکھنے والے وحید الدین خاں صاحب کا یہ پیراگراف پڑھ کر موصوف کی تاریخ دانی پر ماتم کریں گے:

"آخری مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر (۱۷۰۷ - ۱۶۱۸) کے زمانہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات دوبارہ خراب ہو گئے۔

اورنگ زیب نے اپنے ناعاقبت اندیشانہ پالیسیوں سے راجپوت، مرہٹا اور سکھ ہر ایک کو اپنا مخالف بنالیا، حتیٰ کہ عام ہندو بھی اس کو ناپسند کرنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں ازسرِ نو کشیدگی کا ماحول قائم ہوگیا۔ اسلام کے پھیلنے کا جو عمل اکبر کے بعد اپنے آپ جاری ہوا تھا وہ رک گیا، ہندو مسلم منافرت کی بنا پر وہ معتدل ماحول ختم ہوگیا جو اسلام کی اشاعت کے لیے ضروری ہے۔" (الرسالہ جولائی سنہ ۱۹۹۰ء، ص ۵)

اس جائزہ میں وحیدالدین خاں صاحب نے جو کچھ بھی لکھا ہے اسے ثابت کرنے کے لیے انھوں نے حوالوں کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے، نہ اس کا کوئی حوالہ دیا ہے کہ اکبر کی دینی پالیسی کی وجہ سے لوگ کثیر تعداد میں اسلام قبول کرنے لگے، اور نہ ہی اس دعوے کو تاریخی حوالوں سے ثابت کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے کہ عالمگیر کی پالیسیوں کی وجہ سے اسلام کی اشاعت کا عمل رُک گیا، اور ہندو مسلم منافرت بڑھ گئی۔

بات تلخ تو ضرور ہے لیکن حقیقت کی صحیح ترجمانی ہے کہ جناب وحیدالدین خاں صاحب اس دور میں اکبر کی پالیسیوں کو زندہ کرنا چاہتے ہیں، وہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے ہر اقدام کے لیے تیار ہیں، خواہ اس سے دین وملت کا کتنا ہی بڑا نقصان ہو، آئے دن مختلف مسائل کے بارے میں ان کے ہندوؤں کو خوش کرنے والے بیانات آتے رہتے ہیں، چاہے وہ مسئلہ مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا ہو، یا فسادات، اردو زبان، اور ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کا — یا بابری مسجد کا قضیہ ہو۔ تاریخی حقائق اور دستاویزات سامنے آنے کے بعد اکبر کی طرف سے وہی شخص دفاع کرسکتا ہے جس کا دل اسلام کی عظمت اور تقدس سے خالی ہو، اور حقائق سے آنکھیں بند کرکے رائے قائم کرنے کا عادی ہو۔

جناب وحیدالدین خاں صاحب اورنگ کے بعد کی صورت حال کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اورنگ زیب کے بعد مغل سلطنت زوال کا شکار ہو گئی، تاہم اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد صوفیا کو کھڑا کیا۔ سارے ملک میں صوفیاء اپنی خانقاہیں بنا کر بیٹھ گئے، ان کا خاص مقصد لوگوں کو محبت کا پیغام دینا تھا۔ صوفیاء کو اپنے اس مشن میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی، ہندو مسلمان دونوں بہت بڑی تعداد میں ان کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔ بابر کی پیدا کی ہوئی نفرت کو اکبر نے ختم کیا تھا، اورنگ زیب کی پیدا کی ہوئی نفرت کو صوفیاء نے ختم کیا، اس کے بعد دوبارہ معتدل فضا قائم ہو گئی جو اسلام کی اشاعت کے لیے ضروری ہے۔" (الرسالہ جولائی سنہ ۱۹۹۶ء ص ۵)

جناب وحید الدین خاں صاحب نے کاش ان صوفیاء کا نام لیا ہوتا جو اورنگ زیب کے بعد سارے ملک میں اپنی خانقاہیں بنا کر بیٹھ گئے تھے۔ اورنگ زیب کے بعد ہندوستان میں اصلاح و تجدید کا جو دور آیا اس کے سرخیل حضرت شاہ ولی اللہؒ تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے تلامذہ منتسبین اور مریدین سے تمام دینی گوشہ نشین عبادت تھیں، درسگاہوں کی رونق انھیں سے قائم تھی، خانقاہیں انھیں سے آباد تھیں ـــ اور میدانِ جہاد انھیں کی جولان گاہ تھا، اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خانوادے کی فردِ جرم جناب وحید الدین خاں صاحب کے نزدیک بہت طویل ہے کیونکہ ان حضرات نے دین کے تمام میدانوں کے آباد رکھنے کے ساتھ جہاد و شہادت کی رزمگاہ بھی آراستہ رکھی، اور یہ وحید الدین خاں صاحب کے نزدیک ایسا سنگین جرم ہے جس کے معافی کا سوال نہیں پیدا ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ خانوادۂ ولی اللہی کے علاوہ وہ کون سے صوفیاء تھے جو اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سارے ملک میں اپنی خانقاہیں بنا کر بیٹھ گئے، اور ان کے پیغامِ محبت سے ہندو اور مسلمانوں کی باہمی نفرت ختم ہوئی۔

اس مضمون کے آخر میں اپنا جائزہ مکمل کرتے ہوئے خاں صاحب نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ صوفیاء کے ذریعہ جو معتدل فضا قائم ہوئی تھی وہ سنہ

محمد علی جناح کی تحریک پاکستان اور دو قومی نظریے کی ایجاد سے ختم ہو گئی۔ سب سے آخری پیرے میں موصوف لکھتے ہیں:

"تبلیغی جماعت کا اصل نشانہ اگرچہ مسلمانوں کی دینی اصلاح ہے، مگر اس کے ذریعہ سے منافرت کے ختم کرنے کا وہ کام بالواسطہ طور پر انجام پا رہا ہے جو اس سے پہلے صوفیاء کے ذریعہ زیادہ بڑے پیمانہ پر انجام پایا تھا۔ اگر یہ عمل قابل لحاظ حد تک بڑھ جائے تو اشاعت اسلام کا رُکا ہوا کام دوبارہ ملک میں جاری ہو جائے گا۔" (ص ۹)

اس پیراگراف میں وحیدالدین خاں صاحب نے ایک کھیل کھیلا ہے وہ یہ کہ تبلیغی جماعت کے افراد کو خوش کرنے کے لیے یہ پیراگراف لکھا ہے تبلیغی جماعت کے بارے میں ان کے اصل نظریات اسی کتاب کے ایک مستقل باب میں ہم نے درج کیے ہیں جس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ وحیدالدین خاں صاحب تبلیغی جماعت کے بارے میں بہت بُری رائے رکھتے ہیں، لیکن ادھر چند سالوں سے انھوں نے موقع بموقع تبلیغی جماعت کی تعریف لکھنے کا معمول بنا لیا ہے تاکہ تبلیغی حلقہ جو پورے ہندوپاک میں بلکہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے ان کی ہمنوائی ہمیں حاصل ہو جائے۔ اسی لیے تبلیغی تحریک پر انھوں نے پوری کتاب بھی شائع کر دی ہے۔ حالانکہ تبلیغی جماعت کے بانی اور اکابر ان افکار و تصورات سے دور ہیں، جنھیں وحیدالدین خاں صاحب اپنی تحریروں میں پیش کر رہے ہیں۔ جو شخص حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خانوادے نیز مجاہدین شاملی کو تیز و تند تنقیدوں کا نشانہ بنایا کرتا ہو، اس کا تبلیغی جماعت سے کیا جوڑ ہو سکتا ہے۔ حضرت مولانا الیاسؒ کی برپا کی ہوئی تبلیغی تحریک درحقیقت خانوادہ مجددی اور خانوادۂ ولی اللہی کی دعوتی اور اصلاحی جدوجہد کا ایک عظیم ثمرہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بیسویں صدی عیسوی میں ظاہر فرمایا، اس لیے ان اکابر کی تجدیدی کوششوں کی تنقیص کرنے والا تبلیغی تحریک کا صحیح مؤید کیسے ہو سکتا ہے؟

جناب وحیدالدین خانصاحب کی

اقبال شناسی

شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم کی خدمات اور افکار و نظریات سے ہند و پاک کے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی پرمغز مفکرانہ شاعری سے مغربی تہذیب کا سحر توڑا، تعلیم یافتہ نوجوانوں کا اسلام پر اعتماد بحال کیا، اسلام کے شاندار ماضی کی جھلکیاں پیش کر کے مسلمانوں کی مایوسی اور جمود کو توڑا، نوجوانوں کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے اور ان میں فکر و عمل کا جذبہ اور جد وجہد کا حوصلہ پیدا کیا، علامہ اقبال مرحوم کا زمانہ وہ ہے جب مغربی تہذیب کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی اور عصری دانشگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلم نوجوان اپنے ماضی سے بدگمان ہو رہے تھے، اسلام سے ان کا اعتماد ختم ہو رہا تھا اور ان کے افکار و خیالات میں تلاطم برپا تھا۔ اس نازک دور میں علامہ اقبال کی شاعری نے نوجوانوں کو سنبھالا دیا، مغربی تہذیب کی غارت گری سے بڑی حد تک انھیں محفوظ رکھا اور انھیں مایوسی کے سمندر سے نکال کر جد وجہد کی شاہراہ پر لا کھڑا کیا۔

علامہ اقبال کی خدمات خواہ کتنی عظیم ہوں پھر بھی وہ انسان تھے، معصوم فرشتہ نہیں تھے، ان کے اشعار و افکار میں غلطیاں ہو سکتی ہیں، ان کی کتاب "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں پیش کیے گئے بعض نظریات پر سخت تنقیدیں کی گئی ہیں، ان کے بعض اشعار پر بھی لسانی اور نظریاتی تنقیدیں کی گئی ہیں لیکن تنقید کے لیے کوئی بنیاد ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شخص یہ تنقید کرنے لگے کہ علامہ اقبال نے مسلمانوں میں مایوسی

پیدا کی تو یہ تنقید اسی طرح حقیقت کو منھ چڑھاتا ہے جس طرح یہ کہنا کہ علامہ اقبال شاعر ہی نہیں تھے۔

اکتوبر ۱۹۸۲ء کے 'الرسالہ' میں وحیدالدین خاں صاحب نے لکھا ہے:

"مولانا شبلی نعمانی سے کسی نے پوچھا کہ بڑا آدمی بننے کا آسان نسخہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: کسی بڑے آدمی کے اوپر کیچڑ اچھالنا شروع کر دو۔" (ص ۵)

علامہ شبلی کا بیان کردہ نسخہ وحیدالدین خاں صاحب کو بہت پسند آیا لیکن چونکہ انھیں صرف "بڑا آدمی" نہیں بننا تھا بلکہ "سب سے بڑا آدمی" بننا تھا اس لیے انھوں نے "کسی بڑے آدمی" پر کیچڑ اچھالنی کافی نہیں سمجھی بلکہ کوشش کی کہ تمام بڑوں کو اپنی کیچڑ سے نوازیں، چنانچہ بہ قول شاعر:

ناوک نے اس کے صید نہ چھوڑے زمانے میں

علامہ اقبال بھی چونکہ "بڑے آدمی" ہونے کے "مجرم" تھے اس لیے وہ بھی جناب وحیدالدین خاں صاحب کی نوازشات سے محفوظ نہ رہ سکے۔

ان صفحات میں وحیدالدین خاں صاحب کی "اقبال شناسی" یا "اقبال نوازی" کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

ترکشِ مارا خدنگِ آخریں:

جناب وحیدالدین خاں صاحب مارچ ۱۹۸۹ء کے 'الرسالہ' میں سفر افغانستان کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"ایک صاحب اقبال کے فارسی کلام سے اچھی طرح واقف تھے، انھوں نے اقبال کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کو حوصلہ دیا۔ اگر اقبال نہ ہوتے تو موجودہ مسلمان بے حوصلہ ہو کر رہ جاتے۔ میں نے کہا کہ اقبال نے شاعرانہ ترنم تو قوم کو ضرور دیا، مگر جہاں تک حوصلہ

کا تعلق ہے، ان کے کلام نے برعکس کام کیا ہے، میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ اقبال نے سلطان ٹیپو کے بارے میں کہا کہ وہ ہماری ترکش کے آخری تیر تھے،

ترکشِ مارا خدنگ آخریں

اس شعر کی روشنی میں دیکھیے تو سلطان ٹیپو کی شکست (بالفاظ دیگر مسلمانوں کی عسکری قوت کی بربادی) کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے پاس گویا کچھ نہیں رہا۔ یہ تصور کتنی زبردست پست حوصلگی پیدا کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پھر آپ کے خیال میں اقبال کو کیا کہنا چاہیے تھا۔ میں نے کہا کہ اقبال کو کہنا چاہیے تھا کہ ٹیپو کی عسکری طاقت ختم ہوگئی تو غم کی بات نہیں، اسلامی دعوت کی طاقت زندہ ہے۔ تم اسلامی دعوت کو لے کر اٹھو اور اس کے ذریعہ دنیا کو مسخر کر لو۔ اقبال اگر یہ بات کہتے تو اس سے مسلمانوں کو رہنمائی ملتی۔ مگر ٹیپو کو "آخری تیر" کہہ کر انھوں نے مسلمانوں کو بے حوصلگی کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔" (الرسالہ مارچ ۱۹۸۹ء ص ۴۱)

علامہ اقبال مرحوم پر وحیدالدین خاں صاحب کی یہ تنقید خود موصوف کی شعر فہمی، اقبال شناسی اور علمی سطح کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ اس تنقید کا پہلا لطیفہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کا یہ مصرعہ "ترکشِ مارا خدنگ آخریں" سلطان ٹیپو کے بارے میں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وحیدالدین خاں صاحب کو اس شعر کے دوسرے مصرعہ کا علم ہی نہیں ہے، موصوف بس ایک مصرعہ لے اڑے، شاید انھوں نے کہیں یہ بھی سن لیا ہوگا کہ یہ شعر سلطان ٹیپو کے بارے میں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے یہ مصرعہ اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں کہا ہے۔ اگلی سطروں میں یہ پورا شعر اور اس سے پہلے اور بعد کے اشعار اردو ترجمہ کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں:

شاہ عالمگیر گردوں آستاں اعتبار دودمان گورگاں

بادشاہ عالمگیر جن کا مقام بہت بلند ہے مغل سلاطین کے خاندان کی آبرو ہیں

پایۂ اسلامیاں برتر ازو — احترامِ شرعِ پیغمبر ازو
اہلِ اسلام کا مقام اس کی وجہ سے بلند ہے — اس کی ذات سے پیغمبر کی شریعت کا احترام ہے

در میانِ کارزارِ کفر و دیں — ترکشِ ما را خدنگِ آخریں
کفر و اسلام کے جنگ کے درمیان — ہمارے ترکش کا آخری تیر تھا

تخمِ الحادے کہ اکبر پرورید — باز اندر فطرتِ دارا دمید
اکبر نے الحاد کا جو بیج بویا تھا — پھر وہی بیج دارا کی طبیعت میں چمکا

شمعِ دل در سینہ ہا روشن نبود — ملتِ ما از فساد ایمن نبود
سینوں میں دل کی شمع روشن نہیں تھی — ہماری ملت فساد سے محفوظ نہیں تھی

حق گزید از ہند عالمگیر را — آں فقیرِ صاحبِ شمشیر را
اللہ تعالیٰ نے ہندوستان سے عالمگیر کو چنا — وہ مرد فقیر جو صاحب شمشیر تھا

از پئے احیاءِ دیں مامور کرد — بہرِ تجدیدِ یقیں مامور کرد
اسے احیاءِ دین کے لیے مامور کیا — اور یقین کی تجدید کے لیے مامور کیا

برقِ تیغش خرمنِ الحاد سوخت — شمعِ دیں در محفلِ ما برفروخت
اس کی تلوار کی بجلی نے خرمنِ الحاد کو جلا دیا — ہماری محفل میں دین کی شمع روشن کر دی

کور ذوقاں داستانہا ساختند — وسعتِ ادراکِ او نشناختند
کور ذوقوں نے داستانیں تراشی ہیں — اس کے ادراک کی وسعت کو نہیں پہچان سکے

شعلۂ توحید را پروانہ بود — چوں براہیم اندریں بتخانہ بود
توحید کے شعلہ کا پروانہ تھا — اس بت خانہ میں ابراہیم کی طرح تھا

در صفِ شاہنشہاں یکتاستے
شہنشاہوں کی صف میں یکتا ہے
فقرِ او از تربتش پیداستے[1]
اس کا فقر اس کی تربت سے ظاہر ہے

---

[1] اسرار و رموز ص ۹۸۔۔۔۱۰۰ کلیاتِ اقبال فارسی مطبوعہ کتب خانہ نظیریہ اردو بازار دہلی

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد اب شاید کسی کو اس بات میں شبہ باقی نہ رہے کہ علامہ اقبال کا یہ شعر اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں ہے نہ کہ سلطان ٹیپو کے بارے میں۔ اقبال نے عالمگیر کا نام لے کر ان کی شان میں یہ اشعار کہے ہیں۔ تمام اشعار کو پڑھ کر۔ ع "ترکش مارا خدنگ آخریں" کا صحیح مفہوم بھی واضح ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کہنا چاہتے ہیں کہ اکبر نے دین اسلام کو ختم کرنے اور کفر کو فروغ دینے کی خاطر جس کارزار کا آغاز کیا تھا، اس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور دوسرے داعیانِ اسلام کی کوششوں کے بعد اسلام کو مکمل فتح اورنگ زیب عالمگیر کے ذریعہ ہوئی ـــــ اورنگ زیب عالمگیر نے اکبر کے تمام باقی ماندہ مشرکانہ اور ملحدانہ اقدامات کا ازالہ کیا اور مغل سلطنت کو خالص اسلامی شریعت پر استوار کیا۔ اقبال کے ان اشعار میں تاریخ ہند میں عالمگیر کے تجدیدی کارنامہ کا اعتراف کیا گیا ہے، ان اشعار میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے مسلمانوں کا حوصلہ پست ہو اور ان میں افسردگی اور مایوسی پیدا ہو۔ لیکن وحید الدین خاں صاحب نے اپنا شغل پورا کرنے کے لیے، غور و فکر اور تحقیق کے بغیر اول تو یہ دعویٰ کر دیا کہ اقبال نے : ع "ترکش مارا خدنگ آخریں" سلطان ٹیپو کے بارے میں کہا۔ اس کے بعد اس مصرعہ کو خود ساختہ معنی پہنا کر پست حوصلگی اور مایوسی پیدا کرنے والا قرار دیا۔ اس تنقید سے علامہ اقبال کا مقام تو پست نہیں ہوا، ہاں خود وحید الدین خاں صاحب کا قد معلوم ہو گیا۔

سلطان ٹیپو کا ذکر آ ہی گیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلطان ٹیپو کے بارے میں اقبال کے اشعار نقل کر دیئے جائیں تاکہ قارئین خود دیکھ لیں کہ اقبال نے مسلمانوں کا حوصلہ بلند کیا ہے یا پست کیا ہے۔

علامہ اقبال "ضرب کلیم" میں "سلطان ٹیپو کی وصیت" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

تو رہ نوردِ شوق ہے، منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیٔ محفل نہ کر قبول
صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیلؑ نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

اقبال شناسی کا ایک اور نمونہ:

علامہ اقبال پر وحید الدین خاں صاحب کی تنقید کا ایک اور نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس سے موصوف کی شعر فہمی سے پردہ اٹھتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کلامِ اقبال کا کس قدر مطالعہ کیا ہے۔ فروری سنہ ۱۹۹۰ء کے "الرسالہ" میں وحید الدین خاں صاحب نے "بے خبری" کے عنوان سے ایک صفحہ کا مضمون لکھا ہے، جس میں علامہ اقبال کے ایک شعر کو بنیاد بنا کر اقبال پر نوازشات کی بارش کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

"اقبال کا ایک مشہور فارسی شعر ہے، اس میں وہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ کا دین آدمی کو غار میں اور پہاڑی ویرانوں میں لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا دین اسلام ہم کو جنگ و شکوہ کا سبق دیتا ہے:

مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ
مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ

اقبال کا یہ شعر بتاتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ سے کم از کم شعوری طور پر بالکل بے خبر تھے۔ اقبال سنہ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے سنہ ۱۹۳۸ء میں ان کی وفات

ہوئی۔ یہ پورا زمانہ وہ ہے جب کہ عیسیٰ کو ماننے والی قوموں نے صدیوں کی ترقیاتی کوششوں کے بعد اپنے آپ کو اتنا اونچا اٹھایا کہ وہ تقریباً پوری دنیا پر براہ راست یا بالواسطہ طور پر غالب آگئیں۔ بالفاظ دیگر انھوں نے دین اسلام کے پیروؤں کو "غار و کوہ" میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا، اور خود "جنگ و شکوہ" کے ہر میدان میں مکمل برتری حاصل کر لی۔

اس واضح واقعہ کے باوجود اقبال اپنا مذکورہ بالا شعر کہتے ہیں جو اصل صورت حال کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر ماضی سے بھی بے خبری کا ثبوت ہے اور حال سے بے خبری کا بھی۔

مسیحی لوگ ابتدائی زمانہ میں اپنے مخالفین کی دار و گیر سے بھاگ کر غاروں اور پہاڑوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب کہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ غالب قوم بن گئے۔ یہی واقعہ خود مسلمانوں کے ساتھ بھی پیش آیا۔ مکہ کے ابتدائی دور میں مسلمان اپنے دین کو لے کر پہاڑی گھاٹیوں میں چلے گئے، اور ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، اس کے بعد حالات بدلے اور مسلمان عالمی سطح پر غالب اور فاتح بن گئے۔

اقبال اور ان کے جیسے دوسرے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے صرف دور ثانی کو جانتے ہیں اور مسیحیوں کے صرف دور اول کو، ایسے بے خبر لوگ اگر اپنی قوم کو وقت کے مطابق صحیح رہنمائی نہ دے سکیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس قسم کی رہنمائی صرف جھوٹا فخر دے سکتی ہے مگر جھوٹا فخر کسی کے کام آنے والا نہیں، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔"

(الرسالہ فروری ۱۹۹۰ء)

اس شعر کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے وحید الدین خاں صاحب نے علامہ اقبال کے بارے میں بڑے تیز و تند لہجہ میں بہت کچھ لکھ دیا، اگر علامہ اقبال بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے زمانہ سے بے خبر تھے تو پھر ہمیں سوچنا پڑے گا کہ ہم جناب وحید الدین صاحب

کی مکمل بے خبری کو کس لفظ سے تعبیر کریں۔ اقبال نے اپنے اس شعر میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی تاریخ نہیں بیان کرنی چاہی ہے بلکہ یہ بتانا چاہا ہے کہ دینِ مسیحی میں رہبانیت کی تعلیم ہے۔ اس کے برخلاف دینِ اسلام میں رہبانیت کی گنجائش نہیں ہے بلکہ اسلام جہاں گیری و جہاں داری کے آداب بھی سکھاتا ہے۔ اس طرح اقبال مسلمانوں کو جو تمام میدانوں میں پسپا ہو رہے تھے، اور کچھ لوگ اسلامی جہاد کے خلاف اہلِ یورپ کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر جہاد کے خلاف فضا ہموار کر رہے تھے جہاد پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، انھوں نے دوسرے الفاظ میں مسلمانوں سے یہ کہنا چاہا کہ مسیحیت کے ماننے والے جن کے مذہب میں رہبانیت اور ترکِ دنیا کی بڑی فضیلت ہے۔ وہ تو عصرِ حاضر میں جنگی اسلحہ سے لیس ہو چکے ہیں اور دنیا کے ہر حصہ میں فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑ رہے ہیں، اس کے برخلاف تم اسلام کے ماننے والے (جس میں جہاد کے بہت سے فضائل اور رہبانیت کی مذمت ہے) اپنے مذہب کی تعلیمات کے خلاف میدانِ جہاد سے فرار اختیار کر رہے ہو، اور عالمگیر قیادت سے کنارہ کش ہو کر غار و کوہ میں چھپ رہے ہو۔

اقبال کے اس شعر کو اگر صحیح طور پر سمجھا جائے تو اس سے اقبال کی زمانہ شناسی کا علم ہوتا ہے نہ کہ زمانہ سے بے خبری کا۔ اس طرح کی سطحی تنقیدیں علامہ اقبال کا مقام تو گھٹا نہیں سکتیں ہاں تنقید نگار کی تہی دامنی کا اعلان و اظہار ضرور کرتی ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق:

اگست ۱۹۸۳ء کے 'الرسالہ' میں وحید الدین خاں صاحب نے اسوۂ ابراہیمی کے عنوان سے ایک صفحہ کا مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے "صبر و اعراض" کی تعلیم دیتے ہوئے علامہ اقبال کے ایک شعر کا "آپریشن" کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

> "موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ صبر اور اعراض کو کم تر درجہ کی چیز سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ

مجاہدانہ جوش کے تحت فوراً میدان مقابلہ میں کود پڑے اس قسم کے اقدام کو وہ اسوۂ ابراہیمی قرار دیتے ہیں، مگر ان سے پوچھیے کہ اس جہاد یا اسوۂ ابراہیمی کا ماخذ کیا ہے تو وہ فوراً اقبال کا یہ شعر پڑھ دیں گے:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ شاعر کی خود ساختہ خیال آرائی ہے، نہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ۔ اس شعر میں حضرت ابراہیمؑ کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ سراسر خلاف واقعہ ہے، اس کا تعلق نہ قرآن و حدیث سے ہے اور نہ تاریخ سے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم بن آزر علیہ الصلوٰۃ والسلام عراق میں پیدا ہوئے، اس وقت وہاں مکمل طور پر شرک کا غلبہ تھا، آپ نے ان کو توحید کی طرف بلایا اور اپنی طرف سے کسی بھی قسم کا ٹکراؤ پیدا کیے بغیر خالص پُرامن انداز میں اس کی دعوت دیتے رہے قوم کے سردار جو بُت پرستی کے اوپر اپنی سرداری قائم کیے ہوئے تھے وہ آپ کے دشمن ہو گئے، انھوں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ آپ کو جلا کر ختم کر دیں، (قالوا حرقوہ الانبیاء۔ ۶۸) روایت بتلاتی ہے کہ اس کے بعد انھوں نے ایک گڑھا کھودا، اس گڑھے میں لکڑیاں ڈال کر اس میں آگ لگا دی، جب آگ خوب بھڑکنے لگی اس وقت انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو پکڑ کر انھیں باندھا، باندھ کر ان کو منجنیق میں رکھا اور منجنیق کے ذریعہ آپ کو آگ میں پھینک دیا (ثم اوثقوا ابراھیم وجعلوہ فی منجنیق ورموہ فی النار۔ صفوۃ التفاسیر المجلد الثانی ص ۲۰۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ آگ میں ڈالے گئے تھے نہ کہ آگ میں کود پڑے تھے، یہ جبر کا معاملہ تھا نہ کہ اختیار کا۔ مذکورہ شعر حضرت ابراہیمؑ کی جو تصویر پیش کرتا ہے وہ نہ صرف خلاف واقعہ ہے بلکہ خلاف اسلام بھی ہے

یہ ہرگز پیغمبروں کا اسوہ نہیں کہ آدمی بے خطر آگ میں کود پڑے۔ پیغمبروں کا اسوہ لوگوں کو آگ سے نکالنے کی کوشش کرنا ہے نہ کہ خواہ مخواہ آگ میں کود پڑنا۔"

(الرسالہ اگست ۱۹۸۴ء ص ۶)

——— وحید الدین خاں صاحب نے مذکورہ بالا اقتباس میں شعر فہمی کا جو جوہر دکھایا ہے اسے پڑھ کر فارسی کا مشہور مقولہ یاد آتا ہے "شعر من بمدرسہ کہ برد" اقبال کے شعر کی وضاحت کرنے سے پہلے اس اقتباس میں وحید الدین خاں صاحب نے جس فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے اس کا پردہ چاک کرنا بھی ضروری ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے جس اقدام کے ردعمل میں ان کی قوم نے انھیں آگ میں ڈالنے کا فیصلہ کیا، اسے خاں صاحب نے درمیان سے اس طرح غائب کر دینا چاہا کہ کسی کو اس کی ہوا بھی نہ لگ سکے، کیونکہ اگر موصوف نے حضرت ابراہیم کے اقدام کا ذکر کر دیا ہوتا تو صبر و اعراض کا شیش محل چکنا چور ہو گیا ہوتا، اور موصوف کے لیے یہ ثابت کرنا دشوار ہو جاتا کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی طرف سے کسی بھی قسم کا ٹکراؤ پیدا کیے بغیر خالص پُرامن انداز میں توحید کی دعوت دیتے رہے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ اقدام جس کے ردعمل کے طور پر ان کی قوم نے انھیں آگ میں ڈالنے کا فیصلہ کیا قرآن میں اتنی صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ ایک عام مسلمان سے بھی اس کو چھپانا ممکن نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کی عاجزی اور لاچاری قوم کے سامنے واضح کرنے کے لیے ان کے بت کدہ کے تمام بتوں کو (بڑے بت کو چھوڑ کر) توڑ دیا تھا، اس واقعہ کی پوری تفصیل سورۂ انبیاء کی آیات ۵۱ تا ۷۰ میں دیکھی جا سکتی ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کی لاچاری ثابت کرنے اور عقیدۂ شرک پر زبردست ضرب لگانے کے لیے بتوں کے توڑنے کا جو اقدام کیا، اسے وحید الدین خاں صاحب کے فکر و فلسفہ کے اعتبار سے خالص پُرامن انداز کی دعوت ہرگز نہیں کہا جا سکتا، اگر دور حاضر میں کوئی "داعی اسلام" خالص اور پاکیزہ جذبات کے ساتھ ہی بتوں کے توڑنے کا اقدام کر گزرے تو سب سے پہلے وحید الدین خاں صاحب ہی اسے غیر دینی

اور غیر اسلامی جارحیت کہہ کر الرسالہ کے صفحات سیاہ کریں گے، اس تحریر کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر موصوف کو واقعی اسوۂ ابراہیمی کی تحقیق کرنی تھی تو یہ بات دیانت کے سراسر خلاف تھی کہ وہ حضرت ابراہیم کی بُت شکنی کے واقعہ کو جو انھیں آگ میں ڈالے جانے کا اہم محرک تھا بالکل حذف کر دیں۔

جہاں تک اقبال کے شعر کا تعلق ہے اس میں اگر کوئی غلطی ثابت بھی ہو جائے تو اس میں وحید الدین خاں صاحب کی کوئی فتح مضمر نہیں ہے، علامہ اقبال خواہ کتنے عظیم ہوں لیکن بہر حال وہ انسان تھے، ان کے ہر ہر شعر اور ہر ہر فکر کی صحت کی ضمانت نہیں لی جا سکتی، لیکن عجیب اتفاق ہے کہ وحید الدین خاں صاحب نے علامہ اقبال کے جن جن اشعار کو تنقید کا ہدف بنایا ہے ان پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ قصور اقبال کا نہیں بلکہ وحید الدین خاں صاحب کی شعر فہمی کا ہے:

سخن شناس نئی دلبرا خطا ایں جاست

اگر زبان و ادب میں مجاز و استعارہ بھی کوئی چیز ہے تو اقبال کا شعر نہ تو حدیث و قرآن کے خلاف ہے اور نہ تاریخ کے، اقبال کے شعر کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص عشقِ الٰہی سے سرشار ہوتا ہے اور جذبۂ حق پرستی اس کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوتا ہے وہ حق کو ثابت کرنے اور حق پر قائم رہنے کی خاطر ہر طرح کی قربانی اور جفاکشی کے لیے تیار رہتا ہے، باطل کا کروفر اور راہ حق کے مصائب اسے جادۂ حق پرستی سے روک نہیں سکتے۔ حضرت ابراہیمؑ نے عقیدۂ توحید کو ثابت کرنے اور عقیدۂ شرک پر ضربِ کاری لگانے کی خاطر بُت شکنی کا جو عظیم الشان اقدام کیا، اس کے نتائج و عواقب سے بے خبر نہیں تھے، انھیں معلوم تھا کہ جب قوم کو میرے اس اقدام کا علم ہوگا تو میرے خلاف سخت سے سخت ردعمل ہوگا اور بُت پرست قوم مجھے سخت سے سخت سزا دے گی، لیکن انھوں نے اپنے اس اقدام کے عواقب و نتائج کا اندازہ لگانے کے باوجود توحید کا علم بلند کرنے کے لیے بُت شکنی کا زبردست قدم اٹھایا، اور اس اقدام کی وجہ سے پیش آنے والے مصائب و حالات کو خوشی خوشی

جھیلا۔ اقبال کے مذکورہ بالا شعر سے غالباً وحیدالدین خاں صاحب ہی نے پہلی بار یہ بات سمجھی ہو کہ اقبال کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام از خود آگ میں کود پڑے، انھیں آگ میں ڈالا نہیں گیا۔ جن لوگوں کو ادب و شاعری سے معمولی سا بھی لگاؤ ہے ان کے ذہن میں علامہ اقبال کے شعر کا وہ مفہوم نہیں آیا ہوگا جو مفہوم وحیدالدین خاں صاحب نے پیدا کرنا چاہا۔ کوئی شخص اگر کسی عمل و اقدام کے عواقب و نتائج سے باخبر ہونے کے باوجود دیدہ و دانستہ وہ عمل کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ان نتائج کو جھیلنے کے لیے بہ خوشی آمادہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بُت شکنی کے اقدام پر کوئی ندامت نہیں ہوئی، بلکہ وہ اپنے اقدام کو صحیح سمجھتے رہے اور اس پر قائم رہے۔

وحیدالدین خاں صاحب کی تحریر سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو تصویر اُبھرتی ہے وہ وحیدالدین خاں صاحب کے حسب حال تو ہوسکتی ہے لیکن سیدنا حضرت ابراہیمؑ کی زندگی سے اس کا کوئی جوڑ نہیں۔

تفسیری روایات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو باندھ کر منجنیق میں رکھ کر آگ میں پھینکنے کی جو باتیں آتی ہیں، ان کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ نعوذباللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اقدام پر نادم اور صورت حال سے لرزاں و ترساں تھے اور بھاگ رہے تھے، اس لیے قوم نے انھیں پکڑ کر باندھا اور منجنیق میں رکھ کر آگ میں جھونکا۔ یہ روایات اگر صحیح بھی ہوں تو ان کی اسپرٹ یہ ہے کہ نمرود اور اس کی قوم نے آگ کا اتنا بڑا الاؤ جلایا اور دہکایا تھا کہ اس کے قریب جانا اپنی موت کو دعوت دینے کے مرادف تھا، اس لیے قوم کے افراد مجبور ہوئے کہ منجنیق میں رکھ کر حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینکیں۔

مجھے یہ بدظنی نہیں ہے کہ وحیدالدین خاں صاحب زبان و ادب سے نابلد ہونے کی وجہ سے علامہ اقبال کے شعر کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکے ہوں گے، بلکہ میرے خیال میں انھوں نے اقبال پر کیچڑ اچھالنے کے لیے زبردستی ان کے شعر کو ایک نیا

معنی پہنایا ہے اور پھر اسے قرآن وحدیث اور تاریخ کے خلاف قرار دیا ہے، وحیدالدین خاں صاحب نے نثر میں جو شاعری کی ہے اس کا مطالعہ کرنے والے یہ کیسے یقین کرلیں کہ وہ استعارہ، کنایہ، مجاز اور دوسری ادبی صنعتوں سے ناواقف ہوں۔ موصوف کی ایک شاعرانہ نثر پیش کی جاتی ہے اور اسی پر اسی انداز کی تنقید کی جاتی ہے جیسی تنقید انھوں نے اقبال کے شعر پر کی ہے۔ موصوف دسمبر ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں لکھتے ہیں:

"خدا میرے لیے صرف ایک رسمی عقیدہ نہیں، خدا میری دریافت ہے، خدا کو میں نے دیکھا ہے، خدا کو میں نے چھولیا ہے، خدا میری مثال صحرائے سینا کے اس پہاڑ کی ہے جس پر خدا اُترا اور اس نے اس کی ہستی کے ریزے ریزے کر دیے۔" (ص ۳۶)

وحیدالدین خاں صاحب اگر زبان وادب میں صرف حقیقت کے قائل ہیں، استعارہ، مجاز اور کنایہ اگر ان کے یہاں کوئی چیز نہیں ہے تو اپنی اس تحریر کے بعد وہ اپنے اسلام کی خیر منائیں، انھوں نے خدا کو دیکھنے اور چھونے کی جو بات لکھی ہے اگر ان کے ذہن میں اس کا ظاہری مفہوم ہی ہے اور انھوں نے ان جملوں میں استعارہ، کنایہ اور تلمیح سے کام نہیں لیا ہے تو ان کے گمراہ بلکہ خارج اسلام ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ حیرت کی بات ہے کہ جو شخص نثر میں شاعری کا عادی ہو اور تلمیح واستعارہ کی زبان، اللہ کی ذات وصفات کے بارے میں بھی استعمال کرتا ہو اسے یہ جرأت کس طرح ہوگئی کہ وہ اقبال کے اشعار کا اس طرح آپریشن کرے جیسا مذکورہ بالا اسوۂ ابراہیمی والے اقتباس میں نظر آرہا ہے۔

یہاں وحیدالدین خاں صاحب کی اقبال شناسی کے انھیں چند نمونوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ موصوف نے اقبال کے دوسرے اشعار پر تنقید کی جو کوششیں کی ہیں وہ مذکورہ بالا تنقیدی نمونوں سے زیادہ مختلف نہیں، ایک عامی شخص تو ان تنقیدوں سے غلط فہمی کا شکار ہوسکتا ہے لیکن جس کے پاس علم وبصیرت کا معمولی سرمایہ بھی ہوگا اس پر ان تنقیدوں کا کھوکھلا پن بالکل آشکارا ہے۔

تبلیغی تحریک اور جناب وحید الدین خاں صاحب

غیر منقسم ہندوستان میں حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے تبلیغی جماعت کے نام سے جس عظیم تبلیغی تحریک کا آغاز فرمایا، اس سے ہند و پاک کے تمام مسلمان بخوبی آگاہ ہیں۔ حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی اس تبلیغی تحریک سے جو عظیم فوائد دنیا پر ظاہر ہوئے ان کا احاطہ چند صفحات میں نہیں کیا جا سکتا، یہ تبلیغی تحریک دور حاضر میں بین الاقوامی تحریک بن چکی ہے اور اپنے بانیوں کے اخلاص، کارکنوں کی جدوجہد اور قربانی سے دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ تبلیغی جماعت نے دین کی دعوت و تبلیغ کا ایک خاص طریقہ اپنایا ہے، بعید نہیں کہ بعض اہل علم کو اس سے جزوی اختلاف ہو، لیکن مجموعی طور پر اس طریقے کی کامیابی اور افادیت پوری دنیا پر منکشف ہو چکی ہے۔

ہمیں ان صفحات میں جائزہ لینا ہے کہ تبلیغی جماعت کے بارے میں وحید الدین خاں صاحب کا موقف کیا ہے؟ جناب وحید الدین صاحب جب جماعت اسلامی سے وابستہ تھے اس زمانہ میں انھیں تبلیغی جماعت سے اتفاق نہیں تھا بلکہ وہ جماعت اسلامی کے طریقۂ دعوت اور طریقۂ کار کو سب سے مفید اور ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن جماعت اسلامی سے الگ ہونے کے بعد انھوں نے جو تحریریں لکھی ہیں ان سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ وہ تبلیغی جماعت کے طریقۂ دعوت کو انتہائی مفید سمجھتے ہیں۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران انھوں نے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب رحمہم اللہ کے کے بارے میں جو تاثراتی مضامین "الفرقان" لکھنؤ میں لکھے، اس سے تبلیغی جماعت سے

ان کے انفاق اور گرویدگی کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ لیکن دار العلوم ندوۃ العلماء اور جمعیۃ العلماء ہند کے سروں پر گزرتے ہوئے جب انھوں نے خود ایک مفکر و داعی کی حیثیت اختیار کرلی تو اس زمانہ کی ان کی تحریریں تبلیغی جماعت کے خلاف زہریلے تیر و نشتر پر مشتمل ہیں۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں موصوف نے "الرسالہ" کا اجراء کیا اور ۱۹۷۷ء میں ان کی کتاب "الاسلام" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ "الاسلام" کے ابتدائی صفحات میں موصوف نے مختلف اسلامی تحریکوں اور جماعتوں پر تبصرہ کیا، تبلیغی جماعت کے بارے میں بند بند الفاظ میں وحید الدین خاں صاحب نے جو زہرناک تبصرہ کیا ہے وہ یہ ہے:

"ایمانی تحریک کے کام کا ابتدائی تخیل بعض پسماندہ علاقوں کے ان پڑھ مسلمانوں کے اندر ارتداد کے واقعات کو دیکھ کر وجود میں آیا۔ قدرتی طور پر اس کا نقشۂ کار بھی اسی محدود صورت حال کی مناسبت سے وضع ہوا تھا، مگر بہت جلد وہ نہ صرف اصل کار نبوت بن گیا بلکہ ایک ایسا مقدس کام قرار پاگیا جس کو براہ راست خدا کی طرف سے اس تحریک کے مبلغ اول پر الہام کیا گیا تھا۔ اسلام کی جزوی خدمت میں بلاشبہ یہ لوگ کامیاب رہے۔ مگر یہ کامیابی انھیں اس قیمت پر حاصل ہوئی کہ انھوں نے اسلام کے حقیقی تصور کی جگہ اسلام کے ایک ناقص تصور کو مقدس بنا کر لوگوں کے ذہنوں میں اس طرح بٹھا دیا کہ گہرے اور وسیع تر اسلام کے لیے ان کے اندر کوئی اپیل باقی نہیں رہی۔"

(الاسلام پہلا ایڈیشن، ص ۱۲)

مارچ ۱۹۸۲ء کے "الرسالہ" میں وحید الدین خاں صاحب نے غلبۂ اسلام کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا، اس کے آغاز ہی میں انھوں نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار پر شدید حملہ کیا، اسی طرح بعض دوسری اسلامی جماعتوں کو بھی اپنے تیر و نشتر کا نشانہ بنایا۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

"اسلام کے نشاۃ ثانیہ کا سوال آج ساری دنیا کے مسلمانوں میں، سب سے زیادہ ابھرا ہوا سوال ہے، مگر اس سلسلہ میں ان کی کوششوں کو

دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اسباب سے ان کے اندر عظمت ماضی کو دوبارہ واپس لانے کی ایک مجہول خواہش تو ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ مگر ماضی کی تاریخ کو حال کا واقعہ بنانے کے لیے جو ضروری عمل درکار ہے اس کا واضح شعور انھیں حاصل نہیں ہے۔ ایک طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کو فضائل اسلام کی طلسماتی کہانی سنا کر مسجدوں کی آبادیوں میں اضافہ کر دو اور اس کے بعد ساری دنیا اپنے آپ تمہاری ہو جائے گی۔ مگر یہ حل ایسا ہی ہے جیسے ٹونے ٹوٹکے کے ذریعہ ہمالیہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے کھسکانے کی امید قائم کر لی جائے۔"

(الرسالہ مارچ ۱۹۸۲ء، ص ۳۱)

جناب وحید الدین خاں صاحب صرف تبلیغی جماعت ہی نہیں بلکہ عصر حاضر میں کی جانے والی تمام دعوتی، علمی، فکری کوششوں اور مجاہدانہ سرگرمیوں کو دین کی روح سے محروم تصور کرتے ہیں، اور اپنے یک نکاتی منصوبہ "ماہنامہ 'الرسالہ' اور اپنی تصنیفات کی توسیع واشاعت" کے سوا کسی بھی دینی اور ملی سرگرمی کو مفید اور درست نہیں سمجھتے! چنانچہ اکثر و بیشتر بند بند جملوں میں اور کبھی کبھی عریاں طور پر مختلف دینی تحریکوں اور کوششوں کو اپنی تنقید و تنقیص کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ 'الرسالہ' کے جولائی ۱۹۸۵ء کے شمارہ میں "امت کا زوال" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"دور زوال میں دین اپنی شکل کے اعتبار سے ختم نہیں ہوتا، البتہ وہ اپنی روح کے اعتبار سے ختم ہو جاتا ہے، خدا کی بڑائی کے چرچے کرنا لوگ نہیں جانتے البتہ خدا کے نام پر دوسری چیزوں کے چرچے سے وہ خوب واقف ہو جاتے ہیں، فضائل اعمال اور مسائل اعمال کا زور، تاریخ اسلام اور امت اسلام کے چرچے، اکابر امت اور بزرگان دین کے تذکرے، جشن میلاد اور ایصال ثواب کے ہنگامے سب اسی کی مثالیں ہیں، جب دین کا خدائی پہلو حذف ہو جاتا ہے تو ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق اس کا کوئی ظاہری پہلو لے لیتا ہے اور اسی کے اوپر اپنی زبان وقلم کی ساری قوت

صرف کرنے لگتا ہے، جب کسی امت کا یہ حال ہو جائے تو یہ اس کی علامت ہے کہ وہ سواء السبیل سے ہٹ گئی، اس نے دین کا بڑا حصہ کھو دیا، وہ خدا کی رحمت سے بہت دور چلی گئی۔"

(الرسالہ جولائی ۱۹۸۹ء، ص ۱۸)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے فضائل درود شریف کی پانچویں فصل میں حکایت ۳۶ علامہ سخاویؒ کی کتاب القول البدیع سے نقل کی ہے جس میں درود شریف کی برکت سے مُردوں سے عذاب قبر ختم ہونے کا ایک واقعہ امام حسن بصریؒ کے حوالے سے لکھا ہے۔ وحید الدین خاں صاحب نے اپنی کتاب "دین کیا ہے" میں فضائل درود شریف سے پوری حکایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"اس قسم کی بے شمار روایات گھڑ کر ساری امت میں پھیلا دی گئیں۔ اب اگر کچھ لوگ یہ کریں کہ ان حدیثوں کو جمع کر کے فضائل اعمال کا صحیفہ مرتب کریں اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو دیندار بنانا شروع کر دیں تو ایک عجیب و غریب قسم کا دین وجود میں آ جائے گا لوگ بظاہر ذکر اور درود اور تلاوت اور نماز میں مشغول ہوں گے، مگر یہ مشاغل ان کے سینہ میں خوف خدا سے کانپنے والا قلب نہیں بنائیں گے بلکہ ایک ایسا قلب وجود میں آئے گا جو اپنے کو خدا کی پکڑ سے بالکل مامون سمجھے گا۔ معمولی معمولی باتوں سے جب ہر صبح و شام جنت کے محلات ریزرو ہو رہے ہوں تو آخرت کے خوف سے کانپنے کی کیا ضرورت، حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی "امانی" نے اللہ کے دین کو کھلا مذاق بنا کر رکھ دیا۔ وہ دین جس کا مقصد بندوں میں خشیت اور اندیشہ کی کیفیت پیدا کرنا تھا، وہ صرف قساوت میں اضافہ کا سبب بن گیا۔" (دین کیا ہے، ص ۱۷)

وحید الدین خاں صاحب کے مذکورہ بالا اقتباسات سے اہل نظر بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ تبلیغی تحریک سے نہ صرف یہ کہ متفق نہیں ہیں، بلکہ اسے وہ امت کے لیے اور دینی فکر کے لیے مضر سمجھتے ہیں، لیکن موصوف نے کمال ہنرمندی سے ادھر چند سالوں سے پھر یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ وہ تبلیغی تحریک سے متفق ہیں۔ انھوں نے تبلیغی تحریک کے نام سے مستقل ایک کتاب شائع کر دی، اور اس میں حضرت مولانا الیاس صاحب اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہم اللہ کے

بارے میں اپنے وہ مضامین شامل اشاعت کیے جو دسیوں سال پہلے انھوں نے تحریر کیے تھے۔

وحید الدین خاں صاحب ماشاء اللہ "زمانہ شناسی" کے جوہر سے بخوبی واقف ہیں، نیز ان کے بعض مخلصین نے انھیں مشورہ دیا کہ تبلیغی جماعت کی مخالفت سے خود ان کے کاز کو بہت نقصان پہنچ جائے گا اس لیے انھوں نے تبلیغی جماعت کے وسیع ترین حلقہ کو مانوس اور قریب کرنے کے لیے مختلف انداز سے یہ ظاہر کیا کہ وہ تبلیغی تحریک کے مؤید اور اس سے متفق ہیں۔

جو لوگ وحید الدین خاں صاحب کے افکار و خیالات سے اچھی طرح واقف ہیں انھیں اس حقیقت کا پورا اعتراف ہے کہ حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی تحریک اور وحید الدین خاں صاحب کے نظریات میں کوئی جوڑ نہیں ہے۔ تبلیغی تحریک کے بانی حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ تبلیغ و دعوت کی اہمیت پر پورا زور دینے اور اس کے لیے پوری زندگی اور تمام توانائیاں صرف کرنے کے باوجود دین کے تمام دوسرے شعبوں اور دین کے لیے کی جانے والی ہر صحیح جدوجہد کے قدرداں اور مؤید تھے اسی طرح ان کی تحریک میں ماضی سے بے اعتمادی اور اسلاف امت کی تنقیص کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ پہلو موجود نہیں تھا بلکہ تبلیغی تحریک سے جڑنے کے بعد لوگوں کے اندر اسلافِ امت پر اعتماد میں نمایاں اضافہ ہوتا تھا، اور تبلیغی تحریک کے مخلص کارکن دوسری دینی سرگرمیوں میں تعاون اپنا اہم فریضہ تصور کرتے تھے۔ اس کے برخلاف جناب وحید الدین خاں صاحب نے تبلیغ و دعوت کے نام کو دوسری دینی و ملی سرگرمیوں کی تحقیر و تنقیص کا ذریعہ بنایا، مسلمانوں کی ماضی کی تاریخ اور اسلافِ امت سے اعتماد ختم کرنے کی کوشش کی، اس لیے سچی بات یہ ہے کہ لفظ دعوت میں اشتراک کے علاوہ تبلیغی تحریک کے افکار اور وحید الدین خاں صاحب کے خیالات میں کوئی یکسانیت نہیں ہے۔

معاصر شخصیات اور تحریکات پر ناروا تنقیدیں

جناب وحید الدین خاں صاحب کی تحریریں مسلمانوں کے ماضی سے بے اعتمادی پیدا کرتی ہیں اور عالم اسلام میں کی جانے والی حالیہ دینی کوششوں سے بدگمان بناتی ہیں، موصوف کے خیال میں صدیوں سے دین کے نام پر برپا ہونے والی تحریکات قومی تحریکات ہیں نہ کہ اسلامی تحریکات، دعوت اسلامی کے نام پر عالم اسلام میں جو لوگ کوششیں کر رہے ہیں وہ دعوت کی حقیقت سے بھی آشنا نہیں۔ عالم اسلام میں ان کے سوا کوئی دوسرا ادارہ یا فرد جدید عصری اسلوب میں لٹریچر تیار نہیں کر رہا ہے، موصوف 'الرسالہ' کے جولائی ۱۹۸۰ء کے شمارہ میں لکھتے ہیں:

> "میں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس پورے دور میں مسلمانوں کا دینی طبقہ کوئی ایک بھی ایسی قابل ذکر کتاب وجود میں نہ لا سکا جو جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کے فکری مستوی پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو، شخصیتوں سے عقیدت رکھنے والے کسی خوش فہم دماغ میں ایسی کتابوں کا وجود ہو سکتا ہے۔ مگر حقیقی دنیا میں ایسے لٹریچر کا وجود نہیں۔ اور اگر بالفرض کسی صاحب کو اصرار ہو کہ ایسی کتابیں موجود ہیں تو میں ان سے گزارش کروں گا کہ وہ ایسی صرف ایک کتاب راقم الحروف کے پتہ پر روانہ فرمائیں، اس کے بعد میں انشاء اللہ بتاؤں گا کہ اس کی حقیقت جدید اسلوب اور سائنٹفک طرز تحریر کے اعتبار سے کیا ہے۔ بہ شرطیکہ

یہ کتاب کسی ذمہ دار شخص کی طرف سے ان کی اپنی تحریر کے ساتھ بھیجی گئی ہو۔"

(الرسالہ جولائی ۱۹۸۷ء ص ۲۲، ۲۳)

مذکورہ بالا اعلان کے ذریعہ جناب وحید الدین خاں صاحب نے اردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں اسلامیات کے مصنفین کو یہ شرف بخشا کہ اپنی تصنیفات جناب وحید الدین خاں صاحب کی امتحان گاہ میں بھیج کر "جدید اسلوب" اور "سائنٹفک طرز تحریر" کے اعتبار سے نمبر حاصل کریں لیکن کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ موصوف کی کسوٹی پر اپنی کتاب جنچوائے، پورا دو سال انتظار کرنے کے باوجود جب کوئی کتاب جانچ کے لیے موصوف کی خدمت میں نہیں پہنچی تو جولائی ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں لکھا:

"راقم الحروف نے الرسالہ جولائی ۱۹۸۷ء میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا "دور جدید کی تحریکیں"۔ اس مضمون میں جدید لٹریچر کی اہمیت کو بتاتے ہوئے کہا گیا تھا کہ جدید لٹریچر دور جدید میں اسلام کے احیاء کی بنیادی ضرورت ہے۔ مگر کتابوں کے ان گنت انبار کے باوجود یہ ضرورت ابھی تک غیر تکمیل شدہ حالت میں پڑی ہوئی ہے، حتیٰ کہ لوگوں کے اندر اس کا حقیقی شعور بھی موجود نہیں۔

میں نے مزید لکھا تھا کہ میں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما کوئی ایک بھی ایسی قابل ذکر کتاب وجود میں نہ لا سکے، جو جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کے فکری مستوی پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو۔ اگر بالفرض کسی صاحب کو اصرار ہو کہ ایسی کتابیں لکھی جا چکی ہیں تو میں ان سے گزارش کروں گا کہ وہ ایسی صرف ایک کتاب راقم الحروف کے پتہ پر روانہ فرمائیں۔

اس مضمون کی اشاعت پر اب دو سال کی مدت پوری ہو چکی ہے۔ مگر آج تک کسی مسلم ذمہ دار کی طرف سے ایسی کوئی کتاب میرے پاس نہیں بھیجی گئی۔"

(الرسالہ جولائی ۱۹۸۹ء ص ۱۵، ۱۶)

جناب وحیدالدین خانصاحب نے پورے عالم اسلام خصوصاً ہندوستان کے تمام علماء اور قائدین پر صرف تنقیدیں ہی نہیں کی ہیں بلکہ طعن واستہزاء کے تیر چلائے ہیں۔ تنقید میں عموماً ان کا لہجہ غیر سنجیدہ اور سوقیانہ ہوجاتا ہے، ان کی تحریروں سے اگر تبرا آمیز تنقیدوں کو یکجا کیا جائے تو کئی جلدوں پر مشتمل کتاب تیار ہوسکتی ہے، دو ایک نمونے یہاں پیش کیے جاتے ہیں :

"ہندوستان اور پاکستان میں جو لوگ عفو و درگزر کے اصول ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے وہی لوگ پٹرو ڈالر کے ملکوں میں جاکر مبالغہ کی حد تک عفو و درگزر کے اصول کی پابندی کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی نظر میں قرآن کے حکم کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اہمیت پٹرو ڈالر کے حکم کی ہے، اس سے زیادہ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود بھی یہ لوگ اپنے آپ کو قرآن کا مومن کامل سمجھتے ہیں۔"

(الرسالہ اگست ۱۹۸۰ء ص ۸)

یہ اللہ کا فضل ہے کہ میں غالباً ہندوستان کا اکیلا شخص ہوں جو ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہر جگہ ایک ہی بات کہتا ہے، ورنہ میری معلومات کے مطابق ہندوستان کے تمام علماء اور قائدین اس معاملہ میں دورجیبی ہو رہے ہیں، وہ ہندوستان میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر تصادم اور ایجی ٹیشن کی بات کرتے ہیں اور جیسے ہی وہ کسی مسلم ملک کے ہوائی اڈہ پر اترتے ہیں ان کی زبان بدل جاتی ہے۔ لیکن لوگ باہر کے مسلم ملکوں میں جو بات کہتے ہیں وہی میں دونوں جگہ کہتا ہوں۔ البتہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ باہر کے مسلم ملکوں کے لیے ان کا ٹیپ دوسرا ہے اور ہندوستان کے لیے دوسرا۔"

(الرسالہ مارچ ۱۹۸۹ء ص ۲۷)

موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کا اولین اور اہم ترین کام یہ تھا

کہ وہ جدید علوم کو پڑھیں، وقت کی زبانوں کو سیکھیں۔ آج کے
طریقۂ استدلال اور اسلوب تحریر میں مہارت پیدا کریں اور اس کے
بعد اسلام کی ابدی تعلیمات کو مؤثر اور طاقتور انداز میں پیش کریں تاکہ
آج کا انسان اور جدید مسلم نسل اس کو پڑھے اور اس کے ذریعہ سے
اپنے کھوئے ہوئے عقیدہ کو دوبارہ حاصل کرے، مگر جدید اسلوب
میں طاقتور لٹریچر وجود میں لانا تو درکنار موجودہ مسلم رہنما قرآن کا ایک
صحیح انگریزی ترجمہ بھی تیار کر کے شائع نہ کر سکے، ایسی حالت میں
مسلم رہنماؤں کا سلمان رشدی کے خلاف ہنگامہ کرنا حقیقتاً خود اپنی
نالائقی پر پردہ ڈالنے کے ہم معنی ہے۔"

(الرسالہ جولائی ۱۹۸۹ء ص ۱۲)

دعوتِ دین اور وحید الدین خاں صاحب

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت و تبلیغ مسلمانوں کی سب سے اہم ذمہ داری ہے۔ یہ وہ کارِ نبوت ہے جو ختمِ رسالت کے بعد امت مسلمہ کے ذمہ کر دیا گیا، مسلمان اس کام میں جس قدر اخلاص، توجہ اور دانائی کے ساتھ لگیں گے انھیں اسی قدر آخرت میں سرخروئی اور دنیا میں کامرانی حاصل ہوگی۔ جناب وحید الدین خاں صاحب کی تحریروں میں غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانے پر بہت زور دیا گیا ہے اور اس اہم کام کے سلسلے میں مسلمانوں کی طرف سے ہونے والی کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے غیر مسلموں میں فریضۂ دعوت کی ادائیگی کے سلسلے میں بڑی کوتاہی کی ہے اور اب بھی کوتاہی کر رہے ہیں۔ اگر وحید الدین خاں صاحب غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں تصنیفی اور عملی سرگرمیوں پر اکتفا کرتے تو وہ ہر طرح تائید و تعاون کے مستحق ہوتے لیکن ان کی سنگین غلطی یہ ہے کہ انھوں نے غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت کی اہمیت کی آڑ میں دین کے مختلف شعبوں کے سلسلہ میں کی جانے والی کوششوں اور خدمات کی اہمیت کم کرنے بلکہ ان کے انکار و استخفاف کا راستہ اپنایا، ان کی تحریریں ایسے مواد سے بھری پڑی ہیں جن میں نہ صرف عہد حاضر میں کی جانے والی اسلامی کوششوں اور تحریکات کا مذاق اڑایا گیا ہے اور ان کوششوں کو جرم قرار دیا گیا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر آخری چند صدیوں کے مصلحین و مجددین اور شہداء کے روشن کارناموں اور قربانیوں کا استہزاء و استخفاف کیا گیا ہے، موصوف نے غیر مسلموں میں تبلیغ

دعوت کو عملی شکل دینے اور اسے مثبت طریقہ پر انجام دینے کے بجائے شاید یہ ضروری سمجھا کہ اسلام کے نام پر پوری دنیا میں کی جانے والی کوششوں کی پہلے نفی کر دی جائے اور ڈائنا میٹ لگا کر ان تمام کوششوں کو مسمار کرنے کے بعد اس کے ملبہ پر دعوتِ اسلام کا شاندار محل تعمیر کیا جائے۔ جناب وحید الدین خاں صاحب نے تمام اسلامی تحریکات اور اسلامی کوششوں پر ردعمل کی نفسیات کا خوب خوب الزام لگایا ہے اور صبر و اعراض کی بار بار تلقین فرمائی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود ان کا سارا کاروبار ردعمل کی نفسیات اور منفی فکر پر قائم ہے ان کی تحریروں سے منفی تحریروں کو اگر الگ کر دیا جائے تو مثبت تحریروں کا حجم انتہائی مختصر رہ جائے گا۔

اس بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ خدمتِ اسلام اور نصرتِ دین کے کاموں میں غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت و تبلیغ خاص اہمیت رکھتی ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے ذمہ جو کام سونپا وہ اسی کے اندر محدود نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ساتھ دوسرے بہت سے دینی کام انجام دیے، آپ نے مسلمانوں میں اسلامی تعلیمات و احکام کی نشر و اشاعت مسلم معاشرہ سے منکرات کا ازالہ اور نیکیوں کی ترویج، مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کی تنظیم و ترتیب، اسلام کے قوانین کا اجراء، غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی کے بارے میں امت کی رہنمائی فرمائی، بنیادی خطوط کی نشان دہی کی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہا دین کے تمام شعبوں میں بھرپور جدوجہد فرمائی، اور ہر شعبۂ زندگی کے لیے بہترین عملی نمونے چھوڑے اسی لیے آپ کی حیاتِ طیبہ تمام لوگوں کے لیے اور ہر شعبۂ زندگی کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

"لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اُسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللّٰہ والیوم الآخر وذکر اللّٰہ کثیرًا" (احزاب آیت ۲۱)

قرآن و سنت نے کچھ فرائض ہر مسلمان پر فرداً فرداً عائد کیے ہیں، مثلاً نماز قائم کرنا، روزے رکھنا، مالکِ نصاب ہونے کی صورت میں زکوٰۃ دینا، استطاعت رکھنے کے وقت

حج کرنا، نکاح وطلاق، میراث، خرید و فروخت وغیرہ کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا، لیکن کچھ ذمہ داریاں اجتماعی نوعیت کی ہیں جو فرداً فرداً ہر شخص سے مطلوب نہیں ہوتیں، بلکہ مسلم معاشرہ سے بہ حیثیت مجموعی مطلوب ہوتی ہیں یعنی مسلم سماج میں ایسے کچھ لوگوں کا ہونا ضروری ہے جو اس ذمہ داری کو بہ حُسن و خوبی انجام دیں، اگر وہ ذمہ داری انجام نہیں دی گئی تو پورا مسلم سماج گنہگار ہوتا ہے اور اگر کچھ لوگوں نے وہ ذمہ داری پوری کی تو معاشرہ کا ہر ہر فرد اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے، فقہائے اسلام پہلی قسم کی ذمہ داریوں کو فرض عین یا واجب علی العین کہتے ہیں، اور دوسری قسم کی ذمہ داریوں کو فرض کفایہ یا واجب کفائی کہتے ہیں۔ فرض کفایہ کے بہت سے افراد ہیں جن میں سے بعض دائمی ہیں اور بعض وقتی، غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت کا عمل بھی فرض کفایہ ہے کوئی شخص بھی اس کے فرض عین ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

دعوت کا فرض کفایہ ہونا صراحۃً قرآن کریم میں مذکور ہے ارشاد ربانی ہے:

"اور ضرور ہے کہ تم میں ایک گروہ ہو جو نیکی کی طرف بلائے اور بھلائی کا حکم دے
اور برائی سے روکے اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے۔"

(سورہ آل عمران آیت ۱۰۴)

جمہور مفسرین نے دعوت الی الخیر کا مصداق یا تو غیر مسلموں میں دعوت کو قرار دیا ہے یا دعوت الی الخیر کو عام قرار دے کر غیر مسلموں میں دعوتِ اسلام کو اس کا اہم ترین فرد بتایا ہے۔ مفسرین کی ایک جماعت نے معروف اور منکر کے مفہوم میں توحید و شرک کو شامل کیا ہے۔ اس آیت کی مکمل تفسیر کے لیے تفسیر کی اہم کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

جس طرح کسی فرض کفایہ کی ادائیگی مکمل طور پر ترک کر دینا گناہ کی بات ہے اسی طرح کسی ایک فرض کفایہ میں تمام افراد کا اس طرح مشغول ہو جانا کہ دوسرے فروض کفایہ متروک ہو جائیں، ان کی انجام دہی نہ ہو یہ بھی گناہ کی بات ہے، فرائض کفایہ کی ادائیگی کے بارے میں تقسیم کار کے اصول پر عمل کرنا از حد ضروری ہے، اس لیے کہ

ہر فرد میں نہ تو ہر فرض کفایہ کے ادا کرنے کی اہلیت ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے وقت اور وسائل میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ بیک وقت تمام فرائض کفایہ کی ادائیگی کرسکے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ عہد رسالت ہی سے فرائض کفایہ کے بارے میں تقسیم کار کے اصولوں پر عمل ہوا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ صحابہ کرامؓ کو تعلیم کتاب و حکمت کے کام پر لگایا، کچھ کو غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت کی ذمہ داری سونپی اور کچھ کو غزوہ و جہاد کے لیے مقرر فرمایا۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ خاص حالات کی بنا پر کسی فرض کفایہ کی ادائیگی کی اہمیت زیادہ بڑھ جائے اور وقتی طور پر امت کے نسبتاً زائد افراد کو اس میں لگا دیا جائے، یہ سب کچھ ضرورت، حالات اور وقت کے تقاضوں پر منحصر ہے۔

غیر مسلموں میں اسلام کا پیغام پیش کرنا جس طرح دعوت و تبلیغ ہے اسی طرح مسلمانوں میں اسلامی عقائد، اعمال، اخلاق کی نشر و اشاعت اور اصلاحی کوششیں بھی تبلیغ دین ہیں۔ قرآن پاک کی آیت "یاأیہا الرسول بلّغ ما أنزل إلیك من ربّك وإن لم تفعل فما بلّغت رسالتہ واللّٰہ یعصمك من الناس" کی تفسیر میں تمام مفسرین نے لکھا ہے کہ ما أنزل إلیك (جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے) میں جس طرح اسلام کے عقائد آتے ہیں اسی طرح اسلام کے احکام، اخلاق وغیرہ بھی اس میں داخل ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پورا دین پہنچانے کے مکلف تھے اور یہی ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت مسلمہ کے کندھے پر ڈالی گئی ہے، لہٰذا جو شخص دین کے کسی حصہ کی نشر و اشاعت، تعلیم و تعلم میں لگا ہوا ہے وہ درحقیقت کسی نہ کسی شکل میں تبلیغ دین کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بلّغوا عنی ولو آیۃ۔ (بخاری)

اس حدیث کی رو سے تعلیمات نبوی میں سے کسی ایک تعلیم کو بھی دوسروں تک پہنچانا تبلیغ ہے، اس لیے اگر منفی جذبات سے بلند ہو کر حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عہد حاضر میں جو لوگ دین کی جس نوع کی بھی خدمت انجام

دے رہے ہیں وہ بہت سعید اور قابل مبارک باد ہیں۔

دعوت وتبلیغ کی آڑ میں :

غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ واشاعت مسلمانوں کی اہم ترین ذمہ داری ہے اور اس ذمہ داری کی ادائیگی میں ہم مسلمان بڑی کوتاہی کر رہے ہیں، اگر کوئی شخص مسلمانوں کو اس فریضہ کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی پر متنبہ کرتا اور ڈراتا ہے تو وہ ہر طرح قابل ستائش اور قابل تعاون ہے۔ لیکن کسی فرد یا کسی قوم پر دعوتی فریضہ عائد ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دوسری دینی، اجتماعی، معاشی اور سیاسی ذمہ داریاں اس پر عائد نہیں ہیں اور وہ قوم اپنی تمام دوسری ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو چکی ہے۔ دعوتی ذمہ داری عائد ہونے کے ساتھ داعی قوم پر بہت ساری معاشی، دینی، اخلاقی اور سیاسی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں جن سے نہ تو چشم پوشی کی جاسکتی ہے نہ فرار اختیار کیا جاسکتا ہے۔ مسلمانان ہند پر دعوت اسلام کے علاوہ ہندوستان کے مخصوص حالات میں بہت سی دوسری ذمہ داریاں بھی عائد ہیں مثلاً مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ، دینی تعلیم کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی شخص غیر مسلموں میں تبلیغ ودعوت کی اہمیت کی آڑ میں دوسری دینی وملی ذمہ داریوں کا انکار واستخفاف کرے اور مسلمانوں کو ان سے دستکش ہونے کا مشورہ دے تو وہ مسلمانوں کا نادان دوست ہے یا دوست نما دشمن۔

جناب وحیدالدین خاں صاحب بھی اب سے ۲۴، ۲۵ سال پہلے مسلمانان ہند کے ملی واجتماعی مسائل کا شعور رکھتے تھے اور ہندوستان کے مخصوص حالات میں مشترک ملی وقومی مسائل کے لیے مسلم جماعتوں اور تنظیموں کے اتحاد کے داعی تھے۔ ماہ نومبر ۱۹۶۳ء کے 'الفرقان' لکھنؤ کا نگاہ اولیں موصوف ہی کے قلم سے ہے، جس میں انھوں نے پوری قوت کے ساتھ مشترک ملی مسائل کے لیے اتحاد کی دعوت دی ہے۔ لکھتے ہیں :

"یہ اتحاد اور اجتماعیت موجودہ حالات میں مسلمانوں کی سب سے پہلی

ضرورت ہے۔ اس کے بغیر حالات کے سدھار کے لیے کسی بھی اسکیم کا آغاز نہیں کیا جاسکتا۔ اصلاح حال کی ہر تجویز سب سے پہلے یہ چاہتی ہے کہ مسلمان ایک نقطہ پر مجتمع ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ ذرائع و وسائل اس کے لیے مہیا ہو سکیں، زیادہ سے زیادہ حمایت کے ساتھ اس کو موثر بنایا جاسکے، جب وہ دنیا کے سامنے آئے تو لوگوں کو زیادہ سے زیادہ وقیع اور باوزن معلوم ہو ۔۔۔۔۔۔۔

اس وقت حالات نے مسلمانوں کے لیے چند ایسے مسائل پیدا کر دیے ہیں جو کسی ایک فرد یا فرقہ کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ مجموعی طور پر پوری امت کا مسئلہ ہے۔ مثلاً مخصوص اسباب نے اس ملک کے مسلمانوں کے لیے معاشیات کے دروازے تنگ کر دیے ہیں اور اب ہمیں سوچنا ہے کہ اس قومی پیمانے کی مصیبت کے لیے کیا تدابیر اختیار کریں۔ تعصب کی آندھی نے فسادات کا ایک طویل سلسلہ شروع کر رکھا ہے، جس کا شکار فرقہ اور گروہ کے امتیاز کے بغیر ہر مسلمان ہو رہا ہے۔ ملک کا پریس ہمارے ساتھ نہ صرف بائی کاٹ کر رہا ہے بلکہ مخالف خبریں نشر کرتا ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں ایک طاقت ور پریس کی ضرورت ہے۔ انتخابات میں مسلم ووٹروں کے بٹ جانے اور مسلم قائدین کے منتشر ہو جانے کی وجہ سے ہم ان سیاسی امکانات میں سے اپنا حصہ بہت کم وصول کر پاتے ہیں، جو ملک کے سیاسی ڈھانچے کے تحت ہمارے لیے ممکن ہیں۔ ضرورت ہے کہ سیاسی محاذ پر ہم اپنی پوری طاقت کو صحیح طور لگائیں تاکہ قوم کو اس کا پورا سیاسی حق مل سکے۔ اسی طرح اور بہت سے کام ہیں جو قومی اور ملی سطح پر درکار ہیں اور باہمی ٹکراؤ کے بغیر ساری امت جس میں مشترک طور پر حصہ لے سکتی ہے اور یکساں فوائد حاصل کر سکتی ہے۔" (ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، نومبر ۱۹۶۲ء، ص ۵-۶)

یہ وحیدالدین خاں صاحب کی اس وقت کی تحریر ہے جب وہ "داعی مطلق" کے مقام پر فائز نہیں ہوئے تھے اور ملتِ اسلامیہ کا درد وغم ملت کے ایک حساس اور درد مند کی طرح محسوس کرتے تھے۔ اس وقت وہ "قوم وملت" کا لفظ بولنا جائز بلکہ مستحسن سمجھتے تھے اس بات کے داعی تھے کہ "متحدہ سیاسی محاذ" تشکیل دے کر قوم کو اس کا پورا "سیاسی حق" دلایا جائے۔ "فسادات کے طویل سلسلے" میں "تعصب کی آندھی" محسوس کرتے تھے، قومی پریس سے انھیں بائیکاٹ بلکہ مخالف پروپگنڈے کی شکایت تھی لیکن زمانہ کی تغیر پذیری کے ساتھ اب موصوف کے خیالات بالکل تبدیل ہو چکے ہیں، قومی پریس سے ان کا "گلہ" ختم ہوا، اب تو قومی پریس ان پر بہت مہربان ہے، جلی سرخیوں کے ساتھ موصوف کے خیالات قومی اخبار و رسائل میں شائع ہوتے ہیں، ریڈیو اور ٹی وی کے دروازے بھی کھلے ہوئے ہیں، اب انھیں ساری شکایت مسلم قیادت اور مسلم پریس سے ہے۔ برادرانِ وطن کبھی متعصب رہے ہوں گے اب تو ہندوستان کے تمام غیر مسلم "صلح وآشتی کا پیکر ہیں" اب فسادات کے تنہا ذمہ دار مسلمان ہیں، وہی فسادات میں پہل کرتے ہیں، انھیں کی جذباتیت سے فسادات کی آگ بھڑکتی ہے:

"ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں یہ بات تقریباً ثابت شدہ ہے کہ اس کا آغاز ہمیشہ کسی مسلمان کی اشتعال انگیز کارروائی سے ہوتا ہے۔ یہ معاملہ ابتداءً ایک ہندو اور ایک مسلمان کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کے بعد خود مسلمانوں ہی کے پیدا کردہ حالات کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ یہ انفرادی واقعہ بہت جلد قومی واقعہ بن جاتا ہے۔" (الرسالہ ستمبر ۱۹۸۰ء ص ۱۳)

موصوف اب "متحدہ محاذ" کے لیے کوشش کیا کرتے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ "دعوت" کے سوا قوم اور ملت جیسے ہر لفظ سے انھیں چڑھ ہو گئی ہے۔ "اشداء علی المؤمنین" "رحماء مع الکفار" کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ترقی کے راکٹ پر سوار ہو کر موصوف نے فضائے آسمانی کے اتنے مراحل طے کر لیے ہیں کہ مسلمانوں جیسی پسماندہ اور پامال مخلوق انھیں چیونٹی سے زیادہ وقیع نظر نہیں آتی۔

جہادِ افغانستان

وحید الدین خاں صاحب کی نظر میں

افغانستان کے مسلمان دین کے بارے میں بڑے حساس اور با حمیت رہے ہیں، شجاعت و سخاوت ان کی قومی خصوصیات ہیں، برطانیہ نے اپنے دورِ عروج میں افغانستان پر اپنا سامراج قائم کرنے کی انتھک کوشش کی لیکن افغانیوں کی دینی حمیت، فطری شجاعت اور خطر پسندی کی وجہ سے برطانیہ کو ہر بار ناکامی ہوئی۔ روس میں کمیونسٹوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد کمیونزم نے دنیا کو تہ و بالا کر دیا، روس کی کمیونسٹ حکومت نے ایک طرف مشرقی یورپ کی جانب پیش قدمی کی، دوسری طرف اپنے پڑوس کی مسلم ریاستوں کو ہڑپ کر کے وہاں سے مسلمانوں اور اسلام کو فنا کرنے کی مسلسل کوشش کی۔ بخارا و سمرقند اور تاشقند جیسے زرخیز اسلامی شہروں اور علاقوں کے مسلم باشندوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے، انھیں جلاوطن کر کے سائبیریا کے صحراؤں میں منتقل کر دیا، اور جنگی پیمانے پر اسلامی آثار اور مسلم تہذیب کے اثرات مٹانے کی جدوجہد کی۔

افغانستان پر روس کی حریصانہ نظریں بہت زمانے سے تھیں، روس نے افغانستان کے بعض حکمرانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وہاں اپنے اثرات پیدا کرنے شروع کر دیئے، سیاست و حکومت سے وابستہ کچھ لوگوں کو خرید لیا اور کمیونسٹ پارٹی افغانستان میں قائم ہو گئی جو خالصۃً روس کے اشارے پر کام کرتی رہی۔ ۱۹۷۹ء میں روس نے پوری بے حیائی کے ساتھ فوجی کارروائی کر کے اپنا تسلط قائم کر لیا، اور ظلم و بربریت

کے تمام ریکارڈ توڑ دیے، دنیا کو یقین ہوگیا کہ روس کا سرخ ریچھ افغانستان کو بھی ہضم کر گیا۔

افغانستان کے مسلمانوں میں اسلامی غیرت وحمیت اور ایمانی شجاعت کا وافر حصہ موجود تھا، انھوں نے بے سروسامانی کے باوجود روس کے خلاف علم جہاد بلند کیا، الحادی طاقتوں کی غلامی اور محکومی پر راضی ہونے کے بجائے جہاد و سرفروشی کا راستہ اختیار کیا، افغانیوں کو راہِ جہاد میں دشوار تر مراحل سے گزرنا پڑا، بے پناہ جانی و مالی قربانیاں دینی پڑیں، اللہ تعالیٰ نے مجاہدین افغانستان کو فتح و نصرت سے ہمکنار کیا، مجاہدین نے روسی فوجوں کو پوری ذلت کے ساتھ سرزمین افغانستان سے نکلنے پر مجبور کر دیا، روس کو زبردست جانی، مالی اور سیاسی نقصانات اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔

افغانستان سے روس کی پوری ذلت اور ہزیمت کے ساتھ واپسی اس کے زوال کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی، روس کا آہنی شکنجہ تمام کیمونسٹ ممالک سے ڈھیلا پڑ گیا، دنیا نے دیکھ لیا کہ روس تمام عسکری اور سائنسی ترقیات کے باوجود ناقابلِ تسخیر نہیں ہے، بیسویں صدی میں بھی انسانی نگاہوں نے مشاہدہ کر لیا کہ ایمان اور جذبۂ جہاد ہر مادی اور عسکری طاقت سے بڑی طاقت ہے، جہاد افغانستان سے عالم اسلام میں جذبۂ جہاد و سرفروشی کی لہر دوڑ گئی، اور اہل ایمان کے دلوں میں امیدوں کے چراغ روشن ہوگئے، جہاد افغانستان مجاہدین اسلام کی تربیت گاہ بن گیا، روس کے زیر تسلط مسلم صوبوں میں اسلامی بیداری کا آغاز ہوا۔

پوری دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردی اور دعائیں مجاہدین افغانستان کے ساتھ ہیں، مجاہدین کابل میں قائم روس کی کٹھ پتلی حکومت نجیب سرکار سے کسی طرح مصالحت پر آمادہ نہیں ہیں اور نجیب حکومت جو روسی سامراج کی ذلت آمیز یادگار ہے اسے فنا کرنے سے کم کسی فامولے پر راضی نہیں ہیں۔

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے پوری "دینی حمیت وغیرت" کا مظاہرہ کرتے ہوئے کابل کی کیمونسٹ حکومت کی دعوت پر کابل میں منعقد ہونے والی ایک

کانفرنس میں شرکت کی اور "الرسالہ" کے دو شماروں میں سفرنامہ شائع کیا، جس میں جہاد افغانستان کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا جس کی امید کسی باحمیت مومن سے نہیں کی جا سکتی، ذیل میں ان کے سفرنامہ سے چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں:

"وہ لوگ جن کو افغانی مجاہدین کہا جاتا ہے وہ ایک درجن تنظیموں میں بٹے ہوئے ہیں، تاہم ایک چیز سب میں مشترک ہے، وہ یہ کہ ان کی اکثریت تعلیم یافتہ نہیں، غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے افغانی مجاہدین ایک بات کو جانتے ہیں کہ ان کی شجاعت نے روسی فوجوں کو واپسی پر مجبور کیا ہے، مگر اس تاریخی حقیقت سے سرے سے ناواقف ہیں کہ روسی فوجوں کی افغانستان سے واپسی دراصل ایک دور کا خاتمہ ہے، یہ ویسا ہی معاملہ ہے جیسے مہاتما گاندھی کی تحریک آزادی نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکلنے پر مجبور کیا، مگر انگریزوں کا یہاں سے نکلنا اسی کے ساتھ اس بات کا اعلان بھی تھا کہ اب قدیم طرز کا نوآبادیاتی دور ختم ہو چکا ہے، اب وہ دوبارہ واپس آنے والا نہیں ـــ مجاہدین میں اگر کچھ لوگ ہوتے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے اور وقت کی رفتار کو گہرائی کے ساتھ سمجھتے تو وہ جان لیتے کہ روسی فوجوں کی واپسی سادہ طور پر صرف واپسی نہیں ہے، یہ اس دور کا خاتمہ ہے جس میں روسی طرز کا تدخل ممکن ہوتا تھا، اگر افغانی مجاہدین اس راز کو جانتے تو ان کا طرز کار بالکل بدل جاتا، ہتھیار کی طاقت سے انھوں نے خارجی حریف کو زیر کیا تھا، امن کی طاقت سے وہ داخلی حریف پر قابو پا لیتے......"

ٹائم (۲۲ اکتوبر ۱۹۸۹ء) نے لکھا ہے کہ افغانستان میں اس وقت ۳۵ سالہ احمد شاہ مسعود کو "شیر پنج شیر" کی حیثیت حاصل ہے، اس افغانی نوجوان نے کابل کی پالی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کی ہے، پچھلے تقریباً دس سال سے وہ مجاہدین کا استاد بنا ہوا ہے، اس کا تعلق افغانستان کی اسلامی

جماعت سے ہے۔ ٹائم نے اس سلسلہ میں بتایا ہے کہ نو سال کی جنگ کے بعد افغانستان کی وادی خالی بستیوں اور برباد مکانات کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ افغانستان کی موجودہ حکومت جنگ بندی یا مخلوط حکومت تک پر راضی نظر آتی ہے۔ صدر نجیب اللہ جو اس وقت مایوسی کا شکار ہیں کیونکہ ان کا حامی روس واپس جارہا ہے، حال میں انھوں نے مسعود کو یہ پیش کش کی کہ امن قائم کرنے کے بدلے وہ حکومت میں کوئی بڑا عہدہ قبول کرلیں۔

ٹائم کے بیان کے مطابق احمد شاہ مسعود نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ وہ موجودہ حکومت کی بے دخلی سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہیں۔ میرے نزدیک یہ عین وہی غلطی ہے جو اس سے پہلے سید قطب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کرچکے ہیں۔ سید قطب کو جمال عبدالناصر نے مصر کی وزارت تعلیم کی پیش کش کی مگر سید قطب کو اس سے کم کوئی چیز قبول نہ تھی کہ جمال عبدالناصر کرسیٔ اقتدار سے ہٹ جائیں۔ اسی طرح سید ابوالاعلیٰ مودودی کو محمد ایوب خان نے یہ پیش کش کی کہ حکومت انھیں اعلیٰ ترین وسائل دے گی، وہ ایک انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی قائم کریں اور اس میں اپنی صلاحیتیں لگادیں۔ مگر دوبارہ سید ابوالاعلیٰ مودودی اس سے کم کسی بات پر راضی نہ ہوسکے کہ محمد ایوب خاں کرسیٔ اقتدار سے ہٹ جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں رہنما مصر اور پاکستان میں ممکن تعمیری کام نہ کرسکے، اور صرف بربادی کی تاریخ چھوڑ کر دنیا سے چلے گئے۔ افغانی مجاہدین نے اگر اپنے رُخ میں تبدیلی پیدا نہ کی تو یقینی ہے کہ وہ بھی اس دنیا سے اس حال میں جائیں گے کہ ان کے پیچھے ایک برباد شدہ افغانستان کے سوا کوئی اور چیز موجود نہ ہوگی اور اس دنیا سے بہرحال ہر ایک کو جانا ہے۔۔۔۔۔'

افغانستان کی ریاست بے حد مخدوش ہے، روس اگرچہ اپنی فوجوں کو واپس بلا رہا ہے تاہم وہ چاہتا ہے کہ افغانستان میں ایسی حکومت قائم ہو

جو کیمونسٹ نواز ہو یا کم از کم اینٹی کیمونسٹ نہ ہو۔ دوسری طرف "مجاہدین" کا کہنا ہے کہ وہ افغانستان میں سویت روس کے کسی بھی اثر و نفوذ کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ امریکہ اور پاکستان اس مطالبہ کی تائید کر رہے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے "مجاہدین" کی جو حکومت ہوگی وہ امریکہ نواز یا پاکستان نواز ہوگی ــــ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ "مجاہدین" کی بندوقوں کا رُخ جو پہلے روسیوں کی طرف تھا اب وہ حکمراں افغان گروہ کی طرف ہو گیا ہے، کیونکہ ان کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ روسی پالیسی کی حمایت کر رہے ہیں ــ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ کا حل خوش تدبیری اور ایڈجسٹمنٹ ہے، مگر بظاہر ایسا ہونا ناممکن ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پچھلے دس سال سے مجاہدین کے غیر مصالحانہ تشدد کو سارے عالم اسلام میں جس طرح گلوریفائی کیا گیا ہے اور جس طرح ان کو ہیرو بنایا گیا ہے اس کے بعد ایڈجسٹمنٹ کی پالیسی ان کے لیے ہیرو کے مقام سے اُترنے کے ہم معنی ہوگی، اور انسان کے لیے بلاشبہ یہ مشکل ترین کام ہے، مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر بالفرض روسی اثر و نفوذ افغانستان سے ختم ہو جائے تب بھی اصل مسئلہ ختم ہونے والا نہیں، کیونکہ عدم برداشت کا مزاج جو اس وقت روسیوں یا روس نوازوں کے خلاف کام کر رہا ہے وہی خود اپنوں کے خلاف کام کرنے لگے گا، اس دنیا میں کامیابی کا راز برداشت ہے، دوسروں کے مقابلہ میں اور خود اپنوں کے مقابلہ میں بھی۔۔۔۔۔!

مجھے یہ جاننے کی خواہش تھی کہ وہ لوگ جن کو باہر کی دنیا میں "مجاہدین" کہا جاتا ہے ان کو افغانستان کے لوگ کیا کہتے ہیں، اس مقصد کے لیے میں نے ایک نوجوان (۲۴ سال) کو لیا، ان سے میں نے ایسے موقع پر گفتگو کی جب کہ وہاں کوئی ہماری گفتگو سننے والا نہ تھا، میرے سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ یہاں ان کو مجاہدین کوئی نہیں کہتا، البتہ یہاں کے لوگوں میں ان کے لیے

تین الفاظ رائج ہیں:

اپوزیشن، افرا طیون، اشرار......

روانگی سے پہلے مجھے دہلی میں سری نگر کا ایک ہفتہ وار اخبار (۷ اکتوبر ۱۹۸۵ء) ملا۔ اس میں افغانستان سے متعلق ایک مضمون تھا۔ نصف صفحہ اصل مضمون تھا، اور بقیہ نصف میں حسب ذیل سرخی جلی حرفوں میں درج تھی:

"اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے افغان مجاہدین کی
جدو جہد فیصلہ کن مرحلوں میں"

اس میں افغان نوجوانوں کی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں کچھ افغانی نوجوان ایک تختی لٹکائے ہوئے تھے جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا: "قرآن زندہ باد"

خدا کو عرب میں "اسلامی حکومت" قائم کرنے کے لیے ڈھائی ہزار سالہ منصوبہ بنانا پڑا، مگر موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے تمام اصاغر و اکابر ڈھائی دن سے بھی کم عرصہ میں اسلامی حکومت کا قلعہ کھڑا کرنے کا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ موجودہ مسلمان سیاست کے معاملہ میں اس قدر مضحکہ خیز حد تک جذباتی کیوں ہیں؟ ـــ اس کی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ موجودہ لیڈروں نے تقریباً بلا استثناء یہ کیا کہ مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لیے ایک یا دوسری شکل میں سیاسی لوریاں سنائیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی حساسیت سیاست کے معاملہ میں ضرورت سے زیادہ جاگ اٹھی۔

(الرسالہ مارچ ۱۹۸۶ء، ص ۲۱ تا ۲۲)

ملی تشخص کی تحریک اور وحید الدین خاں صاحب

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد انگریزوں نے ہندوستان پر حکمرانی شروع کی تو انھوں نے اسلامی تہذیب و ثقافت کا ہر نقش ہندوستان سے مٹا دینا چاہا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے بڑی برق رفتاری کے ساتھ عدلیہ کا پورا ڈھانچہ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ۱۸۶۲ء میں اسلامی قانون تعزیرات منسوخ کر کے تعزیرات ہند کا نفاذ ہوا۔ ۱۸۶۴ء میں مسلمان قاضیوں کی تقرری موقوف کر دی، رفتہ رفتہ سارا عدالتی نظام غیر اسلامی خطوط پر استوار کیا گیا۔

برطانوی ہند کی مرکزی مجلس قانون ساز کے مسلم اراکین کی تحریک اور کوششوں سے ۱۹۳۷ء میں شریعت ایپلی کیشن ایکٹ منظور ہوا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ احوال شخصیہ (نکاح، طلاق، خلع، نفقہ، مہر وغیرہ) کے مقدمات میں اگر مقدمہ کے فریقین مسلمان ہوں تو عدالت اس بات کی پابند ہوگی کہ اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ کرے۔ شریعت ایکٹ کے ذریعہ اسلامی شریعت کے ایک حصہ کو تحفظ حاصل ہوا، جسے مسلم پرسنل لا کا نام دیا جاتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے مسلم پرسنل لا کے خلاف بڑے زور و شور سے فضا ہموار کی جانے لگی، حکومت کے ایوانوں میں بھی مسلم پرسنل لا کو ختم کرنے کے لیے خطرناک منصوبہ بندی ہونے لگی۔ حالات کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے تمام مسلم قائدین اور جماعتوں نے مسلکی اور گروہی اختلافات

سے بلند ہو کر مسلم پرسنل لا بورڈ قائم کیا۔ بورڈ نے آل انڈیا پیمانے پر مسلمانوں کو منظم کر کے مسلم پرسنل لا کے خلاف اٹھنے والے طوفانوں پر روک لگائی، مختلف راہوں سے مسلم پرسنل لا میں ہونے والی مداخلت کا نوٹس لیا۔

۱۹۸۵ء میں شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کی آئینی بنچ کے فیصلہ نے مسلم پرسنل لا کے خلاف نیا چیلنج پیدا کر دیا، اس فیصلہ میں مطلقہ عورت کا نفقہ طلاق دینے والے شوہر کے ذمہ مطلقہ کی وفات یا نکاح تک لازم کیا گیا، بڑے صریح اور تیکھے انداز میں حکومت کو یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا مشورہ دیا گیا اور حقوق مطلقہ سے متعلق چند قرآنی آیات کی من مانی تشریح کی گئی۔ مسلم پرسنل لا بورڈ نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی اور دیگر اکابر ملت کی زیر قیادت بالکل بروقت اس فیصلہ کے خلاف رائے عامہ بیدار کی، بورڈ نے اس فیصلہ کے خلاف تحریک چلائی، مسلمانوں اور انصاف پسند غیر مسلموں نے اس تحریک کو پورا تعاون دیا۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کی سنجیدہ اور بامقصد جدوجہد کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔ اس فیصلہ کے تباہ کن اثرات کو زائل کرنے کے لیے ہندوستانی پارلیمنٹ نے مطلقہ بل منظور کیا۔ مطلقہ بل کا بنیادی مسودہ مسلم پرسنل لا بورڈ ہی نے تیار کیا تھا۔ مطلقہ بل کے ذریعہ مسلمان مطلقہ خواتین کے حقوق کا جس طرح تحفظ کیا گیا ہے اسے دیکھ کر غیر مسلموں نے بھی اعتراف کیا کہ اسلامی قانون میں عورتوں کے حقوق کا جتنا تحفظ ہے اتنا کسی دوسرے قانون میں نہیں ہے۔ غیر مسلم خواتین کی متعدد تنظیموں نے مطالبہ کیا کہ مطلقہ بل تمام طلاق شدہ عورتوں پر نافذ ہونا چاہیے، خواہ وہ کسی مذہب کی ماننے والی ہوں۔

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے اپنی افتاد طبع کے مطابق مسلم پرسنل لا بورڈ کے قابل تحسین کاموں پر بے وزن تنقیدیں کیں، ملی تشخص کے تحفظ کے نام سے مسلم پرسنل لا کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کا مذاق اڑایا، چند نمونے ملاحظہ ہوں:

"ٹائمس آف انڈیا (۲۲ اگست ۱۹۸۵ء) میں مسٹر کے سبرامنیم کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، اس کا عنوان ہے: ایک حقیقت جس کو مسلمان نظرانداز

کرتے ہیں۔ اس مضمون میں ہندوستانی مسلمانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس ذیل میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک بات وہ ہے جو مسلمانوں کی "تہذیبی تشخص" کی تحریکوں کے بارے میں ہے۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ایک فرقہ جو ایک وسیع تر مجموعہ جیسے ایک قوم کا جزو ہو وہ اپنے تشخص کو صرف دو طریقوں سے برقرار رکھ سکتا ہے۔ وہ یا تو وسیع تر مجموعہ کے علی العموم کلچر میں اپنا کوئی بہت خاص حصہ ادا کرے یا وہ بقیہ لوگوں سے اپنے آپ کو منقطع کر لینے پر اصرار کرے۔ اول الذکر سے یک جہتی پیدا ہوتی ہے جب کہ ثانی الذکر تصادم کی طرف لے جاتا ہے۔

. . . .

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں الأمین کہا جاتا تھا، تعمیر کعبہ کے مشہور واقعہ میں صبح کو جب لوگوں نے آپ کو کعبہ میں پایا تو کہہ پڑے ھذا الأمین رضینا (یہ امین ہیں، ہم ان پر راضی ہیں) آپ کا امانت دار ہونا آپ کا ایسا امتیاز بن گیا کہ مکہ میں آپ اپنی اس صفت سے پہچانے جانے لگے۔ یہ تشخص حاصل کرنے کا صحت مندانہ طریقہ ہے۔ جو لوگ کسی سماج میں اخلاقی، اصلاحی یا تعمیری اعتبار سے ممتاز ہو جائیں ان کو دوسروں کے درمیان ایسا تشخص حاصل ہوتا ہے جو حقیقی تشخص ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جو لوگ اپنا تشخص اس طرح حاصل کرنا چاہیں کہ وہ ہر معاملہ میں دوسروں سے الگ ہونے کی کوشش کریں وہ لوگوں کے درمیان ایک قسم کے "اچھوت" بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا تشخص موت کا تشخص ہوتا ہے نہ کہ زندگی کا تشخص"۔ (الرسالہ فروری ۱۹۸۶ء ص ۱۷)

سورۂ نساء کی آیت نمبر ۶۰ - ۶۱ (جن میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ باہمی نزاعات میں اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کو مانیں اور تحاکم الی الطاغوت سے منع کیا گیا ہے) نقل کرنے اور ان کی مختصر تشریح کرنے کے بعد جناب وحید الدین خاں صاحب لکھتے

ہیں کہ :

"مذکورہ قرآنی طریقہ کی روشنی میں اب اس معاملہ کو جانچئے، جو حال میں شاہ بانو اور محمد احمد (اندور) کے مقدمہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بعد پیش آیا۔ قرآن کے مطابق اس معاملہ میں مسلم قائدین کا اصل کام یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو ملامت کرتے کہ تم غیر مسلم عدالت میں کیوں اپنا مقدمہ لے جاتے ہو، تمہارے وہاں جانے ہی کی وجہ سے غیر مسلم عدالت کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ تمہارے عائلی معاملات میں اپنا فیصلہ دے۔ اس کے بجائے تم کو یہ کرنا چاہیے کہ تم اپنے مقدمات اپنے علماء کے سامنے پیش کرو...... مسلم قیادت نے یہ اصل کام تو نہیں کیا، البتہ وہ سپریم کورٹ اور غیر مسلم حکومت کے خلاف ہنگامہ کرنے میں مصروف ہے۔ یہ طریقہ بلاشبہ قرآنی طریقہ نہیں، یہ لیڈری ہے نہ کہ قرآن کی پیروی"

(الرسالہ فروری ۱۹۸۶ء ص ۲۳)

جناب وحید الدین خاں صاحب نے اس اقتباس میں دو چیزوں کو خلط ملط کرکے غلط فہمی پیدا کرنی چاہی ہے۔ مسلم علماء اور قائدین الحمدللہ مسلمانوں کے باہمی نزاعات خصوصاً عائلی مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے شرعی عدالتوں کے قیام سے غافل نہیں ہیں، مختلف صوبوں اور شہروں میں دارالقضا قائم ہیں جن میں مقدمات لے جانے کی مسلمانوں کو تلقین کی جاتی ہے، لیکن ان شرعی عدالتوں کو قانونی حیثیت حاصل نہیں اس لیے تمام مسلمانوں کو ان شرعی عدالتوں میں مقدمات لے جانے پر مجبور کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن مسلمانوں کے نکاح و طلاق کے جو مقدمات سرکاری عدالتوں میں پہنچ جائیں ان میں عدلیہ کی ذمہ داری ہے کہ شریعت ایکٹ کے تحت اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ دے۔ شاہ بانو کیس والے فیصلہ میں سپریم کورٹ کے ججز نے دانستہ شرارت کی، قرآن کی متعدد آیتوں کی من مانی تشریح کی، مسلم پرسنل لا کو ختم کرنے کے لیے یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کا حکومت کو مشورہ دیا، اس لیے اس فیصلہ کے خلاف مسلمانوں کا تحریک چلانا

ہر لحاظ سے ضروری تھا، الحمد للہ وہ تحریک کامیاب ہوئی اور اس کے نتیجہ میں پارلیمنٹ نے مطلقہ بل پاس کیا۔

"بعض فرقہ پرست ہندو لیڈر یہ کہتے ہیں کہ قومی ایکتا پیدا کرنے کا راز بھارتیہ کرن (انڈینائزیشن) ہے یعنی تمام لوگوں کی زبان اور مذہبی شعار ایک ہو جائے، آپس میں شادی بیاہ ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اس پر مسلم قائدین سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہیں اور "اسلام خطرہ میں" کی گھنٹی بجا کر زور وشور کے ساتھ "تحفظ شریعت" کی مہم چلانے لگتے ہیں، یہ طریقہ غیر مفید بھی ہے اور اصل مسئلہ کو شدید تر کرنے والا بھی۔ میرے نزدیک صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم کہیں کہ قومی ایکتا بجائے خود ایک ضروری چیز ہے۔ مگر اس کو حاصل کرنے کا طریقہ کلچرل شناختوں کو مٹانا نہیں بلکہ عدم رواداری کے ذہن کو مٹانا ہے۔ مسلم قائدین کے مذکورہ طریقہ میں آدمی صرف منفی ردعمل پیش کرنے والے کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ مگر دوسرا طریقہ اختیار کرنے کے بعد وہ اقدامی پوزیشن میں آجاتا ہے، اور دفاعی پوزیشن کے مقابلہ میں اقدامی پوزیشن بلاشبہ طاقت ور ہے۔ موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم لیڈروں نے تقریباً ہر معاملہ میں ایسا ہی کیا ہے۔ انھوں نے خدا کے دین کو عملاً تحفظ کا دین بنا دیا ہے جب کہ باعتبار حقیقت وہ اقدام کا دین ہے۔"

(الرسالہ جولائی ۱۹۸۶ء ص ۴۱)

جناب وحید الدین خاں صاحب نے اس اقتباس میں یہ تاثر دینا چاہا ہے کہ انھوں نے بھارتیہ کرن کے فلسفہ کو رد کرنے کے لیے کوئی نیا فارمولہ پیش کیا ہے، حالانکہ عدم رواداری کا ذہن مٹانے کی بات مسلم قائدین کی طرف سے بار بار پوری تفصیل اور دلائل کے ساتھ کہی جا چکی ہے، لیکن جو لوگ واقعات کی دنیا میں رہتے ہیں انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہندو فرقہ پرستوں کی طرف سے بھارتیہ کرن کی بات اس لیے نہیں کہی جاتی کہ وہ لوگ واقعی قومی یک جہتی پیدا کرنا چاہتے

ہیں اور اس کا واحد ذریعہ بھارتیہ کرن کو سمجھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بھارتیہ کرن کے نعرے سے فرقہ پرستوں کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی اور تہذیبی شناخت ختم کرنا ہے اور اس ذہنیت کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کے سوا چارۂ کار نہیں کہ مسلمانوں کو تحفظ شریعت کے لیے متحد کر کے فرقہ پرستوں اور حکومت پر سیاسی دباؤ ڈالا جائے اور مسلم پرسنل لا کے خلاف کوئی اقدام کرنے سے باز رکھا جائے۔

فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں وحید الدین خاں صاحب کا موقف

ہندوستانی مسلمانوں کو جو سنگین مسائل و مشکلات درپیش ہیں ان سے پورا عالم اسلام کچھ نہ کچھ واقف ہے، سب سے نازک اور حساس مسئلہ فسادات کا ہے، یہ فسادات محض گروہی تصادم نہیں ہوتے بلکہ منصوبہ بند قتل عام اور نسل کشی ہوتے ہیں، ہندوستان میں متعدد انتہا پسند جارح ہندو تنظیمیں قائم ہیں جو ان فسادات کے منصوبے بناتی ہیں، ہندو نوجوانوں کو عسکری ٹریننگ دیتی ہیں، ان کے دل و دماغ فرقہ وارانہ جذبات سے مسموم کرتی ہیں، مقامی پولیس اور انتظامیہ سے ان کی سازباز ہوتی ہے، کسی معمولی واقعہ کو بہانہ بنا کر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی ہے۔ بہت سے انصاف پسند غیر مسلم صحافی بھی اپنے جائزوں میں ان فسادات کے منصوبہ بند ہونے اور مسلمانوں کی نسل کشی ہونے کا اعتراف کر چکے ہیں۔ ابھی چند مہینہ پہلے صوبہ بہار کے شہر بھاگلپور اور اس کے مضافات میں ہولناک ترین فساد ہوا، جس میں ہزاروں مسلمانوں کو پوری شقاوت اور بے دردی سے شہید کیا گیا، لرزہ خیز مظالم کیے گئے، ان کی معاشیات کو برباد کیا گیا ہے۔

ان مسلم کش فسادات کے بارے میں چند سال قبل جناب وحید الدین خاں صاحب کا بھی وہی نقطۂ نظر تھا جو تمام مسلم قائدین اور انصاف پسند غیر مسلم صحافیوں اور لیڈروں کا ہے۔

اپریل و مئی ۱۹۶۲ء کے ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ میں جناب وحید الدین

خاں صاحب کا ایک مضمون اس عنوان سے شائع ہوا تھا: "حالات بدل سکتے ہیں"
اس مضمون میں موصوف ایک جگہ لکھتے ہیں:

"کیا ہم اکثریت کی طرف سے اقلیت کو لوٹنے اور ہلاک کرنے کے ان مسلسل اور منظم واقعات کو عدالت میں لے جانا چاہتے ہیں، جن کو غلطی سے "فرقہ وارانہ فساد" کہا جاتا ہے اور جس نے مسلمانوں کی زندگی کو اس ملک میں اتنا غیر یقینی بنا دیا ہے کہ اب کسی بستی کے مسلمانوں کو نہیں معلوم کہ کس صبح یا شام کو انھیں مارنا اور ان کی جائدادوں کو لوٹنا یا جلانا شروع کر دیا جائے گا اور ملک کی پولیس اور فوج روکنے کے بجائے خود بھی ان کے اس مقدس کام میں ان کے ساتھ شریک ہوگی۔ غارت گری کے یہ واقعات اب اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ اگر کسی دن ملک کی انشورنس کمپنیاں یہ اعلان کر دیں کہ مسلمانوں کی جان و مال کا بیمہ نہیں کیا جا سکتا، تو بالکل تعجب کی بات نہ ہوگی۔ کیوں کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کا بیمہ کرنا انشورنس کمپنیوں کے لیے فائدے کے بجائے خسارے کا سودا بن گیا ہے۔ اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ اکثریت کے ان مظالم کا عدالت کے ذریعہ دفعیہ ہو سکتا ہے تو وہ یا تو قانون کی حدود کو نہیں جانتا یا پھر اصلاحِ حال کے لیے قانون کا حوالہ دے کر یہ غلط فہمی پیدا کرنا چاہتا ہے کہ مسئلہ زیادہ سنگین نہیں، معمولی درجہ کا ہے، کیونکہ معمولی اور چھوٹے مسائل ہی کو قانون کے ذریعہ حل کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بالکل فریب اور دھاندلی ہے کہ موجودہ حالات کو قانونی طور پر قابلِ حل مسائل کے زمرے میں شمار کیا جائے۔ یہ تو ملکی پیمانے پر ایک منظم غارت گری ہے جس میں حکومت، پولیس، فوج، سرکاری عملہ اور اکثریتی فرقہ سب کے سب شریک ہیں۔ ایک ایسے ہمہ گیر طوفان کو قانون کے ذریعہ ٹالنے کی کوشش کرنا قانون اور مظلوم فرقہ دونوں کا مذاق اڑانا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس طوفان میں کون فیصلہ دے گا اور وہ کون ہوگا جو اس فیصلے کا نفاذ عمل میں لائے گا" (ماہنامہ الفرقان اپریل ۷۹ء)

ادھر دس بارہ سالوں سے ہندو تنظیموں اور مذہبی ہندو شخصیات سے جناب وحید الدین خاں صاحب کے روابط رہے ہیں، ان کے پروگراموں میں موصوف شرکت کرتے رہتے ہیں، ان کی یہ شرکت بظاہر دعوتی جذبہ سے ہوتی ہے لیکن ان کی تحریروں اور بیانات سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ موصوف موثر بننے کے بجائے متاثر ہوتے جارہے ہیں ہندوستان کے مسلم مسائل کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر ایسا ہوتا جارہا ہے جو غیر مسلموں کو بے انتہا پسند ہے، اسی لیے فرقہ پرست ہندو پریس ان کے بیانات کو جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کرتا ہے۔ اب موصوف فسادات کے موضوع پر اپنی تحریروں میں مسلسل یہ نظریہ پیش کررہے ہیں کہ ان فسادات کے اصل ذمہ دار مسلمان ہیں، مسلمانوں ہی کی اشتعال انگیزی، جذباتیت اور ناعاقبت اندیشی سے یہ فسادات ہوتے ہیں، فسادات منظم سازش اور منصوبہ بندی کے تحت نہیں ہوتے بلکہ اتفاقی طور پر ہوتے ہیں، چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> "ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں یہ بات تقریباً ثابت شدہ ہے کہ اس کا آغاز ہمیشہ کسی مسلمان کی اشتعال انگیز کارروائی سے ہوتا ہے۔ یہ معاملہ ابتداءً ایک ہندو ایک مسلمان کے درمیان ہوتا ہے اس کے بعد مسلمانوں ہی کے پیدا کردہ حالات کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ یہ انفرادی واقعہ بہت جلد قومی واقعہ بن جاتا ہے۔ اب ہندو چونکہ اس ملک میں طاقت ور پوزیشن میں ہے، اس کا ردعمل مسلمان کے حق میں بڑا ہولناک ثابت ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو ایک کے بدلے میں ایک سو کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔" (الرسالہ ستمبر ۱۹۸۸ء ص ۱۲)

> "ہندوستان کا تقریباً ہر فرقہ وارانہ فساد مسلمانوں کی بے صبری سے شروع ہوتا ہے۔ مسلمان اپنی مخصوص نفسیات کی بنا پر چھوٹی سی خلاف مزاج بات پر مشتعل ہوجاتے ہیں اور اس کے بعد معلوم اسباب کے

تحت وہ دو قوموں کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہوتا ہے جس میں نقصان ہمیشہ مسلمانوں کے حصہ میں آتا ہے۔ ان فسادات کو اُبھارنے کی سب سے زیادہ ذمہ داری مسلم قائدین پر ہے۔ مسلمانوں میں جتنے بھی لکھنے اور بولنے والے ہیں سب متفقہ طور پر جہاد کی باتیں کرتے ہیں، وہ مسلمانوں کے اندر برابر لڑنے کا مزاج بناتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی نہیں معلوم کہ قرآن میں صبر کی بھی آیتیں ہیں تاہم دوسروں کو اپنی زبان و قلم سے جہاد پر اُبھارنے والے یہ لوگ خود ہمیشہ جہاد کے میدان سے دور رہتے ہیں۔" (الرسالہ مئی ۱۹۸۶ء ص ۱۸)

"چونکہ فسادات اکثر ان مقامات پر ہوتے ہیں، جہاں مسلمان اقتصادی اعتبار سے نسبتاً بہتر ہیں۔ اس لیے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ مسلمانوں کی اقتصادیات کو برباد کرنے کی منظم سازش کے تحت ہو رہا ہے۔ حالانکہ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ مسلمان جن مقامات پر بہتر حیثیت میں ہیں وہیں وہ جذباتی حرکتیں بھی زیادہ کرتے ہیں۔ کسی آدمی کو پُرجوش کارروائی کرنے کے لیے ہمیشہ سماجی پشت پناہی درکار ہوتی ہے اور یہ سماجی پشت پناہی ان مقامات کے مسلمانوں کو بآسانی مل جاتی ہے جہاں مسلمان اقتصادی اعتبار سے بہتر ہوں، مسلمانوں کے آپس کے جھگڑے اور اختلافات بھی انھیں مقامات پر زیادہ ہوتے ہیں جہاں انھیں کسی قدر معاشی اعتماد حاصل ہے۔ اسی طرح مسلمان اور غیر مسلمان کا تصادم بھی اکثر انھیں مقامات پر پیش آتا ہے جہاں مسلمان علاقائی اور اقتصادی اعتبار سے اپنے کو محفوظ سمجھتے ہوں۔" (حل یہاں ہے ص ۵۰۔۵۱)

"ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں کا سارا غصہ ہمیشہ "فسادیوں" کے خلاف ہوتا ہے، مگر ذاتی طور پر میں ان فسادات کا ذمہ دار مسلمانوں

کو سمجھتا ہوں۔ اس لیے میرے تمام احساسات کا رُخ صرف مسلمانوں کی طرف رہتا ہے۔ مجھے مسلمانوں کی حالت پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ حقائق کی دنیا میں حقائق سے بالکل بے پروا ہو کر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

ان فسادات کی جڑ میرے نزدیک یہ ہے کہ مسلمانوں نے ملک کو تقسیم کرایا، مگر وہ تقسیم کے نتائج قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ملک کو "ہندو انڈیا" اور "مسلم انڈیا" میں تقسیم کرنے کا لازمی مطلب یہ تھا کہ مسلمان "ہندو انڈیا" میں اپنے لیے نمبر ۲ کی حیثیت قبول کرنے پر راضی ہیں۔ اگر مسلمانوں نے خود اپنے عمل کے اس نتیجہ کو ۱۹۴۷ء کے بعد قبول کر لیا ہوتا تو حالات معمول پر آجاتے اور ملک کی تاریخ فرقہ وارانہ فساد کے بجائے فرقہ وارانہ تعمیر کی تاریخ ہوتی۔ (واضح ہو کہ نمبر ۲ کی حیثیت کا مطلب مسلمانوں کا درجہ گرانا نہیں بلکہ صرف حقیقت واقعہ کا اعتراف کرنا ہے۔)"

(الرسالہ مئی ۱۹۸۵ء ص ۳۵)

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے تقسیم ہند کی ذمہ داری یک طرفہ طور پر مسلمانوں کے سر ڈال دی ہے، حالانکہ یہ خلاف واقعہ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ملک کے ایک وفاقی ڈھانچے پر (جس میں صوبوں کو اکثر معاملات میں خود مختاری دی گئی تھی) مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کا اتفاق ہو گیا تھا، خود کانگریس کے صدر جواہر لال نہرو کے بعض غیر ذمہ دارانہ بیانات اور بعض طے شدہ دفعات کی خلاف ورزی کی وجہ سے تقسیم ملک کا المیہ پیش آیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب "آزادیٔ ہند" میں نہرو اور گاندھی پر تقسیم ملک کی ذمہ داری ڈالی ہے۔

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے فرقہ وارانہ فسادات کے تعلق سے ہندو قوم کے مختلف طبقات کا جو تجزیہ پیش کیا وہ ان کی "عقل و بصیرت" کا منہ بولتا ثبوت ہے، قارئین کی "معلومات" میں اضافہ کرنے کے لیے اسے یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

"ہندو قوم اس وقت تین بڑے طبقوں پر مشتمل ہے۔ ایک تعلیم یافتہ طبقہ جو ملک کے اکثر انتظامی اور سماجی عہدوں پر قابض ہے۔ دوسرا تاجر طبقہ جو ملک

کی بیشتر اقتصادیات پر قبضہ کیے ہوئے ہے، تیسرا گروہ ہندو عوام اور پس ماندہ طبقات کا ہے، جو تعداد کے اعتبار سے ہندو قوم کا زیادہ بڑا حصہ ہیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ اپنے تعلیمی مزاج کی بنا پر سیکولر یا سائنٹفک ڈھنگ سے سوچتا ہے۔ وہ معاملات پر فرقہ وارانہ انداز کے بجائے حقیقت پسندانہ انداز میں رائے قائم کرتا ہے۔ تاجر طبقہ کے سامنے اصلاً اس کا تجارتی مفاد ہے، چونکہ تجارت کی مشین کو جاری رکھنے کے لیے امن ضروری ہے اس لیے وہ چاہتا ہے کہ ملک میں امن کا ماحول قائم رہے۔ تاکہ اس کے تجارتی عمل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ تیسرا طبقہ زیادہ تر غریب اور بے روزگار یا کم آمدنی والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہی طبقہ اصلاً تمام فسادیں ملوث ہوتا ہے، اس کا فائدہ دنگے اور فساد میں ہے۔"

(الرسالہ مئی سنہ ۱۹۹۰ء ص ۲۹، ۲۸)

جناب وحید الدین خاں صاحب نے حقائق سے آنکھیں بند کرکے جو تجزیہ تحریر فرمایا ہے وہ تبصرے کا محتاج نہیں، موصوف نے ہندو قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ اور تاجر طبقہ کو مکمل طور پر امن پسندی اور سیکولر مزاجی" کا سارٹیفکٹ دے کر دوستی کا پورا حق ادا کیا ہے، <u>ان کی نظر میں سارا قصور غریب، بے روزگار اور کم آمدنی والے ہندوؤں کا ٹھہرا لیکن کیا موصوف یہ بتانا پسند کریں گے کہ کیا آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد، بھارتیہ جنتا پارٹی، بجرنگ دل کے ذمہ داران و اراکین غریب اور بے روزگار ہندوؤں میں شامل ہیں؟ کیا لال کرشن اڈوانی، اٹل بہاری باجپئی، اشوک سنگھل، جنت اویدناتھ، اور ارون شوری جیسے لوگ تعلیم یافتہ طبقہ سے خارج ہیں؟</u>

بلاشبہ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ اور تاجر طبقہ میں ایک بڑی تعداد امن پسندوں اور سیکولر ذہن رکھنے والوں کی ہے لیکن یہ بھی حقیقت واقعہ ہے کہ فسادات کی منصوبہ بندی کرنے والوں اور تعصب کا زہر پھیلانے والوں کا تعلق بھی انہیں دونوں طبقات سے ہے، ملک کی تعلیم گاہیں (کالجز، یونیورسٹیز) متعصب ہندو تنظیموں کا مرکز بنی ہوئی ہیں، تعلیم یافتہ افراد ہی جارح ہندو تنظیموں میں پیش پیش ہیں اور صنعت کاروں نیز تاجروں کی ایک بڑی تعداد پوری دریادلی سے ان تنظیموں کے مصارف پورے کرتی ہے۔ ان حالات میں وحید الدین خاں صاحب کی طرف سے "امن پسندی" کا سارٹیفکیٹ خود ان کی پوزیشن کو مشکوک بناتا ہے۔

بابری مسجد کا مسئلہ

بابری مسجد کا مسئلہ آج بچے بچے کی زبان پر ہے، بابری مسجد کی بازیابی کے لیے جو طریقہ کار مختلف تنظیموں نے اپنایا ہے اس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن بابری مسجد تھالی میں سجا کر مندر بنانے کے لیے پیش کر دینا اور بازیابی کی جد و جہد سے دست کش ہو جانا مسلمانوں کے لیے کسی حال میں درست نہیں۔

بابری مسجد کے مسئلہ میں بھی وحید الدین خاں کے لیے تمام مسلم علماء اور قائدین سے ہٹ کر نئی راہ اپنانا ضروری تھا تاکہ "شوقِ انفرادیت" کی تسکین کا سامان ہو جائے، چنانچہ موصوف نے جولائی ۱۹۸۶ء کے 'الرسالہ' میں "قیادت کا دیوالیہ پن" کے عنوان سے دس صفحات کا بڑا تیز و تند مضمون لکھا اور ڈسٹرکٹ جج فیض آباد کے عدالتی حکم سے فروری ۱۹۸۶ء میں بابری مسجد کے دروازے کا پوجا کے لیے تالا کھولے جانے کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا:

"یہ واقعہ بلاشبہ غلط تھا، مگر اس کے بعد مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ یقینی طور پر اس سے بھی زیادہ غلط تھا۔ کیونکہ وہ سنتِ رسولؐ کے خلاف تھا۔ قدیم مکہ میں کعبہ کے مقدس ترین خدا خانہ کو بت خانہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ اسی نوعیت کا سخت تر مسئلہ تھا، مگر اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے ان طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے سیاست پسند لیڈروں کی پیروی میں اختیار کیا ہے۔ کعبہ کے مذکورہ مسئلہ کو رسول اللہ نے قومی لڑائی کا عنوان نہیں بنایا، بلکہ اپنی ساری توجہ انسانی ضمیر کو جگانے پر لگا دی۔

بابری مسجد کا مسئلہ پیدا ہونے کے بعد مسلمانوں نے یہ کیا کہ انھوں نے بند،
گرفتاری، دھرنا، ریلی، ایجی ٹیشن، جلسوں اور تقریروں کے ہنگامے جاری کر دیے۔
مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کہ مشرکین نے خانۂ خدا میں بت
داخل کر رکھے تھے، آپ نے ان مشرکین کے دلوں میں توحید کو داخل کرنے کی
مہم شروع کر دی۔ . . . .

بابری مسجد کے معاملہ میں مسلمانوں نے جو ہنگامہ برپا کیا وہ سراسر ایک قومی
ہنگامہ ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ استحصال پسند لیڈروں کی پیروی
ہے نہ کہ خدا کے پیغمبر کی پیروی۔" (الرسالہ جولائی ۱۹۹۰ء ص ۱۸)

غیر مسلموں کے دلوں میں توحید داخل کرنے کی مہم یہ الفاظ دیگر ان میں اسلام کی
دعوت و تبلیغ مسلمانوں کی دائمی اور مستقل ذمہ داری ہے، خواہ مشرکین مسجدوں میں بت داخل
کر رہے ہوں یا پُرامن ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر مسجد کو مندر میں تبدیل کیا جا رہا ہو
تو کیا مسلمانوں کی ذمہ داری نہیں ہے کہ مزاحمت کریں اور ہر جائز و ممکن طریقہ اختیار کر کے
مسجد کو مسجد باقی رکھنے کی جد و جہد کریں؟ ۔ بابری مسجد کے معاملہ میں خاں صاحب نے
مسلمانوں کو دو سُجھاؤ دیے ہیں:

"۱۔ قانون اور گفت و شنید کے ذریعہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی جائے۔
۲۔ مسلم تاریخ دانوں کا ایک بورڈ بنایا جائے۔ یہ بورڈ خالص تاریخی حقائق
کی روشنی میں معاملہ کا جائزہ لے اور تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر وہ جس رائے
پر پہنچے اس کے مطابق وہ اس کا فیصلہ کر دے۔ دونوں فریق پیشگی اقرار نامہ
کے مطابق اس کے پابند ہوں کہ مذکورہ بورڈ کا جو فیصلہ ہوگا اس کو ہر دو فریق
مزید بحث کے بغیر مان لیں گے۔"

(الرسالہ جولائی ۱۹۹۰ء، ص ۱۹، ۲۱)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بابری مسجد کی بازیابی کے لیے بند، گرفتاری، ریلی اور
جلسوں کا طریقہ اپنانا سنتِ رسولؐ کے خلاف ہے، کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خانۂ کعبہ

کے سلسلے میں یہ طریقہ نہیں اپنایا تو عدالتی چارہ جوئی، گفت وشنید اور مورخین کے بورڈ کے ذریعہ بابری مسجد کے مسئلہ کا حل تلاش کرنا خلافِ سنّت کیوں نہیں ہے؟ کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خانۂ کعبہ کی تطہیر اور بازیابی کے لیے ان میں سے کوئی طریقہ اختیار فرمایا تھا؟

بابری مسجد کے مسئلہ کو خانۂ کعبہ کی صورت حال پر قیاس کرنا ذہنی دیوالیہ پن کے سوا کچھ نہیں، خانۂ کعبہ میں سیکڑوں سال پہلے سے بُت رکھے ہوئے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین سے مزاحمت، قتل وقتال کی مکمل ممانعت تھی، بابری مسجد کی صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے، جو عمارت سیکڑوں سال سے مسجد تھی اسے رام جنم بھومی کہہ کر مندر میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اور یہ سلسلہ بابری مسجد پر رُکنے والا نہیں ہے بلکہ ہندو فرقہ پرستوں کے پاس ایسی مساجد کی طویل لسٹ ہے جنھیں مندر میں تبدیل کرنے کا ناپاک منصوبہ رکھتے ہیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ حکمت اور جرأت سے کام لے کر باہمی اتحاد واتفاق اور مشورے سے مساجد کے تحفظ کے لیے ہر وہ ممکن طریقہ اختیار کریں جس کی موجودہ حالات میں گنجائش ہو اور جو طریقے مفید اور موثر ہوسکتے ہوں۔

وحیدالدین خاں صاحب کا فکری عدم توازن

تلاشِ حق کی داستان

جناب وحیدالدین خاں صاحب کی تحریروں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ موصوف اپنے تمام تر تصنیفی کمالات اور سادہ اور دلکش اسلوب تحریر کے باوجود ابتدا ہی سے ذہنی اور فکری عدم توازن کے شکار رہے ان کا یہ عدم توازن کبھی کبھی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے۔ کتاب و سنت کے گہرے مطالعہ اور تنقید و نظر میں پختگی کا جو فقدان موصوف کے یہاں پایا جاتا ہے اس کا بھی غالباً ان کے انتشار ذہنی اور فکری عدم توازن میں بڑا دخل ہے۔

درج ذیل صفحات میں جناب وحیدالدین خاں صاحب کی چند ایسی تحریریں درج کی جاتی ہیں، جن میں ان کے ذہنی اور فکری عدم توازن کی پرچھائیاں صاف طور سے محسوس ہوتی ہیں۔ اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ موصوف کی تحریروں میں جو انحرافات اور فکری بے راہ روی پائی جاتی ہے، اس میں بہت بڑا دخل ان کی اس ذہنی کیفیت کا ہے۔ اوائل عمر ہی سے ان کی ذہنی بے چینی ان کے لیے سنگین مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ موصوف نے اپنے عہد نوجوانی میں پیش آنے والی اسی طرح کی صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے "الرسالہ" میں سفرنامۂ لاہور کے تحت لکھا ہے:

"پہلی بار میں ۱۹۴۵ء میں لاہور گیا تھا اس وقت میری عمر تقریباً ۲۰ سال تھی یہ میری زندگی کے اس دور کی بات ہے کہ میں "تلاش حق" کے

کٹھن مرحلے سے گزر رہا تھا، میں اپنے ماحول میں ایک سیدھے سادھے نوجوان کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ میرے چچازاد بھائی مولانا اقبال احمد سہیل مجھ کو مرزا بھویا کہتے تھے۔ یہ حالات تھے کہ ۱۹۴۲ء میں میرے ساتھ ایک شدید حادثہ گزرا، یہ گویا ایک قسم کا انفجار (EXPLOSION) تھا، جس نے میری بند شخصیت کو کھول دیا۔ یہ حادثہ بظاہر ایک مادی ناکامی کا واقعہ تھا، مگر عملاً وہ میرے لیے روحانی ناکامی کا واقعہ بن گیا۔ اس واقعہ نے میری سوئی ہوئی فطرت کو جگا دیا۔ اچانک میں نے جانا کہ میں نہیں جانتا، میں نے اپنے نہ جاننے کو دریافت کیا۔ اس حادثہ نے میری زندگی کو سکون کے دور سے نکال کر اضطراب کے دور میں داخل کر دیا...... یہ دور تقریباً ۵ سال تک رہا۔ اس وقت میرے اوپر جو حالات گزرے وہ اتنے شدید تھے کہ کئی بار میں نے چاہا کہ میں خودکشی کر لوں۔ دیوانگی کے عالم میں کبھی کبھی کسی دور دراز بستی میں چلا جاتا اور کبھی کسی جنگل یا پہاڑی کی طرف نکل جاتا، ۱۹۴۵ء میں لاہور کا سفر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ اس وقت پاسپورٹ اور ویزا کے مسائل نہیں تھے، میں شاہ گنج میں ایک اکسپریس ٹرین میں سوار ہو گیا۔ اس وقت شاہ گنج سے لاہور کا ریلوے کرایہ غالباً گیارہ روپے تھا۔ ٹرین نے سیدھا لے جا کر مجھے لاہور میں اُتار دیا، لاہور اسٹیشن پر اُترنے والے تمام مسافر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ مگر میں دیوانگی کے عالم میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں، کیونکہ اس وقت لاہور میں کوئی بھی میرا جاننے والا نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب پلیٹ فارم خالی ہو گیا تو ایک خالی انجن دھواں اڑاتا ہوا پٹری سے گزرا، میں اس کی طرف بڑھا کہ اپنے آپ کو اس کے نیچے ڈال دوں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی مخفی طاقت نے میرے قدموں کو پکڑ لیا ہے۔ چاہنے کے باوجود میں آخری اقدام سے باز رہا...... میں ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلا تو بھی مسجد میرے سامنے تھی چنانچہ میں نے

آسٹریلیا مسجد میں اپنا مختصر سامان رکھا اور ایک اجنبی مسافر کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوا۔ میں کسی منصوبہ اور معلومات کے بغیر مختلف سڑکوں پر گھومتا رہا یہاں تک کہ میں میورروڈ پہنچ گیا۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے بورڈ نے بتایا کہ یہ ڈاکٹر محمد اقبال (۱۸۷۳ — ۱۹۳۸ء) کا مکان ہے۔ مکان بالکل اُجاڑ دکھائی دے رہا ہے۔ میں وہاں ٹھہر گیا۔ سڑک سنسان تھی۔ میں بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے اکیلا کھڑا تھا۔ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور میری زبان پر یہ الفاظ جاری تھے :— "خداوندا تو کب آئے گا' میں کب تک تیرے آنے کا انتظار کروں۔ یہ دعائیہ کلمہ میرے اس اندرونی کیفیت کو بتا رہا ہے جس کے تحت میں اس زمانہ میں لاہور گیا اور دوسرے مقامات کے سفر کیے۔"

(الرسالہ جون ۱۹۸۵ء، ص ۳۵ - ۳۶)

دماغی کمزوری :-

جناب وحیدالدین خاں صاحب کا مذکورہ بالا طویل اقتباس ان کے ذہنی انتشار اور فکری عدم توازن کا آئینہ دار ہے۔ قرآن و سنت کا علم حاصل ہو جانے کے بعد انسان حق کی تلاش کے لیے سرگرداں رہے' اور سڑکوں کی خاک چھانتا رہے' اسے ذہنی خلل کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ موصوف نے اپنی عمر کے مذکورہ بالا پانچ سالہ دور کو "تلاشِ حق" کا نام دیا ہے۔ حالانکہ انھوں نے اس پانچ سالہ دور کے اپنے جو حالات لکھے ہیں ان کی روشنی میں ہم اسے "دورۂ جنوں" کے سوا کوئی اور نام نہیں دے سکتے۔

جناب وحیدالدین خاں صاحب اپنی نوجوانی میں جس ذہنی انتشار اور فکری عدم توازن کا شکار رہے' اس نے کبھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا' زندگی کے ہر دور میں ان کا یہ ذہنی مرض کسی نہ کسی شکل میں اُبھرتا رہا۔ لیکن موصوف نے اپنی ذہنی کیفیت کے ازالہ کی فکر کے بجائے اسے اپنے لیے "منقبت" اور "اعزاز" تصور کیا' اور اپنی ادبی

صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی ذہنی کیفیت کی حسین توجیہ کرنے کی کوشش کی مثلاً ان کی مشہور کتاب "تعبیر کی غلطی" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"یہاں مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آتا ہے جو ۲۶ مارچ ۱۹۶۳ء کو پیش آیا۔ ان دنوں میں قرآن کی "چار بنیادی اصطلاحیں" کے استدلالات کے سلسلہ میں بے حد مشغول تھا۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے کتب خانہ کا وسطی کمرہ ہے چاروں طرف تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، علم کلام اور لغت کی ایک درجن سے زیادہ الماریاں دیواروں سے لگی ہوئی رکھی ہیں، ایک بجے دن کا وقت ہے کتب خانہ کے بیرونی دروازے بند ہو چکے ہیں اور تمام لوگ دوپہر کے وقفہ میں اپنے اپنے ٹھکانوں کو جا چکے ہیں، مکمل تنہائی کا ماحول ہے جس میں ایک طرف میں ہوں اور دوسری طرف کتابیں۔ مسلسل مطالعہ کی وجہ سے اس وقت میری کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے میرے سارے بدن کا خون نچوڑ لیا ہو۔ تفسیر ابن کثیر کی ایک جلد دیکھ کر میں اٹھا کر اس کو الماری میں رکھ کر دوسری کتاب نکالوں تو کمزوری کی وجہ سے چکر آ گیا اور سمت بھول گئی۔ یہ میرا مدت کا جانا کمرہ ہے، مگر تھوڑی دیر تک میں وہاں اس طرح کھڑا رہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کدھر جاؤں اور کس الماری سے کتاب نکالوں کچھ دیر کے بعد ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ متعلقہ الماری فلاں سمت میں ہے۔

اس واقعہ کے کچھ دیر بعد جب میں نے اپنے حواس کو یکجا کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا میں زیر بحث نظریہ کے بارے میں اسلاف امت سے تبادلہ خیال کرنے کے لیے بہت دور تک چلا گیا تھا، اور چلتے چلتے تھک گیا۔ مگر اس کمزوری اور تکان کے باوجود مجھے یہ سوچ کر خوشی ہو رہی تھی کہ مجھے ان کی رائے معلوم ہو گئی ہے اور اب میں اس پوزیشن میں ہوں کہ ان کی طرف سے پورے اعتماد کے ساتھ زیر بحث تصور کی تردید کر سکوں،

مجھے ایسا نظر آیا گویا تمام الماریاں اور ان میں بھری ہوئی کتابیں اسلاف کی روحیں ہیں جو میرے پیچھے کھڑی ہیں، اور میں اپنے کمزور ہاتھوں اور کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ ان کی طرف سے مدافعت کرنے کے لیے جارہا ہوں یہ سوچ کر اتنی خوشی ہوئی کہ تکان اور بھوک پیاس سب بھول گئی، اور میں دوبارہ مغرب تک کے لیے اپنے مطالعہ میں مشغول ہوگیا۔"

(تعبیر کی غلطی، ص ۱۴-۱۵، دوسرا ایڈیشن)

یہ اقتباس جناب وحیدالدین خاں صاحب کی انشار پردازی اور ادیبانہ نکتہ آفرینی کا ایک نمونہ ہے۔ اس اقتباس میں بیان کردہ واقعات کے مطابق ان کے ساتھ جو صورت حال پیش آئی وہ بالکل واضح ہے۔ موصوف کو ضعف دماغ کی وجہ سے مسلسل مطالعہ کی بنا پر چکر آگیا، اور سمت فراموش ہوگئی، ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کدھر جاؤں اور کس الماری سے کتاب نکالوں۔ لیکن موصوف نے اپنے اس ضعف دماغ کی شاندار توجیہ کی اور اپنی اس دماغی کیفیت کو "اسلاف امت سے تبادلۂ خیال کرنے کے لیے بہت دور چلا جانا" قرار دیا۔ ظاہر بات ہے اس درجہ ضعف دماغ کی حالت میں جو مطالعہ کیا جائے گا اور نتائج نکالے جائیں گے وہ کسی طرح قابلِ اعتبار نہیں ہو سکتے۔

خواب پورا ہوگیا

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے "الرسالہ" کے اکتوبر ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں "خواب پورا ہوگیا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو ان کی ذہنی کیفیت اور فکری عدم توازن کا غماز ہے، اس مضمون کے شروع میں انھوں نے اپنی تفسیر "تذکیر القرآن" کا امتیاز اور خصوصیت بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

"۱۹۶۳ء کا واقعہ ہے اس وقت میں اعظم گڑھ میں تھا۔ یہ میری زندگی کا خاص وقفہ تھا، جب کہ مجھ پر ایک قسم کی حیرانگی کا عالم طاری تھا،

اس وقت میں ایک ناپیدا کنار صحرا کے کنارے کھڑا ہوا تھا، میں مدت سے عمل کی تڑپ سے جل رہا تھا، مگر کام کے عملی مواقع مجھے دکھائی نہیں دیتے تھے، حتی کہ مجھ پر یہ بھی واضح نہ تھا کہ آئندہ مجھے واقعتاً کوئی کام کرنا ہے یا محض کام کی تڑپ لے کر مرجانا ہے۔ عین اسی نفسیاتی حالت میں یکم فروری ۱۹۶۳ء کو اعظم گڑھ کے ایک دیہات میں، میں نے خواب دیکھا۔ اٹھا تو پورا خواب یاد نہیں رہ گیا تھا۔ صرف خواب کا ایک جزء ذہن میں باقی رہ گیا تھا اور وہ تھا "۱۹ جولائی"۔ بیداری کے بعد مجھے یہ تاریخ "۱۹ جولائی" تو اچھی طرح یاد تھی مگر اصل خواب کچھ بھی یاد نہ تھا۔

۱۹۶۳ء کے اس خواب کے مطابق میں ہر سال "۱۹ جولائی" کا انتظار کرتا رہا ہوں یہ بات میرے گھر کے تمام افراد کو معلوم ہے، مگر ہر سال یہی ہوا کہ جب "۱۹ جولائی" آئی تو اس روز کوئی ایسا قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا جس کو اس خواب کی تعبیر سمجھا جاسکے۔ اسی طرح تیئس سال بیت گئے۔ ۱۹۸۶ء کی ۱۹ جولائی وہ پہلی تاریخ ہے جب کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کو میں اپنی زندگی کا سب سے زیادہ یادگار واقعہ سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ عین اسی تاریخ کو میری تفسیر کی کتاب مکمل ہوئی۔ اسی روز میں نے تذکیر القرآن کا آخری صفحہ لکھا۔

۱۹۶۳ء کے بعد مجھ پر مختلف حالات پیش آتے رہے، یہاں تک کہ ۱۹۶۷ء میں، میں دہلی منتقل ہوا اور پھر ۱۹۷۶ء میں ماہنامہ "الرسالہ" نکلنا شروع ہوا۔ ماہنامہ کی وجہ سے مزید تحریک ہوئی اور میں نے ۱۹۷۹ء سے باقاعدہ طور پر تذکیر القرآن لکھنا شروع کر دیا۔ اس دوران سخت ناموافق حالات کے باوجود "تذکیر القرآن" کی تحریر کا کام برابر جاری رہا، اور پھر مذکورہ خواب کے ۲۳ سال بعد ۱۹ جولائی کو وہ تکمیل تک پہنچا۔

میں جب اس پورے واقعہ پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس میں ذرا

بھی شبہ نہیں ہوتا کہ میرے مذکورہ خواب کی تعبیر یہی "تذکیر القرآن" ہے۔
"۱۹ جولائی" اس کی تکمیل کی وہ تاریخ تھی جو خود اللہ تعالیٰ نے ۲۴ سال
پہلے اپنی طرف سے مقرر فرما دی تھی۔ یہاں میں وہ الفاظ نقل کرتا ہوں
جو میں نے تفسیر کی تکمیل کے بعد اپنی ڈائری میں لکھے تھے :

آج جولائی ۱۹۸۶ء کی ۱۹ تاریخ ہے اور صبح چار بجے کا وقت۔
میں ابھی تذکیر القرآن کا آخری صفحہ (تفسیر سورۃ الناس) لکھ کر فارغ ہوا
ہوں۔ تذکیر القرآن لکھنے کا کام ۱۹۷۹ء کے وسط میں شروع ہوا تھا اور
اس کی پہلی قسط ماہنامہ "الرسالہ" اگست ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ آج
۱۹ جولائی ۱۹۸۶ء کو اس کی تحریر کا کام آخری طور پر مکمل ہوا۔ اس طرح
اس کے لکھنے میں پورے سات سال لگ گئے۔ آج صبح ۳ بجے اٹھ کر
میں "تذکیر القرآن" سورۃ الناس لکھنے بیٹھ گیا۔ اس کی آخری سطریں
اس وقت پوری ہوئی جب کہ نظام الدین کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز
آرہی تھی۔

تذکیر القرآن کی تکمیل مجھے ایک خدائی معاملہ نظر آئی ہے۔ یہ میرے
لیے اتنا زیادہ مشکل کام تھا کہ اس کا ہر صفحہ لکھنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا
تھا کہ اب میں اس کا اگلا صفحہ نہیں لکھ سکوں گا۔

یکم فروری ۱۹۶۲ء کو جب کہ میں اعظم گڑھ میں تھا۔ میں نے ایک
خواب دیکھا تھا۔ اٹھا تو پورا خواب یاد نہیں رہ گیا تھا۔ صرف خواب کا ایک
جزو "۱۹ جولائی" ذہن میں باقی تھا۔ بیداری کے بعد مجھے یاد نہ رہا کہ کس
بات کی تاریخ ہے۔ صرف اتنا یاد تھا کہ میں نے خواب میں ۱۹ جولائی کی تاریخ
دیکھی ہے۔

۱۹۶۲ء کے اس خواب کے بعد ہر سال میں ۱۹ جولائی کا انتظار
کرتا رہا ہوں۔ مگر ہر سال یہی ہوا کہ جب ۱۹ جولائی آئی تو اس روز کوئی خاص

نمایاں واقعہ پیش نہیں آیا۔ اسی طرح ۲۲ سال بیت گئے۔ ۱۹۸۵ء کی ۱۹ جولائی وہ پہلی تاریخ ہے جب کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو شاید میری زندگی کا سب سے قابلِ ذکر واقعہ ہے۔ اور وہ یہ کہ عین اسی تاریخ کو میں نے تذکیر القرآن کا آخری صفحہ لکھا۔

"۱۹ جولائی" کو تذکیر القرآن کا مکمل ہونا بڑا عجیب واقعہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام تمام تر خدا کی مدد سے ہوا۔ اور عین خدا کے منصوبے کے تحت اپنی تکمیل کو پہونچا۔ یہ ایک خدائی منصوبہ تھا اور خدا ہی نے اپنے خصوصی اہتمام سے اس کو پورا کیا۔

تذکیر القرآن ایسے حالات میں مکمل ہوئی جب کہ میرے حالات بے حد خراب ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ کچھ لوگ مجھے ہلاک کرنے کے درپے تھے۔ آج جب میں نے تذکیر القرآن کو مکمل کیا تو میرے دل نے کہا ــــــ جو کام مجھے کرنا تھا وہ کام آج پورا ہو گیا۔ اب انشاء اللہ خدا کے دین پر کوئی شخص پردہ نہ ڈال سکے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔"

(الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص ۲۴-۲۹)

اس اقتباس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وحید الدین خاں صاحب نے محض ایک خواب کی بنیاد پر جس کا صرف اتنا حصہ "۱۹ جولائی" انھیں یاد رہ گیا تھا، کیا کیا ثابت کرنا چاہا ہے محض ایک موہوم سے خواب کی بنیاد پر ہر سال ۱۹ جولائی کا شدت سے انتظار اور ۱۹ جولائی کو اتفاقی طور پر تذکیر القرآن کی تصنیف مکمل ہونے یا جان بوجھ کر ۱۹ جولائی کو تذکیر القرآن کی تصنیف مکمل کرنے کی وجہ سے یہ دعویٰ کرنا کہ یہ تفسیر خدائی منصوبہ کے تحت وجود میں آئی اور اس تفسیر کے مکمل ہونے کی بنا پر "اب خدا کے دین پر کوئی پردہ نہ ڈال سکے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے" موصوف کے فکری اور دماغی توازن کے بارے میں شبہ پیدا کرتا ہے۔

ایک اور نمونہ:

وحیدالدین خاں صاحب کے ساتھ ایک بار یہ واقعہ پیش آیا کہ بارش کے موسم میں سڑک پر چلتے ہوئے ایک گڑھے میں گر پڑے، اور ان کا ہاتھ بجلی کے تار پر پڑ گیا۔ بجلی کے حادثے بار بار پیش آتے رہتے ہیں، بعض لوگ ان حادثوں میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور جن لوگوں کی زندگی کے ایام باقی رہتے ہیں وہ بجلی کے سنگین حادثوں کے باوجود جانبر ہو جاتے ہیں۔ جناب وحیدالدین صاحب کی حیات مقدر تھی اس لیے وہ اس سنگین حادثہ کے باوجود صحت یاب ہو گئے، اس سلسلہ میں انھوں نے اکتوبر ۱۹۸۳ء کے "الرسالہ" میں "دوبارہ زمین پر" کے عنوان سے ۱۹ صفحات کا مضمون لکھا، یہ مضمون ان کے دماغی عدم توازن اور فکری انتشار کا مکمل نمونہ ہے۔ یہ پورا مضمون بہر حال نقل نہیں کیا جا سکتا۔ قارئین اسے "الرسالہ" کی فائل ہی میں پڑھیں، یہاں اس مضمون کے چند اقتباسات پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ چند تمہیدی سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

> "میں اس وقت تنہا تھا کرزن روڈ سے گزر کر میں کناٹ پلیس کے علاقہ میں آیا اس کے بعد پیدل چلتے ہوئے اس سڑک پر پہونچا جس کو منٹو روڈ کہا جاتا ہے۔ میں ہلکی بارش میں برابر بھیگتا ہوا چل رہا تھا۔ اس وقت طبیعت میں نامعلوم طور پر ایک عجیب سرور تھا۔ یہ سفر میرے لیے ایک قسم کا روحانی سفر بن گیا جس نے موسم کی ناسازگاری کو میرے لیے غیر اہم بنا دیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں خدا کے فیضان میں نہاتا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں، تنہائی کے باوجود مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ کوئی عظیم قوت میرے ساتھ ہے۔ کوئی اپنی خصوصی رحمتوں کے ساتھ مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ مجھے اس وقت نہ تکان کا احساس تھا اور نہ بھیگنے کا۔ مجھ کو نہ رات کا سناٹا ستا رہا تھا اور نہ تنہا پیدل سفر کرنا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مجھے نامعلوم طور پر کسی خاص منزل کی

طرف کھینچے چلا جا رہا ہے۔

میں چلتے چلتے ریلوے پل اور اجمیری گیٹ کے درمیان پہونچا یہاں میرے بائیں طرف بجلی کا ایک کھمبا تھا، اس کھمبے کے نچلے حصہ میں بائیں طرف بجلی کے تاروں کا وہ مشترک خانہ تھا جس کو جکشن بکس (J.K. Box) کہا جاتا ہے۔ جکشن بکس کا ڈھکن غائب تھا اور وہ بالکل کھلا ہوا تھا اگرچہ سڑک پوری خالی تھی۔ مگر میں اپنی عادت کے مطابق بالکل کنارے پر چل رہا تھا۔ بجلی کے کھمبے کے پاس پہنچ کر اس کے بائیں طرف مجھے پانی نظر آیا۔ میں نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ کیونکہ بارش کی وجہ سے سڑک پر جگہ جگہ اس قسم کا معمولی پانی تھا اور میں برابر ان سے گزر رہا تھا۔ میں نے سمجھا کہ یہ ایک دو انچ سے زیادہ گہرا نہ ہوگا اور تیزی سے چلتے ہوئے اس پانی پر اپنا پاؤں رکھ دیا مگر وہ کمر برابر گہرا گڑھا تھا۔ اب میرا جسم گڑھے کے اندر تھا اور میرا دایاں ہاتھ جکشن بکس میں۔

فی الفور بجلی نے مجھے پکڑ لیا۔ یہ پکڑ ہتھیلی اور کلائی کے درمیان تھی ایک لمحہ میں میرا سارا جسم بے حرکت ہوگیا۔ میرا دایاں ہاتھ بجلی کے تاروں کے گچھے پر تھا اور بقیہ جسم بے حس و حرکت ہوکر پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گویا کہ میں بجلی کے سمندر میں نہا رہا تھا۔ ایسی حالت میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی یا تو فوراً مر جاتا ہے یا گھبراہٹ میں کچھ چیخیں نکال کر بیہوش ہو جاتا ہے، مگر بجلی کے حادثات کی تاریخ کا یہ انوکھا واقعہ ہے کہ جس وقت مجھے بجلی پکڑے ہوئے تھی اس وقت بھی میں ہوش میں تھا۔ بظاہر اگرچہ میں مر چکا تھا مگر میرا ذہن اب بھی پوری طرح حاضر تھا۔ میں تمام باتوں سے اسی طرح باخبر تھا جس طرح میں عام حالت میں باخبر رہتا ہوں۔ شاید یہ کوئی مطلوب منزل تھی، شاید میں وہیں پہنچ گیا تھا جس کی طرف مجھ کو لایا جا رہا تھا۔ یہ حالت میرے خیال کے مطابق پانچ منٹ سے زیادہ دیر تک جاری رہی۔ یہ ذہن اور جسم کی علاحدگی کا ایک لمحہ تھا۔ میں اپنے جسم سے اوپر اٹھ کر واقعات کو دیکھ رہا تھا، میں محسوس کر رہا تھا کہ

کرنٹ کا ایک بے حد تیز رفتار دھارا ہے جو میرے جسم کے اندر موجیں مار رہا ہے" ....

گرہ منٹ گزرے تھے کہ اچانک نامعلوم طور پر بجلی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میرا ہاتھ تاروں سے الگ ہو کر جنکشن بکس سے باہر آ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا میں کسی اور عالم میں تھا۔ اب دوبارہ اپنی سابقہ دنیا میں واپس آ گیا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو پانی کے گڑھے سے باہر نکالا اور قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ میرا ہاتھ کلائی سے لے کر ہتھیلی تک گہرا جل چکا تھا مگر میرا دل حیرت انگیز طور پر اس وقت بھی پُرسکون تھا ....

یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو نہ کبھی میرے ساتھ گزرا اور نہ کسی اور کے بارے میں اب تک سُننے یا پڑھنے میں آیا۔ بجلی کی مکمل گرفت میں آنے کے باوجود زندہ رہنا، جسم اور روح کا الگ الگ ہو کر پھر مل جانا، حادثہ کے دوران جسم کے مکمل طور پر بے حرکت ہو جانے کے باوجود، ذہن کا مکمل طور پر حاضر رہنا، پھر نہایت پُرسکون رہ کر یا اللہ یا اللہ کہتے رہنا، اس بات کی علامت ہے کہ یہ عام معنوں میں محض ایک حادثہ نہ تھا بلکہ ایک تجربہ تھا۔ گویا کہ انسان کی کامل بے اختیاری کو مجھے اپنی آنکھوں سے دکھایا گیا۔ میں نے انسان کی اس ہستی کو دریافت کیا جو مادی قوانین سے پرے ہے۔ اسی کے ساتھ میں نے گویا اس خدا کو براہ راست دیکھا جو قادر مطلق ہے۔ بجلی کا سوئچ دنیا میں خواہ بند نہ ہو مگر وہ اوپر سے اس کو بند کر سکتا ہے۔ شاید بجلی کے حادثات کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ اتنے کامل طور پر بجلی کی گرفت میں آ جانے کے باوجود میں موت سے بچ کر نکل آیا۔ اس دوران مجھ کو جو لطیف تجربات ہوئے اس کے اعتبار سے دیکھئے تو گویا کہ میں روحانی دنیا میں جا کر مادی دنیا میں واپس آ گیا۔ میں آسمان کے اوپر پہنچ کر دوبارہ زمین کی طرف لوٹ آیا۔ میں نے انسان کے فانی وجود کے اندر ایک باقی وجود کا تجربہ کیا ...."

جناب وحیدالدین خاں صاحب ہاتھ کے گہرے زخم کے علاج معالجہ کی طویل تفصیلات درج کرتے ہوئے صفحہ ۱۸ پر لکھتے ہیں :

"آج صبح کو مجھ پر ایک عجیب تجربہ گزرا۔ میں تذکیر القرآن میں سورۂ یونس (آیات ۲۵ - ۲۷) کی تشریح لکھ رہا تھا۔ الکٹرک برن کی وجہ سے میری کلائی زخمی ہے۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں تقریباً ۵۰ پرسنٹ میں ہاتھ اتنا کمزور ہے کہ قلم پکڑنے میں نہیں آتا۔ تاہم اسی حالت میں لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن اس وقت مجھ پر ایک لمحاتی تجربہ گزرا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں خدا کو اپنے فرشتوں سے یہ کہتے ہوئے سن رہا ہوں کہ :

"ذرا میرے بندے کو دیکھو ....."

بے اختیار دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ......"

جناب وحیدالدین خاں صاحب اپنے اس طویل مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں :

"کتاب پیغام الٰہی کا مذکورہ جملہ (سلف غیر سلف کو قبول نہیں کرتا) میرے لیے زمانۂ علالت کی ایک دلچسپ دریافت تھی جب میں اس کو مذکورہ بالا واقعہ کے ساتھ ملا کر دیکھتا ہوں جو اس کو پانے کا سبب بنا تو اس دنیوی واقعہ میں مجھے ایک اخروی حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں کچھ لمحات کے لیے خدا کے یہاں چلا گیا تھا اور وہاں سے اس کے بندوں کے لیے اس کا یہ پیغام لے کر لوٹا کہ (سلف غیر سلف کو قبول نہیں کرے گا) جس کو خدا کے پڑوس میں رہنے کی تمنا ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ خدائی اخلاقیات کو اختیار کرے، وہ اپنے آپ کو خدائی مزاج کے مطابق بنائے، ورنہ آخرت میں اس کو خدا کی دوری ملے گی نہ کہ خدا کا پڑوس۔"

(الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۳ء ص ۹-۲۴)

یہ وحیدالدین خاں صاحب کے طویل مضمون کے چند اقتباسات ہیں۔ جن سے ان کے ذہنی عدم توازن، دماغی انتشار کا پتہ چلتا ہے، اپنے ساتھ پیش آنے

والے بجلی کے ایک حادثہ سے متعلق موصوف نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی قدرت تحریر ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ذہن وحواس کی سلامتی کے بارے میں قوی شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

جناب وحید الدین خاں صاحب کی تحریروں میں خوابوں کا ذکر بھی کثرت سے ملتا ہے۔ موصوف اپنے خوابوں اور اپنے بارے میں دوسروں کے خوابوں کا بڑی اہمیت سے اپنی تحریروں میں تذکرہ کرتے ہیں اور بسا اوقات ایک معمولی خواب کو غیر معمولی اہمیت دے کر اس سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں اور اہم فیصلے کرتے ہیں۔

بلا تبصرہ

جلسہ میں شرکت کے بعد میں اپنی قیام گاہ (خانقاہ مجددیہ) واپس آچکا تھا کہ اچانک ایک صاحب آئے، بظاہر وہ بالکل سیدھے سادے قسم کے معلوم ہوتے تھے، انھوں نے مجھے ایک بند کاغذ دیا اور اس کے فوراً بعد واپس چلے گئے۔ انھوں نے نہ مزید کچھ کہا اور نہ وہاں ٹھہرے۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے کاغذ کو کھولا تو اس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

"حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی طرف سے سلام قبول ہو"

اوپر میں نے جو کچھ نقل کیا ہے اس سے زیادہ مجھے اس کے بارے میں اور کچھ نہیں معلوم ہے۔

(الرسالہ اپریل ۱۹۸۶ء ص ۳۹)

وحیدالدین خاں صاحب کے

تناقضات

وحیدالدین خاں صاحب کی تحریروں کا مطالعہ کرنے والے بخوبی واقف ہیں کہ ان کے افکار وخیالات اور نظریات میں بڑا انتشار اور تضاد پایا جاتا ہے ان کے خیالات میں یگانگت اور ہم آہنگی کا بہت فقدان ہے۔ موصوف ایک ہی موضوع کے بارے میں متضاد نظریات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ جس مسئلہ کے بارے میں جو رائے جس وقت ان کے لیے مفید مطلب ہوتی ہے اسے اختیار کرتے ہیں، ان کے افکار وخیالات میں اس تضاد کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ موصوف کسی اہم سے اہم موضوع پر بھی (خواہ دینی موضوع ہو یا تاریخی یا سیاسی) سنجیدہ غور و فکر اور وسیع وعمیق مطالعہ کے عادی نہیں ہیں، موضوع کے تمام گوشوں پر غور و فکر کرنے کے بجائے اس کا جو پہلو کسی وقت ان کے ذہن پر حاوی ہوجاتا ہے اسی کو اختیار کر لیتے ہیں، ہر مہینہ 'الرسالہ' کا پیٹ بھرنا رہتا ہے اور ہر موضوع پر لکھنا ہوتا ہے اس لیے کسی اہم سے اہم موضوع پر سنجیدہ غور و فکر اور بھرپور مطالعہ اور تیاری کا انھیں موقع نہیں ملتا ہے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں سطحیت اور تضاد کا پایا جانا فطری بات ہے۔ موصوف کے تمام ادوار کی تحریریں جن لوگوں کی نظر میں ہیں وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ 'الرسالہ' جاری کرنے کے بعد سے ان کے خیالات میں انتشار و تضاد اور مضامین میں سطحیت کی مقدار بہت بڑھ گئی ہے۔ ذیل میں ہم نمونہ کے طور پر ان کے کچھ متضاد خیالات پیش کرتے ہیں:

علم حدیث کی تدوین:

اللہ تعالیٰ نے اپنے غیبی نظام کے تحت علوم اسلامیہ (حدیث و فقہ وغیرہ) کی جس طرح تدوین کرائی اس سے کوئی بہتر صورت ان علوم کے تدوین کی نہیں ہوسکتی تھی۔ جلیل القدر محدثین و فقہاء نے خلفاء و سلاطین کے درباروں سے دور رہ کر پوری محنت، اخلاص اور آزادی کے ساتھ حدیث و فقہ کو مدون کیا۔ خلفاء کے زیر اثر اگر ان علوم کی تدوین ہوتی تو غالباً ان علوم پر حکمرانوں کے خیالات و رجحانات کا سایہ ضرور پڑتا اور علوم اسلامیہ کا یہ ذخیرہ اتنا مستند نہ ہوتا جتنا کہ وہ موجودہ شکل میں ہے۔ بعض دینی اور فقہی آراء کی وجہ سے جلیل القدر ائمہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد بن حنبل وغیرہم کا اپنے معاصر خلفاء کے یہاں معتوب ہوکر سزایاب ہونا تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

علوم اسلامیہ حدیث و فقہ وغیرہ کی تدوین خلفاء کے زیر سایہ ہونی چاہیے تھی یا ان کے اثرات سے علاحدہ ہوکر، اس سلسلہ میں جناب وحید الدین خاں صاحب نے متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کے یہ خیالات انھیں کے الفاظ میں پیش کیے جارہے ہیں۔

موصوف اپنی مشہور کتاب "تجدید دین" میں لکھتے ہیں:

> "وہ علوم جو اجتماعی اہمیت کے حامل ہیں ان کی تدوین اجتماعی سطح ہی پر ہونا چاہیے، تاکہ پوری ملت کے اندر ان کو مستند مقام حاصل ہو اور سارے لوگ ان کو قبول کرسکیں۔ حضرت ابوبکر صدیق کے زمانہ میں جب ریاست کے تحت قرآن کے جمع و تدوین کا کام انجام دیا گیا اور اس کے بعد جو نسخے بچے انھیں جلا دیا گیا تو اس کے اندر یہی حکمت تھی، جمع قرآن کا کام اگر انفرادی شخصیتوں کے ذریعہ انجام پاتا تو سخت اختلاف ہوجاتا اور پھر قیامت تک ختم نہ ہوتا۔

حدیث کی جمع و تدوین کے لیے بھی حضرت عمر بن عبد العزیز نے غالباً یہی منصوبہ بنایا تھا۔ انھوں نے مدینہ کے گورنر محمد بن عمرو بن حزم اور دوسرے لوگوں کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث اور سنت لوگوں کو ملے ان کو جمع کر کے ضبط تحریر میں لائیں۔ مگر ان کی جلد وفات کی وجہ سے خلافت کی ماتحتی میں یہ کام نہ انجام پا سکا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ لوگ "ثواب" کے جذبہ کے تحت انفرادی طور پر اس کو کرنے میں لگ گئے۔ بہتر طریقہ یہ تھا کہ محدثین 'خلفاء کے ذریعہ جو ان کے بے حد عقیدت مند تھے سرکاری انتظام کے تحت ایک ادارہ قائم کراتے جس میں محدثین کی منتخب جماعت اکٹھا ہو کر حدیث کی جمع و تدوین کے سلسلہ میں وہی کرتی جو قرآن کے سلسلہ میں حضرت زید بن ثابت اور ان کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ اگر آغاز ہی میں معتبر احادیث کا ایک مجموعہ تیار کر کے باقی تمام "احادیث" کو نذر آتش کر دیا جاتا تو امت بے شمار فتنوں سے بچ جاتی، فقہ کی تدوین کے سلسلہ میں بھی صحیح طریقہ اسی اسوۂ صدیقی پر عمل کرنا تھا، بجائے اس کے کہ مختلف فقہاء الگ الگ اپنا مدرسۂ فکر لے کر بیٹھ جائیں اور ایک خداوندی مذہب کو دس الگ الگ مذاہب میں تبدیل کر ڈالیں۔"

(تجدید دین، ص ۳۹)

"تدوین حدیث ہی کے موضوع پر وحید الدین خاں صاحب کی دوسری تحریر پڑھیے اور انتشار ذہنی کا مشاہدہ کیجیے:

"حدیث کی جمع و تدوین کے کام کا آغاز حضرت عمر بن عبد العزیز (۶۲ - ۱۰۱ھ) نے اپنے زمانۂ خلافت میں کیا، مگر آپ کی خلافت کی مدت صرف ڈھائی سال رہی، اس لیے آپ اس کام کی تکمیل نہ فرما سکے اور اس دنیا سے چلے گئے۔ آپ کے بعد خلافت کا ادارہ دنیا دار بادشاہوں کے قبضہ میں آ گیا۔ دوسری صدی ہجری میں محدثین نے حدیث کی تدوین کا کام

شروع کیا تو انھوں نے انتہائی دیانت داری کے ساتھ ہر قسم کی روایتیں جمع کرنی شروع کیں اور اس کا مطلق لحاظ نہ کیا کہ کون سی روایت کس کے موافق پڑتی ہے اور کس کے خلاف، قدرتی طور پر وقت کے مسلم سلاطین کو یہ بات ناگوار تھی، کیونکہ حدیث کے دفتر میں بہت سی ایسی روایتیں بھی محفوظ ہو رہی تھیں جن کی زد ان کی عیش پرستی اور ان کی ظالمانہ سیاست پر پڑتی تھی، اس بنا پر حدیث کو وہ اپنے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ سمجھنے لگے، انھوں نے چاہا کہ حدیث کی جمع و تدوین کا کام ان کی سرپرستی میں ہوتا کہ اس کو اپنی مصلحتوں کے مطابق ڈھالا جا سکے، مگر محدثین نے اس مقدس کام میں کسی بھی قسم کے شاہی اثر و نفوذ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ تھی اصل بات جس کی وجہ سے وقت کے حکمراں محدثین کرام سے خوش نہ تھے۔" (الرسالہ اپریل ۱۹۸۲ء، ص ۳۵)

۲۔ جدید تعلیم کے بارے میں علماء کا موقف:

جدید تعلیم کے بارے میں علماء اور بزرگوں کا کیا موقف رہا اور اس موقف میں یہ لوگ کس قدر حق بجانب تھے اس سلسلہ میں وحیدالدین خاں صاحب کا ایک مضمون "جدید تعلیم حاصل کرنے کا مسئلہ" کے عنوان سے شائع ہوا جو 'الفرقان' کے گیارہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس مضمون میں انھوں نے جدید تعلیم حاصل کرنے کے سلسلہ میں علماء کا صحیح موقف پیش کیا ہے اور اس کا بھرپور دفاع کیا ہے۔ مضمون کے آغاز میں موصوف لکھتے ہیں:

"علماء وقت کے تقاضوں کو نہیں پہچانتے، وہ قدامت پرست اور دقیانوسی ہیں۔"

یہ علماء کے اوپر جدید طبقہ کا ایک عام اعتراض ہے ان کے نزدیک اس کی ایک بہت واضح مثال یہ ہے کہ علماء انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم کو جائز نہیں سمجھتے جب کہ کسی زبان اور کسی علم میں کوئی خرابی نہیں، اور موجودہ زمانہ میں

تو یہ زبان اور یہ علم کسی قوم کی ترقی اور سربلندی کے لیے بالکل ضروری ہو گئے ہیں۔

یہ علماء کے بارے میں ایک عام بات ہے، مگر یہ بات جتنی عام ہے اتنی ہی غلط ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بھی واقعی عالم ایسا موجود نہیں ہے اور نہ کبھی موجود تھا، جو نفس تعلیم جدید یا نفس انگریزی زبان کی تحصیل کو حرام سمجھتا ہو۔ اگر کوئی شخص علماء کی طرف اس بات کو منسوب کرتا ہے کہ وہ علوم جدیدہ کی مجرد تحصیل کے مخالف ہیں تو یہ ایک سراسر غلط الزام ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ علماء کی مخالفت باعتبار تعلیم نہیں بلکہ باعتبار انجام ہے یعنی وہ اصلاً تعلیم جدید کے مخالف نہیں ہیں بلکہ اس انجام کے مخالف ہیں جو عموماً اس تعلیم کے بعد نوجوانوں میں پیدا ہو جاتا ہے اور پھر زندگی بھر قائم رہتا ہے، اسی عمومی انجام کو دیکھ کر انھوں نے مسلم نوجوانوں کو اس تعلیم سے روکنا شروع کر دیا، اگر ایسا نہ ہو تو ہرگز وہ اس سے روکنے کی ضرورت نہ سمجھیں، بلکہ اس کی ترغیب دلانے والے بن جائیں۔

مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے سامنے یہ سوال آیا کہ "تحصیل علم منطق وانگریزی مثلاً شخصے اشتغال آں دارد بر جواز و عدم آں چہ حکم است۔ آپ نے اس کا جواب اس اصول کی روشنی میں دیا کہ "للآلۃ حکم ذی الآلۃ"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ،

انگریزی زبان سیکھنے کے بارے میں آپ نے لکھا :

"انگریزی تعلیم یعنی اس کے لکھنے کا طریقہ جاننا، اس کی زبان اور اصطلاح کو سمجھنا کوئی جرم نہیں رکھتا بشرطیکہ صرف مباح کی نیت سے ایسا کرے، کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے موافق زید بن ثابتؓ نے یہود و نصاریٰ کے خط و کتابت کا طریقہ اور ان کی زبان سیکھی تھی تاکہ اگر آنحضرتؐ کی خدمت میں اس زبان اور رسم خط میں کوئی مراسلہ آئے تو اس کا جواب لکھ سکیں، اور اگر صرف ان کو خوش کرنے کی غرض سے اور ان

سے اختلاط رکھنے کے لیے اس زبان کو سیکھے اور اس ذریعہ سے ان کے یہاں تقرب حاصل کرنا چاہے تو البتہ اس میں حرمت و کراہت ہے"

(مجموعہ فتاوی عزیزی ج ۲ ص ۱۹۵)

کسی علم میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں ہوتی اور نہ کوئی زبان محض زبان ہونے کی حیثیت سے غلط ہوتی ہے، تاہم ہر زبان اور ہر علم کسی نہ کسی انسانی گروہ سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہ انسانی گروہ اگر خیر پسند ہو تو اس کی زبان اور اس کے علم پر خیر پسندی کی روح چھائی ہوئی ہوگی اور اگر وہ شر پسند ہے تو اس کی زبان اور اس کے علوم بھی اسی قسم کی فضا رکھتے ہوں گے، دوسرے لفظوں میں ہر زبان اور ہر علم اپنے ساتھ ایک تہذیب بھی رکھتا ہے، اگر زبان و علوم کو اس کی تہذیب سے الگ کر کے لیا جائے تو وہ خالص علمی چیز ہوگی البتہ اگر علم کے ساتھ اس کے اندر لپٹی ہوئی تہذیب کو بھی قبول کر لیا جائے تو گمراہ اقوام کی تہذیب ہونے کی صورت میں یہی چیز مضر اور قابل اجتناب بن جاتی ہے، زبان و علوم میں تہذیب کے اثرات مختلف راستوں سے داخل ہوتے ہیں۔ یہاں میں اس کی چند مثالیں دوں گا"

(الفرقان اگست ۱۹۶۲ء ص ۲۲ تا ۲۵)

اس کے بعد وحید الدین خاں صاحب نے بہت تفصیل کے ساتھ زبان و علوم کی تہہ میں مضر اعتقادی و تہذیبی اثرات کی وضاحت کی ہے اور بڑے اطمینان بخش دلائل سے اپنی بات ثابت کی ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے جدید تعلیم کے بارے میں علماء اور بزرگوں کے موقف کی بھرپور وکالت کی ہے اور اسے صحیح ثابت کیا ہے۔

جدید تعلیم کے بارے میں علماء کا موقف کیا رہا ہے، یہ ایک تاریخی اور فکری موضوع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے بابصیرت علماء اور بزرگوں نے جدید تعلیم خصوصاً سائنس، ٹکنالوجی اور مغربی زبانوں کی مطلق طور پر کبھی مخالفت نہیں کی، لیکن جدید تعلیم کا جو نظام انگریزوں کے زیر سایہ پروان چڑھا، اس کی راہ سے ملحدانہ

افکار و خیالات، غیر اسلامی تہذیب و ثقافت اور فاسد عقائد کا جو سیلاب نوجوانوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا اس کی زد سے نئی نسل کے دل و دماغ کو محفوظ رکھنا علماء کی اہم ترین ذمہ داری تھی۔ علماء کی طرف سے جدید تعلیم کی مخالفت کا جو افسانہ بڑے زور و شور کے ساتھ پھیلایا گیا اس کی تردید خود تعلیم جدید کی ایک نمائندہ شخصیت قاضی محمد عدیل عباسی کے قلم سے پڑھیے۔ موصوف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مایۂ ناز فرزند اور ممتاز سیاسی اور صحافی تھے، انھوں نے اپنی کتاب "تحریک خلافت" میں لکھا ہے:

"انگریزوں نے اپنے پروپگنڈہ کی فنکاری کے مظاہرے سے یہاں بھی تساہلی نہیں برتی اور اپنے ریزہ چینوں کے معرفت یہ مشہور کر دیا کہ علماء نے سرسید پر جو کفر کا فتویٰ دیا تھا وہ اس لیے تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم سے متنفر تھے، میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کذب صریح ہے۔ انگریزی زبان، علوم جدیدہ اور سائنس وغیرہ کی تعلیم حاصل کرنے کی کسی عالم نے کوئی مخالفت نہیں کی۔ سید جمال الدین افغانی جس نے سرسید پر برملا کفر کا فتویٰ دیا تھا خود ان علوم کی تعلیم کا زبردست مبلغ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ سرسید جس طرح قرآن پاک کی تفسیر کرتے تھے اور پھر جس طرح مسلمانوں کو انگریزوں کے قدموں میں اس وقت ڈال رہے تھے جب دنیا میں اسلام کی تباہی کا انگریز زبردست جال بچھا رہا تھا، ان سے علماء حق نے بیزاری ظاہر کی تھی ...... اس مسئلہ میں ایک ایسے عظیم ترین عالم و محقق و عارف کی رائے ذیل میں درج کی جاتی ہے جس کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کی بنیاد رکھنے کے لیے جو اجتماع کیا گیا تھا اس کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبہ میں فرمایا: آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔" (تحریک خلافت ص ۶۲)

جدید تعلیم کے مسئلہ میں علماء اور بزرگوں کے موقف کی تحسین اور وکالت کرنے کے بعد ادھر چند سالوں سے وحید الدین خاں صاحب نے جدید تعلیم کے بارے میں علماء کے موقف کو طنز و تعریض کا نشانہ بنالیا ہے اور اپنا وہ مدلل مضمون فراموش کر بیٹھے ہیں جو اگست ۱۹۶۶ء کے 'الفرقان' میں انھوں نے لکھا تھا، موصوف کے موجودہ نقطۂ نظر کی ترجمانی کرنے والی ان کی چند تحریریں ملاحظہ ہوں:

"جن بزرگوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روکا وہ اگرچہ نیک نیت تھے، مگر ان کی غلطی یہ تھی کہ وہ جدید تعلیم کی نوعیت کو سمجھ نہیں سکے۔ مثال کے طور پر اگر وہ کمیونزم کی تعلیم سے روکتے تو یہ صحیح ہوتا کیونکہ کمیونزم ذہن کے فساد کا دوسرا نام ہے، مگر انھوں نے سائنس کی تعلیم سے بھی مسلمانوں کو دور رکھنے کی کوشش کی، حالانکہ سائنس موجودہ زمانہ میں قوت کے ہم معنی تھی۔ سائنس کی تعلیم میں پیچھے ہونے کی وجہ سے مسلمان دور جدید میں کم از کم سو سال پیچھے ہو گئے۔ مسلمانوں کے پاس اگرچہ قدرتی ذخائر کی کثرت ہے، مگر دوسری قومیں ان کا استحصال کر رہی ہیں اور اپنی تعلیمی پسماندگی کی وجہ سے وہ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔" (الرسالہ فروری ۱۹۸۵ء ص ۳۶، ۳۷)

"موجودہ زمانہ میں ملک کے اندر بے شمار اسکول اور کالج کھلے۔ انھیں عیسائیوں اور ہندوؤں نے قائم کیا تھا، مگر مسلمان تحفظ کے ذہن کے تحت اس سے دور رہے۔ انھوں نے کہا کہ دوسری قوموں کی طرف سے ہمارے اوپر تہذیبی حملہ ہو رہا ہے، ہمیں اس سے بچاؤ کی فکر کرنی چاہیے۔ بہت سے لوگوں نے ان اسکولوں اور کالجوں کو مسلمانوں کے لیے قتل گاہ بتایا۔ اکبر الٰہ آبادی نے ان پر طنز کرتے ہوئے کہا:

بچوں کے کبھی قتل سے بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

یہ فکر میرے نزدیک سراسر لغو تھا۔ بعد کے تجربات بتاتے ہیں کہ انھیں اسکولوں اور کالجوں سے بے شمار لوگ ہماری دینی جماعتوں کو ملے۔ اگر یہ ادارے واقعۃً "قتل گاہ" ہوتے تو یہ تمام لوگ ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے قتل ہو چکے ہوتے، پھر وہ ہماری دینی جماعتوں کو کیسے ملتے۔"

(الرسالہ ستمبر ۱۹۸۹ء ص ۳۸، ۳۹)

"موجودہ زمانہ میں جو مسلم علماء قیادت کے لیے اٹھے ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ انگریزی زبان یا کسی اور مغربی زبان سے ناواقف تھے۔ مزید یہ کہ انھوں نے انگریزی تعلیم کا مسلسل اس طرح استخفاف کیا کہ قوم کے دوسرے لوگ بھی بہت کم انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہو سکے، اور جو شخص انگریزی تعلیم کی طرف گیا وہ بھی یہ سمجھ کر گیا کہ وہ علماء سے اور ان کے مذہب سے باغی ہو کر انگریزی تعلیم کی طرف جا رہا ہے۔ اس انحراف کے بعد وہ علماء کے کام نہیں آسکتا تھا اور نہ وہ ان کے کام آیا۔"

(الرسالہ اگست ۱۹۸۸ء ص ۲۲)

وحید الدین خاں صاحب کی انتشارِ ذہنی اور فکری تضاد کا ایک دلچسپ نمونہ ہندوستان میں برپا ہونے والے ہندو مسلم فسادات کے بارے میں وحید الدین صاحب کے خیالات ہیں۔ ان خیالات کو ہم نے مستقل عنوان کے تحت اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ یہاں پر ہم دوبارہ اس کا اعادہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہاں موصوف کے فکری تضاد کا ایک اور دلچسپ نمونہ قلمبند کر کے اس موضوع کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

۳۔ سیکولرزم ــــ ابدی صلح حدیبیہ:

اس وقت دنیا میں سیکولرزم کا چرچا ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک اپنے کو سیکولر ملک قرار دیتے ہیں، خواہ مذہبی اقلیتوں کے ساتھ ان کا رویہ کتنا ہی ظالمانہ اور سفاکانہ ہو۔ اسلامیات کا مطالعہ رکھنے والا کوئی شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا ہے کہ اسلام کا سیکولرزم سے بھی کوئی رشتہ اور رابطہ ہے۔ لیکن جناب وحید الدین خاں صاحب

نے پوری ذہانت اور نکتہ رسی کے ساتھ اسلام اور سیکولرزم میں قدر مشترک تلاش ہی کرلی، سیکولرزم کے بارے میں ان کے تازہ ترخیالات کو پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ بیس سال پہلے انھوں نے سیکولرزم کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، انھیں بھی قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے 'الفرقان' کے اپریل و مئی ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں "حالات بدل سکتے ہیں" کے عنوان سے ایک مفصل مضمون لکھا تھا جس میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ موجودہ حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کو جو مشکلات اور چیلنج درپیش ہیں ان کا واقعی حل کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ان سیاسی تدبیروں کا ابتدا ہی میں جائزہ لیا تھا جو مشکلات کے حل کے لیے عموماً پیش کی جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے "آئینی مطالبہ" کے ذیلی عنوان کے تحت لکھا ہے:

> "کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں جو حکومت قائم ہے وہ ایک سیکولر اور جمہوری آئین کے تحت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے ہر فرد اور ہر فرقے کو تمام جائز انسانی حقوق یکساں طور پر حاصل ہیں۔ ان حقوق کی خاطر جدوجہد کرنے کے بھی تمام قانونی مواقع کھلے ہوئے ہیں، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بارے میں جس قسم کی ناانصافیاں دیکھ رہے ہیں ان کے خلاف آئینی جدوجہد کریں ان کو دور کرنے کے لیے قانونی مطالبات کی مہم چلائیں۔ مگر اس حل کے مجوزین کے متعلق میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ وہ الفاظ کی دنیا میں رہتے ہیں اور حقیقت کی دنیا کی انھیں کچھ زیادہ خبر نہیں ہے۔ ان کا خیال شاید یہ ہے کہ ارباب اقتدار اس آئین کی دفعات کو بھول گئے ہیں جس کو انھوں نے ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو نافذ کیا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ اس آئین کی موجودگی میں مسلم اقلیت پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں، اگر مسلمان ایک بار اپنے

حکمرانوں کو آئین کی یہ مقدس دفعات یاد دلائیں تو حکومت کی مشنری بالکل دوسری سمت میں حرکت کرنے لگے گی، اور جس حکومت کا حال یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ وہ اقلیت کو لوٹنے اور ذبح کرنے کے لیے کھلم کھلا فسادیوں اور بلوائیوں کا ساتھ دیتی ہے وہ مظلوم اقلیت کی پشت پناہ بن کر کھڑی ہو جائے گی کیونکہ آئین کے الفاظ کا تقاضا یہی ہے۔

مگر افسوس کہ واقعات اس خوش گمانی کی تصدیق نہیں کرتے۔ ہر وہ شخص جس کی آنکھوں پر کسی قسم کی پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے اب اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی اتفاقی غفلت کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ سوچا سمجھا ہوا ایک ہمہ گیر منصوبہ ہے، جو مختلف طریقوں سے بالارادہ عمل میں لایا جا رہا ہے۔ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ قانونی تحفظ کی یہ سنہری دفعات دراصل ہمارے تحفظ کے لیے نہیں ہیں، بلکہ وہ الفاظ کا ایک پردہ ہے جو عدم تحفظ کی واقعی صورت حال کو چھپانے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں قانونی مطالبات کی مہم گویا ظالم سے خود اس کے ظلم کے خلاف فریاد کرنا ہے۔ ایک شخص جو اپنی طاقت کے بل پر فیصلہ کر چکا ہے کہ وہ آپ کو قتل کرے گا، اس سے دس سال پہلے کے چند الفاظ یاد دلا کر کہنا ہے کہ تم مجھے قتل نہ کرو۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوششوں کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ سالہا سال کی جد و جہد کے بعد جب آپ اپنا پیغام اس کے کانوں تک پہونچانے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ جواب میں کچھ دوسرے الفاظ بول دے اور اپنا منصوبہ بدستور جاری رکھے۔"

(ماہنامہ الفرقان اپریل و مئی ۱۹۶۴ء ص ۲۴-۲۵)

ہندوستانی سیکولرزم کے بارے میں جناب وحیدالدین خاں صاحب کے خیالات تقریباً ۲۶ سال پرانے ہیں۔ ۲۶ سال کی مدت میں افکار و خیالات کی دنیا میں

کتنے انقلابات پیدا ہوتے ہیں، اس لیے اگر اتنے طویل عرصہ کے بعد خیالات میں کوئی تبدیلی محسوس کی جائے تو یہ کوئی قابلِ حیرت بات نہیں ہے۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں، کانگریسی حکومت کا رویہ اب بھی وہی ہے جو ۲۶ سال پہلے تھا۔ مسلم کُش فسادات کی رفتار میں تیزی آگئی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف تعصّب و نفرت میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود ہندوستانی سیکولرزم کی تصویر تابناک اور بے داغ کس طرح ہو گئی۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ دہلی میں طویل قیام کے دوران وحید الدین خاں صاحب کو سیکولرزم خوب راس آگیا اور ہندوستانی سیکولرزم کے بارے میں انھیں جو غلط فہمیاں تھیں وہ ایک ایک کرکے دور ہو گئیں۔ اس لیے انھوں نے بڑے زور و شور کے ساتھ سیکولرزم کا دفاع شروع کیا اور ترقی کرتے کرتے ان کے خیالات اس مقام تک پہونچے کہ انھوں نے سیکولرزم کو "ابدی صلح حدیبیہ" قرار دے دیا۔ موصوف فروری سنہ ۱۹۹۰ء کے "الرسالہ" میں لکھتے ہیں:

> "موجودہ زمانہ کے اسلام پسند لوگ سیکولرزم کو اسلام کا دشمن نظریہ سمجھتے ہیں اور غیر ضروری طور پر اس کی مخالفت کرتے ہیں، حالانکہ یہ عین صلح حدیبیہ کے مثل ایک واقعہ ہے۔ حدیبیہ کا واقعہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ تھا کہ وقت کے اقتدار نے دس سال کے لیے اپنے آپ کو اس کا پابند کر لیا تھا کہ وہ اسلامی دعوت کے مقابلہ میں عدم مداخلت کی پالیسی پر کاربند رہے گا۔ عین یہی موجودہ زمانہ میں سیکولر حکومت کا مطلب بھی ہے۔ موجودہ زمانہ میں جدید افکار کے زیر اثر دنیا کی تمام حکومتوں نے اپنے آپ کو اس کا پابند کیا ہے کہ وہ مذہب کے معاملہ میں عدم مداخلت کا طریقہ اختیار کریں گے۔ اقوام متحدہ کی سطح پر اس عالمی عہد کا نام حقوق انسانی کا منشور ہے۔ یہ صورت حال گویا "ابدی صلح حدیبیہ" ہے۔ دونوں کے درمیان

"جدید اسپرٹ" مشترک طور پر موجود ہے۔ مگر اس مشابہت کو نہ جاننے کی وجہ سے لوگ اس کے خلاف بھڑک اٹھے"۔

(الرسالہ فروری ۱۹۹۰ء ص ۱۳)

اوپر کے صفحات میں جناب وحید الدین خاں صاحب کے انتشار ذہنی اور تضاد فکری کے چند نمونے پیش کیے گئے۔ اگر ان کے متضاد اور ناہموار افکار و خیالات کو یکجا کیا جائے تو پوری کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کے تفسیری حصہ میں موصوف کے تضادات کے کچھ اور نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔

معمر قذافی اور وحید الدین خاں صاحب

سربراہانِ مملکت میں لیبیا کے معمر قذافی کی شخصیت اپنا مخصوص رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔ ان کے غیر متوازن بیانات، ناہموار افکار اور پریشاں خیالات ان کی تہہ در تہہ شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ معمر قذافی نے کمیونزم، جمہوریت، سوشلزم، اباحیت وغیرہ کے مختلف اجزاء کو جمع کر کے ایک نیا عالمی نظریہ تشکیل دینا چاہا ہے، جس کے خدوخال زیادہ واضح نہیں ہیں اور یہ نظریہ اپنے بے ہنگم غیر مربوط اجزاء کی بنا پر نظریہ ساز کی پریشاں خیالی اور فکری عدم توازن کی غمازی کرتا ہے۔

سربراہانِ مملکت میں جناب وحید الدین خاں صاحب کو معمر قذافی سے قربت و عقیدت ہے۔ لیبیا ہی کے ذریعہ وحید الدین خاں صاحب کا بلادِ عربیہ میں تعارف ہوا، اور بلادِ عربیہ میں سب سے زیادہ انھوں نے لیبیا ہی کے اسفار کیے۔ "مادی" نقطۂ نظر سے موصوف کا معمر قذافی سے رابطہ زیادہ قابلِ اعتراض نہ ہوتا لیکن حیرت اس پر ہے کہ یہ رابطہ نظریاتی ہم آہنگی تک پہنچ گیا اور وحید الدین خاں صاحب نے ہندوستان میں معمر قذافی کے افکار کا پرچار شروع کر دیا۔ "الکتاب الأخضر" معمر قذافی کی وہ کتاب ہے جس میں انھوں نے اپنے سیاسی، معاشی اور سماجی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وحید الدین خاں صاحب نے "کتاب سبز" کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے ادارہ الدار العلمیہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶ سے شائع کرایا۔

'الرسالہ' کی فائلیں اٹھا کر دیکھ لی جائیں، اگست ۱۹۷۶ء کے شمارہ سے لے کر مئی ۱۹۸۰ء کے شمارے تک ماہنامہ الرسالہ کے آخری صفحہ پر وحید الدین خاں صاحب کے ادارے الدار العلمیہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان دہلی ۶ کی طرف سے 'کتاب سبز' کا اشتہار پابندی کے ساتھ ملے گا۔ بڑی آب و تاب کے ساتھ یہ اشتہار 'الرسالہ' کے آخری صفحہ پر شائع ہوتا رہا، اشتہار کا ایک پیراگراف یہ ہے :

> "جمہوریۂ لیبیا کے صدر معمر القذافی ایک انقلابی مفکر اور عہد ساز شخصیت ہیں۔ انھوں نے اپنے خیالات کو "الکتاب الأخضر" میں واضح کیا ہے۔ اس کتاب کے پہلے جزء کا اردو ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔ یہ جزء معمر القذافی کے تشکیل کردہ "تیسرے عالمی نظریہ" کے سیاسی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔" (الرسالہ مئی ۱۹۸۰ء آخری صفحہ)

افسوس ہے کہ "الکتاب الأخضر" کا اردو ترجمہ جو وحید الدین خاں صاحب نے شائع کیا ہے ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ لیکن اصل عربی کتاب ہمارے پیش نظر ہے۔ حیرت ہے کہ ماہنامہ 'الرسالہ' جو وحید الدین خاں صاحب کے بقول "پیامِ حق" کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے جاری کیا گیا۔ اس ماہنامہ میں معمر قذافی کی "الکتاب الأخضر" کے لیے گنجائش کہاں سے نکل سکی۔ الکتاب الأخضر نہ صرف سوشلزم، کمیونزم اور اباحیت کے متعفن نظریات کا ملغوبہ ہے بلکہ اس کتاب میں کھلے ہوئے ملحدانہ اور اسلام دشمن نظریات پائے جاتے ہیں، وحید الدین خاں صاحب جیسے "داعیِ اسلام" کے قلم سے "الکتاب الأخضر" کا ترجمہ اور ان کے ادارے الدار العلمیہ کی جانب سے اس کی اشاعت اور 'الرسالہ' جیسے دعوتِ اسلامی کے علمبردار ماہنامہ میں اس کے اشتہار یہ سب باتیں ناقابلِ یقین نظر آتی ہیں۔ لیکن اس مادی دنیا میں ایسے ناقابلِ یقین واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں، اس لیے کوئی زیادہ حیرت کی بات نہیں۔

الکتاب الأخضر میں تین فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں سیاسی نظریہ اور

نظام پیش کیا گیا ہے۔ دوسری فصل اقتصادی مشکلات سے بحث کرتی ہے، اور تیسری فصل تیسرے عالمی نظریہ کے سماجی نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہے۔ پوری کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ معمر القذافی کے خیالات، کمیونزم اور اباحیت کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، یہ نظریات سراسر ملحدانہ ہیں، اسلام سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، وہی کمیونزم جو اب مکمل طور سے فیل ہو چکا ہے اور اس کے اصل وطن روس ہی سے اس کا جنازہ نکل چکا ہے، اس کی ترجمانی اس کتاب میں ملتی ہے۔ اس کتاب میں جس اشتراکی نظام کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اس میں وہی ساری بے اعتدالیاں کچھ اضافے کے ساتھ موجود ہیں جو کارل مارکس اور لینن کے نظریات میں پائے جاتے ہیں، مثلاً لکھتے ہیں:

> "مکان، فرد اور خاندان کی بنیادی ضرورت ہے، لہٰذا کسی کا رہائشی مکان دوسرے کی ملکیت نہیں ہو سکتا، جو انسان دوسرے کے مکان میں کرایہ دے کر یا بغیر کرایہ کے رہتا ہو اسے آزادی حاصل نہیں ہے .... کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کرایہ پر دینے کے لیے ایسا مکان تعمیر کرے جو اس کی اور اس کے ورثاء کی رہائش سے فاضل ہو۔" (ص ۱۶ ـ ۱۷)

آراضی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "زمین کسی کی ملکیت نہیں ہے، لیکن ہر شخص کو یہ حق ہے کہ اپنی اور اپنے ورثاء کی حیات تک اپنی مخصوص جد و جہد کے دائرے میں زمینوں سے نفع اٹھانے کے لیے انھیں استعمال کرے، کاشت کر کے یا مویشیوں کو چرا کر یا کسی اور صورت میں۔ اجرت دے کر یا بغیر اجرت کے زمین میں دوسروں سے کام لینا درست نہیں ہے۔ کیونکہ اگر زمین کی ملکیت تسلیم کر لی جائے تو جو لوگ موجود نہیں ہیں انھیں زمین میں حصہ نہیں ملے گا۔ (ص ۱۸-۱۹)

معمر القذافی نے خاندان اور سماج کے تعلق سے اپنے جو نظریات پیش کیے

ہیں ان میں بھی بکثرت غیر اسلامی اجزاء شامل ہیں، مثلاً ایک پیراگراف ملاحظہ ہو لکھتے ہیں:

"مرد عورت میں سے کسی ایک کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے سے اس کی مرضی کے بغیر شادی کرے یا ایک دوسرے کو طلاق دے، سوائے اس کے کہ منصفانہ عدالتی کارروائی کے بعد طلاق دی جائے۔ یا مرد و عورت عدالتی کارروائی کے بغیر طلاق پر راضی ہوجائیں، یا عورت باہمی رضامندی سے طلاق حاصل کیے بغیر دوسری شادی کرلے، یا مرد پہلی بیوی کی رضامندی یا اسے طلاق دیے بغیر کہیں شادی کرلے۔" (ص ۴۷)

معمر القذافی کی لادینیت اس بات سے بھی روشن ہوجاتی ہے کہ انھوں نے نماز کو ورزش قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو الکتاب الاخضر کا صفحہ ۸۵، ۸۶

بہرحال ایک داعیٔ اسلام کے قلم سے معمر القذافی کے ملحدانہ افکار و خیالات کی ترجمانی اور تشہیر ناقابلِ فہم ہے۔ خدا جانے کیا وہ محرکات تھے جنھوں نے وحید الدین خاں صاحب کو معمر القذافی کی کتاب کا ترجمہ اور ان کے خیالات کی تشہیر پر آمادہ کیا، مجھے معمر القذافی اور وحید الدین خاں صاحب میں اگر کوئی چیز مشترک نظر آتی ہے تو یہ دونوں کے افکار و خیالات کا عدم توازن اور بے ربطی ہے، دونوں نے اپنے اپنے میدانوں میں پریشان خیالی، فکری انتشار اور شذوذ کا مظاہرہ کیا ہے۔ دونوں کے چونکا دینے والے خیالات اپنے اپنے میدانوں میں عجوبہ ثابت ہوئے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جناب وحید الدین خاں صاحب دینی حلقہ کے معمر القذافی ہیں، یہی ان دونوں کے درمیان نقطۂ اتحاد ہے۔

نامناسب تعبیریں

جناب وحیدالدین خانصاحب نے اپنی تحریروں میں کثرت سے ایسی تعبیرات استعمال کی ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کا پہلو موجود ہے یا ان کی مقام شناسی سے پوری غفلت موجود ہے۔ ان تعبیرات کی بنا پر خواہ کوئی فتویٰ صادر نہ کیا جائے لیکن ان کے نامناسب اور شنیع ہونے سے کوئی اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

"خدا کو عرب میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے ڈھائی ہزار سالہ منصوبہ بنانا پڑا، مگر موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے تمام اصاغر واکابر ڈھائی دن سے بھی کم عرصہ میں اسلامی حکومت کا قلعہ کھڑا کرنے کا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔" (الرسالہ مارچ ۱۹۸۹ء ص ۳۲)

"منصوبہ" کے ساتھ جو تصورات وابستہ ہیں، ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے لیے "منصوبہ" کا استعمال خود محل نظر ہے۔ پھر "منصوبہ بنانا پڑا" کے استعمال نے انتہائی شنیع صورت پیدا کردی۔ اس سے اضطرار اور مجبوری واضح طور پر ٹپکتی ہے۔

"یہ موجودہ زمانہ میں خدا کا منصوبہ تھا، خدا نے سارے بہترین امکانات کھول دیے تھے اور اب صرف اس کی ضرورت تھی کہ خدا کے کچھ بندے ان کو استعمال کرکے ان امکانات کو واقعہ بننے کا موقع دیں، مگر مسلم قیادت خدا کے اس منصوبہ میں شامل ہونے کے لیے تیار نہیں ہوئی، اس نے نئے

شہادت وقربانی کا ٹائٹل

جناب وحیدالدین خاں صاحب نے غلط فہمی کے عنوان سے ایک صفحہ کا مضمون لکھا ہے، وہ مضمون یہ ہے:

"ایک عورت امام اوزاعی کی بیوی کے پاس آئی، اس نے گھر کی چٹائی کو چھوا تو وہ بھیگی ہوئی تھی۔ عورت نے کہا کہ شاید بچہ نے یہاں پیشاب کر دیا ہے۔ امام اوزاعی کی بیوی نے کہا کہ نہیں، یہ دراصل امام اوزاعی کے آنسو ہیں، ہر صبح کو وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ (الدعوۃ ریاض ۲۲ فروری ۱۹۸۵ء ص ۲۹)

عورت نے چٹائی کے بھیگنے کا جو سبب سمجھا وہ صرف اس کے اپنے ذہن کی پیداوار تھا۔ خارج میں اس سبب کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ عورت کے سمجھنے کی غلطی تھی نہ کہ صورت حال کی واقعی تشریح۔ عورت بذات خود یہ سمجھ رہی تھی کہ اس نے جان لیا، حالانکہ اس نے کچھ نہیں جانا تھا۔ اس نے اپنی لاعلمی کو علم قرار دے لیا۔ اس نے محض ذاتی خیال کے تحت ایک رائے قائم کر لی حالانکہ صحیح رائے وہ ہے جو تمام متعلقہ حقائق کا جائزہ لینے کے بعد قائم کی جائے۔

اکثر حالات میں آدمی اپنی ذہنی سطح کے مطابق رائے قائم کرتا ہے۔ عورت کی ذہنی سطح وہی تھی جس کا اظہار اس کے سوال میں ہوا۔ اس نے اپنا یہ سوال کسی بُری نیت سے نہیں کیا، اور نہ وہ جھوٹ بولی۔ اس کے باوجود وہ مکمل طور پر غلطی پر تھی، اس کی غلطی کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی ذات

سے اوپر اٹھ کر سوچ نہ سکی۔ اپنی روزانہ کی زندگی میں وہ جس چیز کا تجربہ کر رہی تھی اسی پر اس نے دوسرے کے معاملہ کو بھی قیاس کر لیا، جس چیز سے وہ خود دوچار تھی، اسی کو اس نے دوسرے کی طرف منسوب کر دیا۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ آدمی کو دوسرے کے متعلق رائے قائم کرنے میں حد درجہ محتاط ہونا چاہیے، عین ممکن ہے کہ وہ "دموع الشیخ" کو "بول الصبی" سمجھ لے۔ جو واقعہ اپنے اندر ایک بندے کے خوفِ خدا کی کہانی لیے ہوئے ہے، نادانی کی بنا پر وہ اس کو دنیا پرستی کا نتیجہ قرار دے بیٹھے، جو واقعہ آخرت کی یاد دلانے والا ہے، وہ اس کے ذہن میں صرف دنیا کی یاد دلانے والا بن جائے۔" (الرسالہ مئی ۱۹۸۶ء ص ۴)

جناب وحید الدین خاں صاحب نے اسلام کے مجددین و مصلحین اور آخری صدیوں کی تحریکاتِ جہاد پر جو کچھ لکھا ہے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ موصوف نے تمام متعلقہ حقائق و واقعات کا جائزہ لیے بغیر اپنی ذہنی سطح کے مطابق رائے قائم کر لی ہے۔ انھیں غلط فہمی ہے کہ انھوں نے جان لیا حالانکہ وہ اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر سوچ نہ سکے اور جس چیز سے وہ خود دوچار تھے اسی کو مجاہدین و مصلحین امت کی طرف منسوب کر دیا۔ "دموع الشیخ" (شیخ کے آنسو) کو "بول الصبی" (بچے کا پیشاب) سمجھ بیٹھے۔ خاں صاحب کی نظر میں آخری صدیوں میں جن لوگوں نے تحریکاتِ جہاد برپا کیں اور مغربی سامراج یا ظالم و جابر حکمرانوں سے ٹکرائے انھوں نے شہرت اور شہادت کا ٹائٹل حاصل کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا۔ الاسلام میں خاں صاحب نے ایک صدی کے مصلحین امت کی خدمات پر بے بنیاد تنقید کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:

"مگر ان میں سے کسی کام کے لیے بھی وہ سرگرم نہ ہو سکے اور شہادت و قربانی کا ٹائٹل لے کر شاندار قبروں میں لیٹ گئے۔"

(الاسلام پہلا ایڈیشن ص ۱۰۷)

خاں صاحب کی تحریریں اور افکار جس طرح خود منفی ردِ عمل کا ظہور ہیں اسی طرح

پروگرام کیا ہے

وحید الدین خان صاحب کا پروگرام کیا ہے، یہ جاننے کے لیے ہمیں ان کی تحریروں کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔ موصوف جب تک مختلف جماعتوں اور اداروں سے منسلک رہے اس وقت تک اپنا مستقل پروگرام (نقشہ کار) طے کرنے میں آزاد نہیں تھے۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء سے انھوں نے ماہنامہ "الرسالہ" (دہلی) جاری کیا۔ اس وقت سے اپنا پروگرام طے کرنے میں با اختیار ہوئے۔ "الرسالہ" کے پہلے ہی شمارہ میں "اسلامی مرکز" کا تخیل پیش کیا جس کا اجمالی مقصد "تعارف اسلام" بیان کیا گیا۔ اس کے بعد الرسالہ کے مختلف شماروں میں المرکز الاسلامی کا تعارف اور اس کا (گیارہ نکاتی) پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ (الرسالہ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۷۶ء کے شمارے ملاحظہ ہوں) گیارہ نکاتی پروگرام میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ عربی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں رسالوں کا اجرا۔

۲۔ قرآن کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں شائع کرنا اور ان کو رعایتی قیمت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانا۔

۴۔ قرآنی علوم کی تدوین اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت۔

۵۔ ایک دینی درس گاہ کا قیام جس میں قرآن، حدیث، سیرت، تقابلی مذہب، عربی زبان اور دوسری زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔

۷۔ مختلف علاقوں اور ملکوں میں تبلیغی وفود بھیجنے کا انتظام۔

۸۔ اسلام کے تاریخی آثار اور دستاویزات کا میوزیم قائم کرنا۔۔۔۔

(الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶ء ص ۴۲)

رفتہ رفتہ وحید الدین خاں صاحب کا گیارہ نکاتی پروگرام یک نکاتی پروگرام میں تبدیل ہو گیا جون ۱۹۸۱ء کے الرسالہ کے صفحہ اول پر "پروگرام کیا ہے" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"آپ نے ہم لوگوں کو سخت مصیبت میں ڈال دیا"

"وہ کیا ہے"

"آپ نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ہمارے اندر ایک جوش ابھار دیا۔ مگر اس کے آگے ہمیں کوئی پروگرام نہیں دیتے۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت ہمارا پروگرام صرف یہ ہے کہ ماہنامہ الرسالہ کی آواز کو عام کیا جائے۔ پہلا کام لوگوں کو باشعور بنانا ہے اور یہ کام صرف الرسالہ کو مسلسل پڑھانے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ الرسالہ کو عام کرنے کی بہترین صورت ایجنسی ہے۔" (الرسالہ جون ۱۹۸۱ء ص ۱)۔

'الرسالہ' کی توسیع اشاعت کے لیے قرآنی آیت (من انصاری الی اللہ) کے عنوان سے اپیل شائع ہوتی رہی۔ الرسالہ کی قیمت فی شمارہ دو روپیہ ہوا کرتی تھی اگست ۱۹۸۱ء کے الرسالہ میں اعلان کر دیا گیا کہ ماہ ستمبر ۱۹۸۱ء سے فی شمارہ تین روپیہ قیمت ہو گی۔ بعض قارئین نے گرانی کے سبب الرسالہ کی خریداری بند کر دی۔ ستمبر ۱۹۸۱ء کے شمارے میں ایسے لوگوں کو آخرت کی وعید سنائی گئی، لکھتے ہیں:

"ایسے لوگوں سے ہم کہیں گے کہ الرسالہ کا خریدنا کوئی بازار کا سودا خریدنے کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ دعوت حق کی مہم میں اپنے کو شریک کرنا ہے۔ اسلام کی ایک تاریخ وجود میں آ رہی ہے اب جو شخص چاہے اس تاریخ کا جزء بن جائے اور جو شخص اس کا جزء بننے کے لیے تیار نہ ہو وہ خود سوچ لے کہ جس مہنگائی کو وہ اپنے دنیا کے معاملات میں پوری طرح گوارا کیے ہوئے تھا اسی مہنگائی کو آخرت کے معاملہ میں گوارا نہ کرنے کے لیے اس کے پاس خدا کے یہاں کیا جواب ہو گا؟"

(الرسالہ ستمبر ۱۹۸۱ء، ص ۱)

چند سالوں تک الرسالہ کی اشاعت کے بعد خاں صاحب نے محسوس کیا کہ الرسالہ

اب ایک تحریک بن چکا ہے لہٰذا اسے تنظیم کی صورت دیدی جائے۔ ۱۸، ۱۹ اپریل ۱۹۸۲ء کو بھوپال میں اس غرض سے اجتماع بلایا گیا، اس اجتماع کی پاس شدہ چند تجاویز یہ ہیں:

۱۔ حلقۂ الرسالہ کے فکر کو تنظیمی ڈھانچہ دینے کے لیے مرکز اسلامی کا نام تجویز کیا گیا۔

۲۔ مرکز اسلامی کی ایک مرکزی کمیٹی ہوگی اور اس کے ماتحت ریاستی کمیٹیاں ہوں گی۔

۴۔ حلقۂ الرسالہ کے کارکنوں سے مشورہ کے بعد مرکز ریاست کے لیے کنوینر مقرر کریگی، اور وہ اپنی ریاستی کمیٹی تشکیل دے گا۔

۱۱۔ تقریباً ایک سال بعد مرکز اسلامی کا نمائندہ اجتماع کسی مناسب مقام پر منعقد کیا جائے گا، جگہ اور تاریخ کا تعین مرکزی کمیٹی کرے گی۔ (الرسالہ جون ۱۹۸۲ء ص ۴)

بھوپال کا اجتماع الرسالہ تحریک کے ہمدردوں کا پہلا اور آخری اجتماع ثابت ہوا، اجتماع میں پاس شدہ تجاویز الرسالہ کی فائلوں میں دب کر رہ گئیں اور وحیدالدین خانصاحب نے تنظیم قائم کرنے کا خیال دل سے نکال دیا، غالباً انھوں نے محسوس کیا کہ قارئین الرسالہ ابھی اتنے "باشعور" نہیں ہوسکے ہیں کہ انھیں تنظیمی لڑی میں پرویا جاسکے، انھیں مزید "باشعور" بنانے کی ضرورت ہے یا انھوں نے تنظیمی کام اس لیے معطل کیا کہ خود اپنے لیے خطرہ محسوس کیا، انھوں نے بھانپ لیا کہ تنظیم قائم ہونے سے دوسرے لوگ تنظیم پر حاوی ہوجائیں گے یا کم از کم اس میں دخیل ہوجائیں گے، وحیدالدین خاں صاحب کے دائیں اور بائیں بازو مولانا محسن عثمانی (دہلی) مولانا ہاشم القاسمی (حیدرآباد) بھی ان کے ساتھ نہیں چل سکے بلکہ شدید مخالف ہوگئے، اسی طرح بھوپال اجتماع کے اکثر شرکا رفتہ رفتہ ان سے الگ ہوگئے۔ "اسلام کی دعوت" اور "اسلام کا تعارف" کا خوش نما لیبل دیکھ کر جو باشعور لوگ بھی خاں صاحب کے قافلے میں شریک ہوئے، انھوں نے قریب آکر محسوس کیا کہ موصوف میں "احیاء اسلام" کے بجائے "احیاء ذات" کا جذبہ کارفرما ہے۔

کوئی ایسا فقرہ نہ پائیں گے جس کا مفہوم یہ نکلتا ہو کہ نبی پاک نے اللہ کو چھوا تھا۔ اس کے برعکس قرآن مجید کا بیان یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حضور درخواست کی: رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ "اے میرے رب مجھے اپنے کو دکھلا دیجئے کہ میں آپ کو دیکھوں!" جواب میں ارشاد ہوا:

لَن تَرَانِي وَلَٰكِنِ انظُرْ	تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ پہاڑ کی
إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ	طرف دیکھو اگر وہ اپنی جگہ قائم رہا تو
فَسَوْفَ تَرَانِي	تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔

اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا، وہ یہ تھا:

فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ	پھر جب ان کے پروردگار نے پہاڑ پر
دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا	اپنی تجلی ڈالی تو تجلی نے پہاڑ کو ریزہ
(سورہ اعراف)	ریزہ کر دیا اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے۔

اللہ کے جلیل القدر نبی تجلی الٰہی کے دیدار کی تاب نہ لا سکے۔ مگر خان صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے خدا کو فقط دیکھا ہی نہیں بلکہ اسے چھوا بھی ہے۔ اپنی شخصیت کے معاملہ میں خان صاحب کا فکر مبالغوں کی کن انتہاؤں کو پہنچ چکا ہے، یہ موصوف کے اس تعلی آمیز لبریز بیان سے بخوبی عیاں ہے۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ خان صاحب خود کو دنیا کے تمام مجددین و مصلحین سے مافوق و برتر ثابت کر دکھانے کی دھن میں اتنے آگے چلے گئے ہیں جہاں پہنچ کر عقل توازن کھو بیٹھتی ہے اور آدمی محض تماشہ بن کر رہ جاتا ہے۔

خان صاحب لکھتے ہیں کہ:

"خدا میرے لیے صرف ایک رسمی عقیدہ نہیں، خدا میری دریافت ہے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ اور قرآن مجید جیسے عظیم صحیفہ کے نزول کے بعد سے اب تک امت اللہ تعالیٰ کو پوری طرح جانتی آتی رہی ہے، وہ ایک لمحہ کے لیے خدا کو نہیں بھولی مگر خان صاحب کے ان فقروں سے پہلی بار معلوم ہوا کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کہیں غائب اور لاپتہ ہو گیا تھا۔ اب اگر خان صاحب نے بڑی محنت و جانفشانی

کے نتیجہ میں خدا کو دریافت کیا، اور اس لیے انھوں نے دعویٰ کیا کہ خدا میری دریافت ہے اور خاں صاحب جو یہ کہتے ہیں کہ "خدا میرے لیے صرف ایک رسمی عقیدہ نہیں"، تو یہ خاں صاحب ایمان بالغیب کا مذاق اڑا رہے ہیں، گویا بن دیکھے خدا پر ایمان لانا نعوذ باللہ کوئی بیوقوفی کا کام ہے، جس میں اپنے زعم کے مطابق خاں صاحب مبتلا نہیں ہیں۔ خدا کی پناہ! حالانکہ قرآن مجید کے آغاز ہی میں یہ واضح فرما دیا گیا ہے کہ قرآن فقط ان لوگوں کے حق میں ہدایت کا ذریعہ بن سکتا ہے جو بن دیکھے ایمان لائیں گے۔

حالتِ احرام اور حدودِ حرم میں شکار کی ممانعت فرمائی گئی تو اس حکم کی علت ان الفاظ میں واضح فرمائی گئی:

لیعلم اللّٰہ من یخافہ بالغیب۔ (سورۂ مائدہ) تاکہ اللہ جان لے (یعنی جانچ لے) کہ اس سے بن دیکھے کون ڈرتا ہے۔

جو چیز کمال ایمان کی علامت بلکہ اس کی شرط تھی، خاں صاحب رسمی عقیدے کا لفظ لکھ کر اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

خاں صاحب کی ان تعلّیوں کی مثال اگر کہیں ملتی ہے تو نبی کاذب مرزا غلام احمد قادیانی کے یہاں، اس کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ:

جب کہ ہم نے نورِ حق دیکھا ہے اپنی آنکھ سے
جب کہ خود دی خدا نے دی خبر یہ بار بار
وہ خدا اب بھی بناتا ہے جسے چاہے کلیم
اب بھی اس سے بولتا ہے جس سے وہ کرتا ہے پیار (درِ ثمین)

خاں صاحب کے دعوے اور ان کا لب و لہجہ اگر میل کھاتے ہیں تو فقط مرزا غلام احمد قادیانی سے۔

ہم بدگمانی سے ہزار بار خدا کی پناہ چاہتے ہیں مگر وحید الدین خاں یہ اعلان کرنے لگیں کہ انھوں نے خدا کو دیکھا ہے، چھوا ہے، اور خدا ان کی دریافت ہے تو یہ معمولی بات نہیں جسے یوں ہی نظر انداز کر دیا جائے، بلکہ یہ خود ان کے اور تمام اہلِ اسلام

کے لیے بہت ہی قابلِ فکر بات ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

وحید الدین خاں صاحب نے بڑے زور و شور سے اپنی تصنیفات کو عصری اسلوب کا آئینہ دار بتایا ہے، اور شاعرانہ نثر کی بار بار مذمت کی ہے، لیکن ان کی تحریروں میں شاعرانہ نثر کے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے اپنی کتاب "احیاءِ اسلام" میں "غلبۂ اسلام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں شاعری فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مختصر الفاظ میں یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے حل کے لیے خدائی طاقتوں کی کارفرمائی درکار ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ایک طوفانِ نوح برپا ہو جس میں شیطان کی تمام نسل غرق ہو کر رہ جائے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ معجزۂ موسوی ظاہر ہو، جو فرعون اور اس کے ساتھیوں کو سمندر کے موجوں کے حوالے کر دے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ خدا کے فرشتے آسمان سے اُتریں، اور بدر کے میدان میں وقت کے تمام بڑوں کو جمع کر کے انھیں مسلمانوں کے قبضے میں دے دیں۔ یہ واقعہ خدائی مدد سے ظہور میں آنے والا واقعہ ہے۔ مسلمان صرف اپنی محدود کوششوں سے اس کو بروئے کار نہیں لا سکتے۔" (احیاءِ اسلام ص ۴۱ - ۴۲)

اس کتاب میں ایک اور جگہ شاعرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"افراد کسی تربیتی نظام میں نہیں ڈھلتے، اور نہ کسی قسم کے خارجی ہنگاموں کے درمیان بنتے ہیں۔ افراد تیار کرنے کی صورت تو صرف یہ ہے کہ دینِ قیّم کی بنیاد پر ایک ایسی بے آمیز تحریک اٹھے جو فطرتِ انسانی کو فتح کرنے والی ہو، جو آدمی کے باطن میں ضرب لگا کر اس کے اندر سوئے ہوئے ربانی انسان کو جگا دے، جو انسان کے فکر میں خدا کا رنگ اس طرح گھول دے کہ اس کی پوری ہستی خدا کے رنگ میں رنگ جائے۔ ایسی تحریک ردِعمل کے طور پر نہیں اُٹھتی وہ فطرت کے ساز پر خدا کا ابدی نغمہ چھیڑنے کے ہم معنی ہوتی ہے۔ وہ کتابِ الٰہی کی حکمت

کو انسان عصر میں کھولتی ہے، وہ پیغمبرانہ دعوت کا زمانی اظہار ہوتی ہے، وہ خدا اور انسان کے درمیان ربط بن کر سامنے آتی ہے۔ وہ سورج کی روشنی اور پھولوں کی مہک کی طرح خدا کے تخلیقی حسن کا نمونہ ہوتی ہے۔ (ایضاً ص ۱۲)

الرسالہ جنوری ۱۹۸۱ء سے ایک اور شاعرانہ پیراگراف ملاحظہ فرمائیے:

"خدا کا داعی خدا کے سمندر میں نہا تا ہے، اس طرح اس کے لیے ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں خدا کے گیت گائے۔ وہ فطرت کے ساز پر خدا کے ابدی نغمے چھیڑے۔ ان نغمات میں ایک طرف خدا کے حسن و کمال کی تجلیاں ہوتی ہیں، جن کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کو سن کر آدمی رقص کر اٹھے، دوسری طرف ان نغمات میں خدا کی پکڑ کی تنبیہات ہوتی ہیں جو ایک حساس انسان کو تڑپا کر اسے رُلا دیتی ہیں۔ داعی خدا کے جمال و جلال کا مظہر ہوتا ہے۔ مگر انسان اتنا غافل ہے کہ وہ ان چیزوں سے کوئی اثر نہیں لیتا۔ داعی کے کلام کی صورت میں خدا بالکل اس کے قریب آجاتا ہے۔ مگر انسان اتنا غافل ہے کہ وہ ان چیزوں سے کوئی اثر نہیں لیتا۔

داعی کا بولنا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو باہر لانا ہوتا ہے اس کا لکھنا اپنے خون کو سیاہی بنانے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ اس کے نغمے محض نغمے نہیں ہوتے بلکہ روح انسانی میں ایک خدائی بھونچال کی آواز ہوتے ہیں۔"

(الرسالہ جنوری ۱۹۸۱ء ص ۱۵)

وحید الدین خاں صاحب کی تحریروں میں اس طرح کی نثری شاعری کے نمونے بکثرت ملتے ہیں، ہمارے نزدیک نثر میں شاعری کی جھلک آجانا کوئی بڑا سنگین جرم نہیں ہے، لیکن وحید الدین خاں صاحب نے یہ شاعری زیادہ تر خدا کی ذات و صفات اور اسلامی عقائد و احکام کے بیان میں کی ہے اور اس میں وہ اس حد تک آگے چلے گئے ہیں کہ انھیں بارگاہِ الٰہی کی مقام شناسی کا بھی خیال نہیں رہ گیا ہے۔ اس لیے بسا اوقات ان کی یہ شاعرانہ تحریریں گمراہی کی حدوں کو چھو لیتی ہیں۔

حرفِ آخر

دورِ حاضر میں اسلام پر فکری و نظریاتی یلغار کا سلسلہ نہ صرف جاری ہے بلکہ دن بدن اس میں تیزی آتی جا رہی ہے۔ اسلام دشمن طاقتیں اسلام کی تصویر بگاڑنے اور اس کے خلاف پروپگنڈہ کرنے میں پہلے سے زیادہ منصوبہ بندی اور چابک دستی کا ثبوت دے رہی ہیں، ہندوستان کے افق پر نئے خطرات منڈلا رہے ہیں۔ ان حالات میں کسی مسلمان مصنف کے افکار و خیالات کا تنقیدی جائزہ لینا کوئی خوش گوار کام نہیں ہے۔ حالات تو اس بات کے متقاضی ہیں کہ مسلمان سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو جائیں اور قرآن و سنت کے بتائے ہوئے طریقہ پر اتحاد و ہم آہنگی کے ساتھ ان نازک حالات کا مقابلہ کریں، صاحبِ دعوت امت کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کریں۔

ان نازک تر حالات میں کس چیز نے مجھے زیرِ نظر کتاب کی تصنیف پر آمادہ کیا؟ اس سوال کا جواب قارئین کو اس کتاب کے مباحث سے مل چکا ہو۔ بعض حالات میں خارجی محاذ پر شدید خطرات کے باوجود داخلی محاذ پر توجہ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ جب امت کے اجماعی مسائل کا انکار کیا جا رہا ہو، نیا تصورِ دین ایجاد کیا جا رہا ہو، آیات و احادیث کی من مانی تشریح کی جا رہی ہو، اسلافِ امت سے بے اعتمادی پیدا کی جا رہی ہو، قرآن و حدیث اور سیرتِ نبوی کے نام پر امتِ مسلمہ کی غلط رہنمائی کی جا رہی ہو، چند ذہنی مفروضات کی بنیاد پر اسلام کی نئی تعبیر و تشریح کی جا رہی ہو، اور اس کی وجہ سے امتِ مسلمہ کے کسی طبقہ میں فکری انتشار اور نظریاتی گمراہی پھیل رہی ہو، ایسی صورت میں بڑے

سے بڑے سنگین حالات بھی اس بات کا جواز فراہم نہیں کرتے کہ زبان پر مہر سکوت لگائی جائے اور قلم کو اظہار حق سے روک دیا جائے۔

ہمارا دین ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، دین کو ہر کتر بیونت، ترمیم و اضافہ سے بچا کر اصلی حالت میں باقی رکھنا ہمارا اولین اور اہم ترین فریضہ ہے، اسی دینی فریضہ کے شدید تر احساس نے الفاظ کا جامہ پہن کر "فکر کی غلطی" کی صورت اختیار کرلی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو دینِ حق اور صراطِ مستقیم پر قائم رکھیں، اور ہمارے دل و دماغ کو ہر طرح کی گمراہی اور فکری انحراف سے محفوظ رکھیں۔